مئے لالہ فام

ڈاکٹر جاوید اقبال

مۓ لالہ فام

مئے لالہ فام

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبال۔ اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

طبع اول : ۱۹۹۶ء

تعداد : ۵۰۰

قیمت : ۱۵۰ روپے

مطبع : طیب اقبال پرنٹرز، لاہور

محل فروخت :۔ ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور فون: ۷۳۵۷۲۱۴

فہرست مقالات

صفحہ نمبر	عنوان مقالہ	نمبر شمار
۹	پیش لفظ	۱

فکریات

صفحہ نمبر	عنوان مقالہ	نمبر شمار
۳۵	جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال	۲
۴۱	اقبال بحیثیت شاعر انقلاب	۳
۵۳	اقبال اور ندرت فکر	۴
۶۹	اقبال اور مسئلہ تعلیم جدید	۵
۷۵	اقبال اور گردش ایام	۶
۸۹	اقبال اور نژاد نو	۷
۱۰۷	اقبال اور نظریاتی بحران	۸
۱۱۷	اقبال کے معاشی تصورات	۹
۱۴۵	اقبال اور امید بہار	۱۰
۱۵۷	اقبال اور قومی کردار	۱۱
۱۶۷	شریعت اسلامیہ اور علامہ اقبال	۱۲
۱۷۵	اقبال اور شیطان ۔۱	۱۳
۱۸۹	اقبال اور شیطان ۔۲	۱۴
۲۱۱	اقبال کے شذرات	۱۵

پاکستانیات

صفحہ نمبر	عنوان مقالہ	نمبر شمار
۲۱۷	فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کا جائزہ	۱۶
۲۳۵	اقبال، پاکستانی قوم پرستی اور بین الاقوامی اسلام	۱۷
۲۴۳	اقبال اور پاکستان کے محمود و ایاز	۱۸
۲۴۹	پاکستان کی نظریاتی اساس اور اسلامی قانون سازی	۱۹

سیاسیات

۲۰- اقبال اور اسلامی ریاست ۲٦۷
۲۱- اقبال اور ان کے زمانے کی مسلم سیاسی جماعتیں ۲۸۳
۲۲- علامہ اقبال کا تصور جمہوریت اور موجودہ صورت حال ۲۹۵
۲۳- علامہ اقبال اور جمہوریت ۳۰۳

شخصیات و اماکن

۲۴- چودھری محمد حسین ۳۱۱
۲۵- اقبال- ایک باپ کی حیثیت سے ۳۲۷
۲٦- مرکزیہ مجلس اقبال اور صدر محمد ضیاء الحق ۳۴۳
۲۷- کشمیر- اقبال کی نظر میں ۳۵۱

O

میں شاخ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مے لالہ فام پیدا کر!

(اقبالؒ)

پیش لفظ

اگر کلام اقبال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ حضرت علامہ کا پیغام دراصل مسلمانوں کی ہر نئی نسل کے لئے ہے۔ جہاں تک میری ذات یا میرے نام کا تعلق ہے' میری دانست میں انہوں نے اسے اپنے کلام میں اسی مقصد کے لئے ایک اشارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ اپنے کلام میں جہاں کہیں بھی مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں' اس سے مراد درحقیقت نوجوانانِ ملت ہیں۔ مثلاً "جاوید نامہ" میں "خطاب بہ جاوید" دراصل "سخنے بہ نژادِ نو" ہے۔ اس لحاظ سے ملت کا ہر نوجوان علامہ کے لئے "جاوید" ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیف پہلو لفظ 'جاوید' کی اہمیت ہے۔ 'جاوید' کے معنی ہیں ہمیشہ رہنے والا' ابدی۔ گویا شباب لافانی ہے کیونکہ مسلمانوں کی نئی نسل ہمیشہ پیدا ہوتی رہے گی اور نژادِ نو کا یہ تسلسل لامتناہی طور پر جاری و ساری رہے گا۔ چونکہ علامہ کا تخاطب نژادِ نو سے ہے اور مستقبل میں آنے والی مسلمانوں کی ہر نسل کے لئے تروتازہ ہے' اس لئے ان کا کلام لازوال اور زندۂ جاوید ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری نسل کے نوجوانوں نے علامہ کی شخصیت اور ان کی تعلیمات سے کیا اثر قبول کیا۔ میں نے ان صفحات میں اپنے متعلق اس سوال کا جواب تفصیل سے دینے کی کوشش کی ہے۔ مجھ پر علامہ کی شخصیت اور تعلیمات کا جو اثر ہوا' اس کا اندازہ دو پہلوؤں سے کیا جا سکتا ہے' ایک پہلو ذاتی ہے اور دوسرا فکری۔

ذاتی طور پر میں نے علامہ کی شخصیت اور تعلیمات سے کیا اثر قبول کیا' اسے صحیح طور پر جاننے کے لئے اس کتاب کے تتمے کے دو مضمون بعنوان "اقبال۔ ایک باپ کی حیثیت سے" اور "چودھری محمد حسین" پہلے پڑھے جانے چاہئیں۔

میری تاریخ پیدائش ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء ہے، اور علامہ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔ اگر اس عرصے میں سے ابتداء کے پانچ سال نکال دیئے جائیں تو باقی نو سال کی قلیل مدت رہ جاتی ہے۔ سو علامہ کی سیرت و شخصیت کے بارے میں میرا ذاتی مشاہدہ اسی نو برس کے عرصے تک محدود ہے۔ یہ قلیل مدت میری زندگی کا اہم ترین حصہ ہے کیونکہ ان کا سایہ عاطفت میرے سر پر قائم تھا اور میں اپنی عمر کے ایسے دور میں تھا جبکہ بیٹا، باپ کی سیرت و شخصیت سے غیر شعوری طور پر اثر قبول کرتا ہے۔

مجھ پر ان کی سیرت و شخصیت کی جو خصوصیتیں منکشف ہوئیں، وہ اسلام کے لئے ان کی بے پناہ محبت تھی۔ اور رسول اکرمؐ کی ذات بابرکات کے ساتھ عشق کا تو یہ عالم تھا کہ ہمارے لئے اس کا اندازہ کر سکنا محال ہے۔

پپایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ ما را
حساب من زچشم او نہاں گیر

ان کے لئے عشق مصطفیٰ ایک ایسی بے مثال نعمت تھی کہ حضور رسالتؐ میں نہایت خلوص اور عاجزی کے ساتھ التجا کرتے ہیں۔

ہمیں یک آرزو دارم کہ "جاوید"
زعشق تو بگیرد رنگ و بوے

اسی طرح میں ان کے فقر و استغنا سے بھی متاثر ہوا۔ میں نے انہیں زندگی کی مادی آسائشوں سے قطعی بے نیاز پایا۔ وکالت کرتے تھے تو صرف اتنا کام لیتے جس سے ان کی خانگی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اپنی زندگی میں ان کی تصانیف کی اشاعت کسی معقول آمدنی کا ذریعہ نہ تھی۔ گھر بنا تو بیوی کے بچائے ہوئے روپوں سے، اور فوت ہوئے تو میرے کرایہ دار کی حیثیت سے۔ یہی نہیں، بلکہ اپنی زندگی کے آخری ماہ کی سکونت کا کرایہ بھی ادا کر گئے۔ وفات کے وقت انہوں نے ترکے میں دولت چھوڑی نہ جائداد۔ بنک میں جو سرمایہ تھا، وہ ان ہی کی خواہش کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین پر صرف کر دیا گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ان کے فقر کے باعث ہی ان میں حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکنے کی ہمت تھی۔ اور اسی فقر کی وجہ سے وہ مرد حر تھے۔ میرے لئے وہ عشق، فقر، جرأت اور حریت کا پیکر تھے۔ یہی متاع فقیر تھی جسے وہ ساری عمر اپنے قافلے میں لٹانے کی کوشش کرتے رہے۔

بہرحال، اپنی وفات سے پیشتر علامہ نے چودھری محمد حسین، حکیم طاہر الدین اور اپنے برادر زادے شیخ اعجاز احمد کو اپنی اولاد کی نگہداشت کی خاطر ولی مقرر کر رکھا تھا۔ ان تینوں شخصیتوں کی محبت اور شفقت نے مجھے یہ کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ میرے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے۔

۱۹۴۳ء میں جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا تو فکری اور روحانی طور پر چودھری محمد حسین کے زیر اثر آیا۔ ان کی وساطت سے مجھ میں تعلیمات اقبال کو سمجھنے کا تجسس پیدا ہوا۔ گویا وہ میرے لئے خزینہ اقبال کی کلید ثابت ہوئے یا ان کی رہبری میں میرے "سفر در اقبال" کی ابتدا ہوئی۔ اس رشتے کا روحانی پہلو اس قدر لطیف ہے کہ اسے الفاظ کے احاطے میں نہیں لایا جا سکتا۔

ستمبر ۱۹۴۹ء میں تحصیل علم کی خاطر میں انگلستان گیا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں پانچ سال قیام کے دوران میں پروفیسر آربری اور پروفیسر روبن لیوی کے زیر نگرانی تحقیق کا کام کرتا رہا۔ لیکن ان نامور شخصیتوں سے کسی قسم کی قربت کا رشتہ استوار نہ ہو سکا۔ اسی وجہ سے جولائی ۱۹۵۰ء میں جب مجھے کیمبرج میں چودھری محمد حسین کی وفات کی خبر ملی تو بیقرار ہو گیا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں نے اپنے آپ کو فکری اور روحانی اعتبار سے قطعی طور پر تنہا محسوس کیا۔ یہ احساس کئی دنوں تک میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ ایک چپ سی لگ گئی گویا مجھے کسی نے اچانک خلائے بسیط میں معلق کر دیا تھا۔ اس کے رد عمل کے طور پر میں نے اپنے آپ کو تمدن انگلیسیہ میں گم کرنا چاہا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرے انگریز شناسا مجھ سے اکثر کہا کرتے کہ تم نے تو ہمارے تمدن کو یوں اپنا لیا ہے جیسے پیدا ہی یہیں ہوئے تھے۔ مگر انہیں یہ علم نہیں تھا کہ میں ان کے درمیان اپنے آپ کو بنیادی طور پر ہمیشہ اجنبی محسوس کرتا رہا۔

کیمبرج سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لندن کا رخ کیا اور دو سال وہاں بیرسٹری کے امتحانات کی تکمیل میں گزر گئے۔ ستمبر ۱۹۵۶ء میں سات سال کے عرصے کے بعد جب واپس پاکستان آیا تو ایک عجیب قسم کا خوف مجھ پر مسلط تھا۔ چودھری محمد حسین کی عدم موجودگی تھی یوں محسوس کر رہا تھا گویا اپنے وطن نہیں بلکہ کسی اجنبی ملک کی طرف جا رہا ہوں۔ اسی تذبذب کے عالم میں کراچی سے لاہور پہنچا اور گھر میں قدم رکھنے سے پیشتر چودھری صاحب کی تربت پر حاضر ہوا۔ فکری اور روحانی تنہائی کا احساس اس قدر شدید تھا کہ عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی معیت میں بھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا تھا۔

تنہائی اور نامحرمی کا احساس ایک طویل مدت تک مجھ پر طاری رہا۔ اسی دوران میں وکالت شروع کی کیونکہ میری دسترس میں یہی ایک ہنر تھا جس کے ذریعے آزادی سے اپنی روزی کما سکتا تھا۔ میری کیفیت دراصل ایک ایسے آدمی جیسی تھی جو لق و دق صحرا میں کوئی حلقہء محرماں ڈھونڈ رہا ہو۔ اسی سلسلے میں پاکستان کے اکثر و بیشتر سیاسی و معاشرتی رہنماؤں سے بھی ملا۔ لیکن کوئی نگاہ میں جچتا نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا عشق، فقر، جرأت اور حریت ایسی قدریں اس ملک میں عنقا ہو چکی ہیں۔

البتہ سردار عبدالرب نشتر کی صحبت میں بیٹھ کر گونہ تسکین ہوئی۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں انگلستان جا رہا تھا تو سردار صاحب مغربی پنجاب کی گورنری کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ نے مجھے بلوا بھیجا اور نہایت خلوص کے ساتھ نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات ۱۹۵۷ء میں ہوئی جب کراچی میں مجھے یوم اقبال کے موقع پر مقالہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ آپ صرف میرا مقالہ سننے کی خاطر جلسے میں تشریف لائے۔ کچھ عرصے بعد آپ لاہور آئے اور مجھے پھر بلوا بھیجا۔ ان دنوں سپریم کورٹ کے روبرو ایک آئینی قضیے کی سماعت ہونے والی تھی جس میں آپ صوبائی گورنر کے کسی غیر آئینی اقدام کے خلاف مسلم لیگ کی طرف سے بذات خود بحث کے لئے پیش ہو رہے تھے۔ مقدمے کی سماعت مری میں ہونی تھی۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ مقدمہ چلتا رہا لیکن میری شامیں انہی کی معیت میں سیاسیات پاکستان پر بحث کرتے گزرتی تھیں۔ میں نے سردار صاحب سے التماس کی کہ مسلم لیگ کی تنظیم از سرنو کی جانی چاہئے کیونکہ اس کے آئین میں بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ ایک ایسے سپہ سالار کی طرح دکھائی دیتے تھے جو میدان کارزار میں تن تنہا، گھوڑے پر سوار، دشمن پر وار پہ وار کئے جا رہا ہو مگر جس کے اپنے ساتھی، اس کے پس پشت، اسی دشمن سے سازباز کر رہے ہوں۔

جب میں اپنے گردوپیش سے بہت زیادہ بیزار ہو جاتا تو کراچی پہنچ کر محترمہ فاطمہ جناح کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان سے پاکستان کا کوئی بھی سیاسی رستم چھپا ہوا نہیں تھا۔ لیکن وہ افلاک کی سی خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

۱۹۵۸ء کے وسط میں مجھے صدر سکندر مرزا نے کراچی طلب کیا۔ ان ایام میں معاہدۂ بغداد سے وابستہ ممالک کی ہوائی فوج کے چند سربراہ پاکستان آئے ہوئے تھے۔ شہزادہ علی خان مرحوم اور کیبٹ لاج بھی کراچی میں موجود تھے۔ سکندر مرزا نے کھانے کی ایک دعوت پر

ان سب سے میری ملاقات کروائی۔ دوسرے روز مجھے پھر بلوایا گیا۔ دراصل وہ چاہتے یہ تھے کہ میں کسی نہ کسی صورت میں معاہدۂ بغداد کے سیکرٹریٹ سے منسلک ہو کر بغداد چلا جاؤں۔ میں نے عرض کیا کہ میں سات سال وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آیا ہوں، اس لئے فی الحال میری خواہش پاکستان کو خیرباد کہنے کی نہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص سے فرمایا کہ "میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں بغداد جانا منظور نہیں تو پھر کیا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت حال ہی میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا گیا ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو مجھے اس کے ساتھ منسلک کر دیجئے۔ ممکن ہے میں اس سلسلے میں کوئی کارآمد خدمت انجام دے سکوں۔ یہ سن کر سکندر مرزا ہنس پڑے۔ کہنے لگے "مگر وہ کمیشن تو محض دکھاوے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس کا مقصد دراصل کچھ بھی نہیں کیونکہ نہ تو اسے کوئی کام کرنا ہے، نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے۔ بہرحال، اگر تمہاری خواہش یہی ہے تو میں تمہیں اس کے ساتھ منسلک کئے دیتا ہوں بشرطیکہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ انتخابات میں حصہ لو گے۔" میں ان کے انداز گفتگو سے بھونچکا سا رہ گیا کیونکہ وہ میری توقعات کے قطعی برعکس تھا۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس اس تعیش کے لئے وسائل موجود نہیں۔ لیکن وہ اصرار کرنے لگے اور فرمایا "تم جس سیاسی جماعت کا ٹکٹ چاہو، اس کا انتظام میں کرا دوں گا۔"

بہرحال، ساری گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ میں بظاہر مسلم لیگ سے اپنے آپ کو وابستہ کر لوں، لیکن درحقیقت اپنے محسن سکندر مرزا کا فرمانبردار رہوں۔ اس ملاقات میں مجھے نہایت مربیانہ انداز میں یہ سبق دیا گیا تھا کہ سیاسیات پاکستان میں کسی اصول کی پابندی ملحوظ خاطر رکھنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ یہاں اگر اندرون تاریک رہے تبھی کرسی اقتدار محفوظ رکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا سازش اور عیاری کا تقاضا یہی ہے کہ ملک میں ایسی صورت حال مستقل طور پر قائم رکھی جائے جس میں دوسرے تم پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ یوں تم ایسے مقام پر پہنچ سکتے ہو کہ اپنی خوشی کے مطابق جسے چاہو حربے کے طور پر استعمال کرو، اور جو استعمال کے قابل نہ رہے اس سے یوں قطع تعلق کر لو جیسے وہ تھا ہی نہیں، بلکہ اس کا نام و نشان تک مٹا دو۔

میں سکندر مرزا کے سیاسی مکتبۂ فکر کے لئے قطعی اجنبی تھا۔ علاوہ اس کے جس گھر کا میں چراغ تھا، اس کی روایات قطعاً مختلف تھیں۔ ظاہر ہے میں قصر صدارت کراچی سے دل برداشتہ رخصت ہوا۔ اس کے ایوانوں میں سے گزرتے وقت مجھے قائداعظم کا خیال آ گیا۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

بات یہ نہیں کہ میں سکندر مرزا جیسے پیشوایان سیاست سے ملتا نہیں رہا۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے، ان کی باتیں سنی ہیں۔ اور اپنی بھی سناتا رہا ہوں۔ لیکن میری طرح انہیں بھی احساس ہے کہ جب ضمیر فروشی کا معاملہ آتا ہے تو علامہ کے ارشادات اچانک مجھے زنجیروں کی طرح جکڑ لیتے ہیں۔

غیرت ہے طریقت حقیقی غیرت سے ہے فقر کی تمامی
اے جان پدر! نہیں ہے ممکن شاہیں سے تدرو کی غلامی

ان میں سے بعض سے میں وقتی طور پر متاثر بھی ہوا ہوں یا توقعات وابستہ کی ہیں، لیکن ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس امید پر کہ شاید ان کے ہاتھوں ملک میں ایک صالح سیاسی نظام کا نفاذ ہو سکے جس کے ذریعے ملت کی فلاح و بہبود کے امکانات پیدا ہو جائیں۔ مگر ان کی ذات میں جن صفات کو دیکھنے کی آرزو کرتا رہا، وہ نظر نہ آئیں۔ اور مجھے بہ عالم مجبوری یہ کہہ کر کنارہ کشی اختیار کرنا پڑی۔

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز، گفتار واہی!

انقلابی حکومت سے تعاون کے دوران میں تین مرتبہ اقوام متحدہ اور ایک مرتبہ چین بھیجا گیا۔ آسٹریلیا، میکسیکو اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومتوں کی دعوتوں پر ان ممالک کے تعلیمی اداروں میں اسلامی آئین، تمدن اسلام یا اقوام متحدہ کے مستقبل کے موضوعات پر خطبات دیئے۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور ترکی کی یونیورسٹیوں میں پاکستان کے تصور پر تقریریں کرتا رہا۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک میرا وقت کبھی وطن میں اور کبھی وطن سے باہر گزرا، مگر تنہائی اور نامحرمی کی کیفیت بدستور طاری رہی۔

ستمبر ۱۹۶۴ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کیا اور چند ہفتوں کے بعد آپ لاہور تشریف لائیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور مبارکباد پیش کی کہ بالآخر ان کا دل پسیج گیا۔ میں نے نہایت عجز سے انہیں اپنی خدمات پیش کیں، اور اسی شام انہی کے حکم کے مطابق قائداعظم اور علامہ اقبال کی مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھ پر علامہ کی سیرت اور تعلیمات کا اثر نہ ہوتا تو صدارتی

انتخاب کی کشمکش میں مادر ملت کا ساتھ دینے کی سعادت سے محروم رہ جاتا۔ میرے لئے یہ عمل فطری تھا کیونکہ مجھے تربیت ہی ایسی ملی ہے۔ جہاں کہیں بھی عشق، فقر، جرأت اور حریت کا مظاہرہ ہوتا ہے، مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

اسی رات کوئی دو بجے کے قریب میں علامہ کے مزار پر پہنچا اور ان سے عرض کیا "آپ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ میرا دل پتھر کا ہے، میں بڑا سنگدل ہوں۔ میں صرف یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ میں بے حس نہیں ہوں۔"

ہم اس ملک کی حالیہ سیاسی تاریخ کے بے حد قریب ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لئے یہ اندازہ کر سکنا نہایت مشکل ہے کہ مادر ملت نے اس صدارتی انتخاب میں حصہ لے کر کس نوع کی ملی خدمت انجام دی ہے۔

ہماری ملی سیرت کو ابھی فقر کی سان پر چڑھنا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر جو کردار پیش نظر ہے، اسے دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور رونا بھی۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی تجربہ خاصا سبق آموز ہے۔ انقلابی حکومت کے ساتھ تعاون کے مختصر سے دور میں مجھے جو بھی "بڑا آدمی" ملا، اس کے مراسم علامہ کے ساتھ ذاتی رہ چکے تھے اور وہ میرا بڑا مداح تھا۔ لیکن جب میں نے مادر ملت کا ساتھ دیا تو یکایک یہ 'بڑے آدمی' مجھ سے نظریں چرانے لگے۔ گویا ان کا نہ تو علامہ سے کوئی تعلق تھا، نہ میرے ساتھ کوئی واسطہ۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم!

اب مجھے اگر 'شکم' کے بجائے 'دل کی آزادی' قبول ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ آخر یہ کس کی سیرت، کس کی تعلیمات اور کس کی تربیت کا اثر ہے؟

اس نفسا نفسی کے عالم میں چند اور عظیم شخصیتوں سے بھی قرب کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے جسٹس کیانی کی سیرت میں انہی صفات اربعہ کا پرتو دیکھا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کی دلیرانہ حق گوئی سے اس ملک کا ہر باضمیر شخص متاثر ہوا۔ انہوں نے نہایت ہی نازک دور میں نہ صرف عدلیہ کی زندہ ضمیری، وقار اور آزادی کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا بلکہ اپنے عمل سے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ کسی اصول یا نصب العین کی خاطر زندہ رہنا ہی زندگی ہے۔

اسی طرح حمید نظامی نے بھی تند و تیز ہوا کے باوجود آزادی فکر و تحریر کا چراغ جلائے رکھا اور اس ملک کی صحافت میں ایک ایسی مثال قائم کی جس پر "نوائے وقت" جس قدر فخر کرے، کم ہے۔

یہ درست ہے کہ پاکستان میں ایسی جرائت مند اور آزاد شخصیتیں خال خال پیدا ہوتی ہیں۔ بہرحال، یہی وہ چند ہستیاں ہیں جنہیں میں نے "حلقہ ء محرماں" یا "حلقہ ء اقبال" سے وابستہ پایا، اور جن کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہنا، علامہ کی سیرت و تربیت کے طفیل، ابتدا ہی سے میری فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔

طریقہ ء اقبالیہ کیا ہے؟ یہی کہ عشق، فقر، جرائت اور حریت ایسی صفات کو ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنائیں تاکہ ان قدروں کو ہم ملک کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی شعبوں میں منعکس کر سکیں۔ یہی فلسفہ ء خودی ہے اور اسی کو سلسلہ ء اقبالیہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ایسی تربیت جو ہمارے سیاسی اور معاشرتی ماحول کو صالح اور پاکیزہ بنانے کے بجائے بے ضمیری، چاپلوسی اور غلامی کی ترغیب دے، ہمیں کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔

علامہ کی سیرت و شخصیت سے میں نے یہ سبق سیکھا ہے کہ اگر حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکنے کی جرائت ہے تو زندگی آزاد اور بامعنی ہے ورنہ زندگی فقط موت کے انتظار کا نام ہے۔ اسی بنا پر آزاد مرد موت کے انتظار کی خاطر نہیں بلکہ اصول یا نصب العین کی خاطر زندہ رہتے اور مرتے ہیں۔ اگر اصول یا نصب العین کی خاطر زندہ رہنے اور مرنے کی توفیق نہیں تو زندگی، محض نباتاتی یا حیواناتی زندگی ہے۔ اسے کسی حالت میں بھی انسانی زندگی نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے

یہ جواب تو اس سوال کا تھا کہ علامہ کی سیرت و شخصیت کا مجھ پر ذاتی طور پر کیا اثر ہوا۔ اب اسی سوال کے دوسرے حصے (یعنی علامہ کی سیرت اور تعلیمات سے میں نے فکری طور پر کیا اثر قبول کیا) کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرے گھر کا ماحول دینی بھی تھا اور علمی بھی۔ میں نے اس ماحول سے غیر شعوری طور پر یہ اثر قبول کیا کہ اسلام میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے ذریعے وقت کے ہر نئے تقاضے کی تعبیر ممکن ہے۔ اس اعتبار سے اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جو بیک وقت قدامت پسند بھی ہے اور جدید بھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس نے مجھ میں دنیائے جدید کو سمجھنے کے لئے

فلسفہ، منطق، تصوف، اخلاقیات اور ادب پر چودھری صاحب کے ساتھ مناظرے میری ذہنی ساخت کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئے۔

ستمبر ۱۹۴۹ء میں کیمبرج پہنچ کر تحقیق کے لئے موضوع کا تعین کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ مشہور برطانوی مستشرق پروفیسر آربری، جن کے زیر نگرانی مجھے تحقیق کا کام کرنا تھا، اسلامی تصوف کے ماہر تھے۔ سیاسی طور پر آپ برطانیہ کی 'قدامت پسند' جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ میں امام غزالیؒ کے تصوف کے نفسیاتی پہلو پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کروں۔ لیکن اس موضوع پر تحریر کرنے کے لئے عربی زبان میں مہارت کے علاوہ یونانی اور لاطینی زبانوں سے شناسائی بھی ضروری تھی۔ بہرحال، خاصی لے دے کے بعد میں نے تحقیق کے لئے "برصغیر ہند میں مسلم سیاسی فلسفے کا ارتقاء" کا موضوع منتخب کیا۔ اس سلسلے میں مجھے پروفیسر آربری اور پروفیسر روبن لیوی، دونوں کے زیر نگرانی کام کرنا پڑا۔ پروفیسر روبن لیوی پروفیسر آربری سے قطعی برعکس نظریات رکھتے تھے۔ آپ عقیدۃً یہودی تھے اور سیاسی طور پر آپ کا زاویۂ نگاہ سوشلسٹ بلکہ مارکسسٹ تھا۔ مجھے قیام انگلستان کے دوران میں دوسرے برطانوی مستشرقین یعنی پروفیسر گب، منگمری واٹ وغیرہ سے بھی تبادلۂ خیالات کے مواقع ملے لیکن میں ان میں سے کسی ایک سے بھی متاثر نہ ہوا۔ دراصل مجھے ان سے اسلام پر تبادلہ خیالات کے دوران میں یہ احساس ہوا کہ انہیں نہ تو اسلام سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ اس سے کوئی ہمدردی، بلکہ ان کا زاویۂ نگاہ اسی پرانے تعصب پر مبنی ہے، جو عیسائیوں اور یہودیوں کو قرون وسطیٰ کے زمانے سے اب تک اسلام سے رہا ہے۔ ان کی منافقت کے باعث ان پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا۔ اسی مرحلے پر چودھری محمد حسین کی وفات کی اطلاع ملی اور مجھے فکری اور روحانی تنہائی کے احساس نے آ لیا۔

منتخب کردہ موضوع پر تحقیق ایک نہایت کٹھن سفر تھا کیونکہ رہبر قابل اعتماد نہیں تھے۔ میں کچھ عرصے تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا لیکن رفتہ رفتہ رہبروں کو پیچھے چھوڑ کر تنہا آگے نکل گیا۔ مجھے تحقیق نے دو باتیں سکھائیں۔ تحمل اور خود اعتمادی۔ تنہائی کے عالم میں تحمل کا احساس انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ نیز جو انسان اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے، وہ ہمیشہ خود اعتماد ہوتا ہے۔

میں تقریباً پانچ سال تحقیق کے سفر پر گامزن رہا۔ میں نے سفر کی ابتدائی منازل میں تاریخ اسلام کا عمیق مطالعہ کیا۔ میرے سامنے ایک بیکراں سمندر تھا جس میں قومیں لہروں کی طرح ابھرتی، ڈوبتی پھر ابھرتی تھیں۔ اس مطالعے سے مجھ پر کئی راز افشا ہوئے۔ مجھے تاریخ کے

تجسس پیدا کیا۔

مجھ میں لکھنے کے شوق کی بنیاد تیرہ چودہ سال کی عمر سے پڑ چکی تھی گو میری تحریریں قابل توجہ نہ تھیں۔ میں نے پہلی بار علامہ کی زندگی ہی میں ۱۹۳۸ء کے جلسہ یوم اقبال میں جناب خواجہ غلام السیدین کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ جلسہ مینارڈ ہال میں منعقد ہوا تھا۔ علامہ کی وفات کے بعد لکھنے کا شوق جاری رہا لیکن اس شوق کا دائرہ محض ادبی تحریروں تک محدود تھا۔ ان دنوں میں ترقی پسندی کی تحریک سے خاصا متاثر ہوا۔ میری تحریریں ترقی پسند رسالوں میں اکثر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اسی دور میں یعنی ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک پاکستان کے حصول کے لئے سیاسی کشمکش شروع ہوئی۔ اس کشمکش نے اکثر مسلم طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کشمکش کے آخری ایام میں جب خضر وزارت نے پنجاب میں "ڈان" اخبار کے داخلے پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں، چند طلبہ نے ایک زمین دوز اخبار نکالا جس کا نام "نوائے اسلام" رکھا گیا۔ اس اخبار کے ادارے سے میں بھی منسلک تھا۔ دراصل یہ اخبار کچھ عرصے تک میرے ہی گھر میں ترتیب دیا جاتا رہا۔

علامہ کی شخصیت سے متعلق پہلا مضمون بعنوان "اقبال۔ ایک باپ کی حیثیت سے" میں نے ۱۹۴۶ء میں تحریر کیا۔ یہ مضمون اس سال یوم اقبال کے موقع پر ریڈیو اسٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں یوم اقبال کے موقع پر اسلامیہ کالج ہال میں پہلی مرتبہ میں نے ایک مقالہ بعنوان "اقبال کا تصور اجتہاد" پڑھا۔ اس سے اگلے سال "اقبال کے مابعد الطبیعیاتی تصور میں اخلاقیات کا مقام" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جو اردو اور انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ اسی دور میں کچھ مضمون قائداعظم، تحریک پاکستان اور علمی، ادبی یا فلسفیانہ موضوعات پر تحریر کئے جو شائع ہوئے۔ مگر یہ تمام کوششیں طالب علمی کے زمانے کی تھیں۔

انگلستان جانے سے پیشتر میں ایم۔ اے کے طالب علم کی حیثیت سے انگریزی ادب سے متعارف ہو چکا تھا۔ انگریزی ادب کے مطالعے نے مجھ میں یونانی، لاطینی، اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور المانوی ادب کے شہکار پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ میں نے یورپی کلاسیکی اور ماڈرن لٹریچر کا مطالعہ انگریزی تراجم کے ذریعہ کیا۔ ساتھ ہی اردو، فارسی اور عربی ادب سے بھی شناسائی پیدا کی۔ بعد میں ایم۔ اے فلسفہ کے طالب علم کی حیثیت سے میں اسلامی اور مغربی فلسفے سے متعارف ہوا۔ فلسفے کے مطالعے نے میرے انداز فکر میں ایک نیا تجسس پیدا کر دیا۔ انہی ایام میں چودھری محمد حسین کے زیر اثر کلام اقبال کا مطالعہ بھی کیا گیا۔ دینیات،

مطالعے سے زندگی میں پہلی بار خداوند تعالیٰ کی طاقت، قوت، عظمت اور جلال کا احساس ہوا۔ اس کے علاوہ اس مطالعے نے مجھ پر یہ حقیقت بھی واضح کی کہ اسلام جامد نہیں بلکہ ایک متحرک ضابطہ حیات ہے۔ میں ابن خلدون سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ بلکہ ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کے ذریعے میں نے علامہ کے الہیاتی تصور 'دوام در تغیر' کی حقیقت و ماہیت کو سمجھا۔ میں نے تاریخ اسلام کے پس منظر میں "اسلامی تصور ریاست" کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں قرآن و حدیث کے علاوہ الماوردی کی "احکام السلطانیہ" اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان مسلم سیاسی مفکروں کی تحریریں دیکھیں جو یونانی فلسفے سے متاثر ہوئے۔ "مکالمات افلاطون" دوبارہ پڑھے۔ نیز فارابی کا سیاسی فلسفہ، غزالی کا تصور امامت اور سیاسی فلسفے سے متعلق نصیر الدین طوسی، ابن خلدون وغیرہما کی تحریریں نگاہوں سے گزریں۔ یہ مطالعہ میرے تحقیقی مقالے کے تعارفی باب کے سلسلے میں تھا جسے تحریر کرنے میں مجھے دو سال کا عرصہ لگا۔ میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام کی حقیقی روح صرف جمہوریت کے نفاذ ہی سے مادی دنیا میں منکشف ہو سکتی ہے۔ اگر امویوں نے خلافت کو موروثی شکل نہ دی ہوتی تو رفتہ رفتہ صحابہ کا اجماع ایک مجلس آئین ساز کے قیام پر منتج ہوتا۔ براہ راست انتخاب کے ذریعے خلیفہ کا تقرر کیا جاتا اور اسی طریق انتخاب سے مجلس آئین ساز کے ارباب بست و کشاد بھی چنے جاتے۔ یوں خلفاء و سلاطین کے فرمان عوام کی نگاہ میں قطعی بے وقعت ہوتے اور آئین اسلامی کا نفاذ اجماع امت کے ذریعے ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ بلکہ جابر اور ظالم حاکموں نے اجماع امت کے ذریعے وضع کیے ہوئے آئین کے بجائے فرمان کے ذریعے حکومت کی۔ اس اعتبار سے ۶۶۱ء سے روح اسلام محبوس ہے۔

میرے سفر کی دوسری منزل برصغیر ہند میں اسلامی حکومت کے عروج و زوال کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ یہ باب تحریر کرتے وقت جن شخصیتوں سے میں متاثر ہوا، وہ البیرونی اور شیخ احمد سرہندیؒ تھے۔ البیرونی، سلطان محمود کی معیت میں دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہندوستان آئے۔ اپنی تصنیف "کتاب الہند" میں انہوں نے ہندوؤں کی عادات اور رسم و رواج کا مسلمانوں کی عادات اور رسم و رواج سے مقابلہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

> "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہندوؤں نے اپنے رسم و رواج کو دیدہ و دانستہ طور پر مسلمانوں کے رسم و رواج کے برعکس شکل دے رکھی ہے۔ ہمارے رسم و رواج ہندوؤں کے رسم و رواج سے مشابہت نہیں رکھتے بلکہ قطعی الٹ ہیں۔ اور اگر اتفاق سے ان کا کوئی رواج

ہمارے کسی رواج سے مشابہت رکھتا بھی ہے تو اس کے معنی قطعی الٹ ہوتے ہیں۔"

پھر البیرونی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی اور بے تعلقی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے تحریر کیا:

"ہندوؤں کے تمام تر تعصب کا نشانہ وہ لوگ بنتے ہیں جو ان میں سے نہیں، یعنی جو نووارد (مسلمان) ہیں۔ وہ انہیں 'ملچھ' کہتے ہیں جس کے معنی ہیں غلیظ یا ناپاک۔ ان سے کسی قسم کا کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ نہ ان سے ازدواجی تعلق قائم کرتے ہیں اور نہ کسی اور قسم کا تعلق۔ نہ ان کے ساتھ مل بیٹھنے پر رضامند ہوتے ہیں، نہ کھانے اور پینے پر۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ پلید ہو جائیں گے۔ ان کے نزدیک ہر وہ شے پلید ہے جسے مسلمانوں کی آگ یا پانی نے چھوا ہو۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی گھر ان دو فطری عناصر کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ انہیں کسی غیر ہندو کو اپنے ہاں بلانے کی اجازت نہیں اگرچہ غیر ہندو اس دعوت کا کتنا ہی خواہش مند ہو یا ان کے مذہب کی طرف مائل ہی کیوں نہ ہو۔ دریں حالات ان میں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا تعلق قائم ہو سکنا قطعی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہے جو عبور نہیں کی جا سکتی۔"

ان خیالات کا اظہار آج سے تقریباً ایک ہزار سال پیشتر کیا گیا۔ مگر اس کے باوجود البیرونی کی یہ تحریریں قائداعظم کی تقریروں کے اقتباس معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال، ایک حقیقت واضح ہو گئی کہ برصغیر ہند میں اسلام کے ورود کے ساتھ ہی (اسلام ہندوستان میں آٹھویں صدی عیسوی میں وارد ہوا) ہندو۔ مسلم امتیاز کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام سے پیشتر جو بھی تمدن ہندوستان میں وارد ہوئے، وہ اس کے اندر جذب ہو گئے، لیکن اسلام جذب نہ ہو سکا۔ بالفاظ دیگر کسی غیر مسلم تمدن میں جذب ہونا اسلام کی فطرت کے خلاف ہے گو اسلام اپنے اندر کسی غیر مسلم تمدن کی مثبت قدریں جذب کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کے ورود سے آٹھ سو سال بعد یعنی سولہویں صدی عیسوی میں

ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں مدغم کرنے کی پہلی شعوری کوشش شہنشاہ اکبر نے "دین الٰہی" کے ذریعے کی۔ اس زمانے میں ایسا سیاسی مقصد مذہب ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ اس وقت ہندوستان میں صوفیاء کے بہت سے طریقے رائج تھے' اس لئے اکبر نے "دین الٰہی" کو بطور ایک صوفی طریقے کے پیش کیا۔ لیکن اس کی کوشش ناکام رہی کیونکہ ہندو اور مسلمان' دونوں اس اوغام کے خلاف تھے۔ "منتخب التواریخ" کے مصنف ملا عبدالقادر بدایونی تحریر کرتے ہیں کہ جب اکبر نے "مان سنگھ کو "دین الٰہی" قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے کہا "میں حضور کا نمک خوار ہوں' غلام ہوں اور مجھے آپ کی ذات سے عقیدت ہے۔ آپ میرے بادشاہ ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو بندہ اپنی جان حضور پر سے قربان کر سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ "دین الٰہی" قبول کر لو تو اس میں مجھے پس و پیش ہے۔ اس ملک میں درحقیقت دو مذہب ہیں' ایک ہندو مت اور دوسرا اسلام۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ آپ کے حکم سے اسلام پر ایمان لے آؤں' مگر مجھ سے یہ نہ کہئے کہ "دین الٰہی" قبول کر لوں۔"

اکبر کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے سلسلے میں جو خدمات شیخ احمد سرہندیؒ نے انجام دیں' وہ نہایت اہم ہیں۔ بقول علامہ اقبال' شیخ احمد سرہندی ہندوستان میں مسلم قومیت کے بانی تھے۔ مجھے کیمبرج میں "مکتوبات شیخ احمد" پڑھتے وقت اس سوال کا جواب ملا کہ علامہ نے میری پیدائش کے لئے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی بارگاہ میں دعا کیوں کی تھی اور بعد میں مجھے اپنے ہمراہ لے کر بارگاہ مجددؒ میں دوبارہ کیوں حاضر ہوئے۔

شیخ احمدؒ نے سلسلہء نقشبندیہ کو اسلام کے حقیقی مقصد سے مزین کیا۔ انہیں ہماری ملی تاریخ میں جو عظیم سیاسی مرتبہ حاصل ہے' اس کا اندازہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ دراصل اپنی ملی تاریخ' خاص طور پر قیام پاکستان کے لئے جو خدمات سلسلہء نقشبندیہ مجددیہ نے انجام دیں' ہم ان کا اندازہ کرنے سے بھی محروم رہے ہیں۔

شیخ احمدؒ نے کشف کے ذریعے اس حقیقت کو عیاں کر دیا کہ ابن عربیؒ سے متاثر صوفیاء کا تصور "وحدت الوجود" دراصل "وحدت الشہود" ہے۔ یعنی خدا کی ذات و صفات یا خالق و مخلوق حقیقی طور پر وحدت نہیں بلکہ بظاہر وحدت ہے۔ درحقیقت خدا کی ذات اپنی صفات اور مخلوقات سے ماورا ہے۔

"وحدت الوجود" کے حامی' بعض برخود غلط صوفیاء کا ایمان تھا کہ ہر شے میں خدا ہے' بلکہ ہر شے خدا ہے۔ اسی تصور سے متاثر ہو کر اکبر نے "دین الٰہی" ترتیب دیا اور اس

صوفی نظریے کی بنیادوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ادغام کی کوشش کی۔ شیخ احمد نے یہ واضح کر دیا کہ خالق کی ذات اپنی مخلوقات سے علیحدہ ہے اور مخلوقات اس کی ذات تک کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ انسان کے لئے خداوند تعالیٰ کا قرب صرف ایک ہی ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ غیب پر ایمان لائے، کتاب اللہ میں اللہ نے جو احکام دے رکھے ہیں ان کی تعمیل کرے، اور جب کبھی وضاحت کی ضرورت محسوس ہو تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ بالفاظ دیگر اسلام دراصل شریعت کی پابندی ہے۔ یہی نظریہ ابن تیمیہ کا بھی تھا لیکن ابن تیمیہ عالم تھے، عارف نہ تھے۔ شیخ احمد تصوف کو غیر اسلامی عناصر سے پاک کر کے واپس کتاب اللہ کی طرف لے آئے۔ تصوف کی اس تطہیر نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی ملی وحدت کو استحکام بخشا۔

کچھ عرصہ بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے ادغام کی دوسری شعوری کوشش دارا شکوہ نے کی، لیکن اسے اورنگ زیب عالمگیر نے ناکام بنا دیا۔ علامہ کی نگاہ میں اورنگ زیب عالمگیر بھی مسلم قومیت کے بانیوں میں سے تھے۔ بعض ہندو اور انگریز مورخ یہ تحریر کرتے ہیں کہ اورنگ زیب ایک متعصب حاکم تھا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وار مسئلے کا حل ڈھونڈھنے کے لئے ہندوؤں کو زبردستی اسلام قبول کرایا۔ نتیجتہً برصغیر ہند کی مسلم آبادی زیادہ تر ان ہندوؤں پر مشتمل ہے جنہیں زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا۔ لیکن غور طلب بات تو یہ ہے کہ اگر یہ تبدیلی مذہب زبردستی ہوتی تو اورنگ زیب کے رستے میں کیا چیز حائل تھی کہ اس مسئلے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی خاطر سب کے سب ہندوؤں کو بزور شمشیر مسلمان نہ بنا لیا۔

جنوبی امریکہ کے ممالک میں ہسپانیہ نے کیتھولک مذہب کا نفاذ زبردستی کیا تھا لیکن اس کا ردعمل یہ ہے کہ جوں جوں قوم پرستی کی تحریک وہاں زور پکڑ رہی ہے، کیتھولک مذہب کو مغربی شہنشاہیت کا ایک نشان تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس برصغیر ہند کے مسلمان اپنے مذہب پر کس قدر نازاں ہیں۔ اگر اسلام ان پر زبردستی ٹھونسا گیا ہوتا تو وہ پاکستان کے حصول کے لئے تگ و دو نہ کرتے بلکہ اسلام کو عربوں، ترکوں، افغانوں، ایرانیوں، تاتاریوں یا مغلوں کے دور شہنشاہیت کا نشان سمجھ کر ٹھکرا دیتے۔

میرے سفر کی تیسری منزل برصغیر ہند میں اسلام کی تجدید کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ اس مرحلے پر میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا وہ شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید تھے۔ شاہ ولی اللہ کی تحریروں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ فقہ اسلامی اجتہاد کے دروازے

کھولنے ہی سے متحرک ہو سکتی ہے۔ نیز شاہ اسمٰعیل شہید کے غیر مقلد ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے زوال یافتہ اسلامی معاشرے کا فقہی جمود توڑنا چاہتے تھے۔ یہ تاثر ان کی تصانیف "صراط مستقیم" اور "تقویت الایمان" کے مطالعے سے قائم ہوتا ہے۔ علامہ کے نزدیک یہ دو ہستیاں ان بلند پایہ علماء میں سے تھیں جنہیں ہندی اسلام نے پیدا کیا۔

سید احمد بریلوی کی تحریک (جسے 'وہابی' تحریک بھی کہا جاتا ہے) اصلاحی بھی تھی' سیاسی بھی اور معاشرتی بھی۔ اصلاحی طور پر اس تحریک نے اسلام کو غیر شرعی بدعتوں سے پاک کیا۔ سیاسی اعتبار سے چونکہ غیر مسلم ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور ہندوستان 'دار الحرب' قرار دیا جا چکا تھا' اس لئے مسلمانوں کے سامنے صرف دو ہی رستے تھے۔ یا تو اپنا کھویا ہوا سیاسی مقام حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف جہاد کریں یا ہندوستان چھوڑ کر کسی مسلم ملک یعنی 'دار الاسلام' میں ہجرت کر جائیں۔ اصولی طور پر 'مسلمان' ہندوستان میں محکوموں کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے تھے۔ معاشرتی اعتبار سے اس تحریک نے مسلمانوں کو ایک نیا احساس وقار بخشا۔ جہاد کی دعوت دے کر اس نے گرے پڑے مسلمانوں کے دلوں میں مل جل کر اسلام کی سربلندی کی خاطر برسر عمل رہنے کا جذبہ پیدا کیا' اور یوں ان عامی مسلمانوں کو اپنی گری ہوئی معاشرتی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لا کھڑا کیا۔

سید احمد بریلوی کی تحریک کے مطالعے نے مجھے زندگی میں پہلی بار یہ احساس دلایا کہ اسلام دراصل دین انقلاب ہے' اور اگر رسول اکرمؐ کی سیرت کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو حضورؐ بھی ایک انقلابی کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ پس مسلمان سوائے انقلابی کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اس کی فطرت میں ہے کہ ہر وقت انقلاب کے لئے کوشاں ہو اور ہر فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کرتا رہے۔ ورنہ وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ سید احمد بریلوی کا جہاد صرف انگریزوں کے خلاف ہی نہیں تھا بلکہ خود اپنے خلاف بھی یعنی مسلمانوں کی ناگفتہ بہ سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی حالت کے خلاف بھی تھا۔

میرے سفر کی چوتھی منزل برصغیر ہند کے مسلمانوں پر مغربی نظریات کے اثر کا جائزہ لینے سے شروع ہوئی۔ یہاں پہنچ کر میں جس شخصیت سے متاثر ہوا' وہ سرسید احمد خاں تھے۔ علامہ کی علی گڑھ سے وابستگی اور سید راس مسعود سے والہانہ محبت کا باعث یہی تھا کہ دونوں سرسید کی یادگار تھے۔

سرسید نے مسلمانوں کو اس حقیقت کا احساس دلایا کہ قرون وسطٰی کا دور ختم ہو چکا

اب دور جدید کی ابتدا ہے۔ حالات بدل گئے ہیں۔ اس لئے مغرب کے قائم کردہ نئے تمدن سے شتر مرغ کی طرح منہ چھپانے کے بجائے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ سرسید نے مسلمانوں کی توجہ نئی تعلیم کی طرف مبذول کی۔ ان کے دلوں میں مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی پر عبور حاصل کرنے کی خواہش پیدا کی۔ انہوں نے قرون وسطیٰ کی ذہنیت رکھنے والے علماء کو بھی یہ احساس دلایا کہ ماضی کی طرف منہ اور مستقبل کی طرف پیٹھ کر کے مت کھڑے رہیں بلکہ وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھیں اور اپنا زاویہ نگاہ بدلیں تاکہ ہم پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ سکیں۔

سرسید کی مثبت تعلیمات کے زیر اثر مسلمانوں نے اپنی تعلیمی، تمدنی، معاشری اور اقتصادی حالت کو سنوارنے کی کوشش کی۔ سیاسی اعتبار سے سرسید نے اس نظریے کا برملا اظہار کیا کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ اور مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ فی الحال اپنی تمام تر توجہ اپنی ملی حالت کو بہتر بنانے پر صرف کریں۔

اپنے سفر کی پانچویں منزل میں 'اتحاد اسلام' (پین اسلام ازم) 'خلافت' اور 'مسلم قوم پرستی' کی تحریکوں کے مطالعے میں مشغول ہو گیا۔ اس باب کو تحریر کرتے وقت میں جن شخصیتوں سے متاثر ہوا' وہ جمال الدین افغانی اور مولانا شبلی نعمانی تھے۔ علامہ اقبال' جمال الدین افغانی کو اسلام کے دور جدید کا مجدد سمجھتے تھے۔ جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ دنیائے اسلام کی آزادی اور سربلندی اسی صورت ممکن ہے کہ مسلم ممالک کا وفاق عمل میں لایا جائے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ جب تک مسلمان مغرب کے وسائل قوت و اقتدار کو نہ اپنا لیں' ان کے لئے مغربی شہنشاہیت اور سرمایہ دارانہ نظام کو شکست دینا محال ہے۔

مجھے مولانا شبلی کے 'ریڈیکل ازم' نے بے حد متاثر کیا۔ ان کی توجہ کا مرکز دراصل مسلم کاشتکار تھے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ان کے ذہن میں اسلام کا تصور بحیثیت ایک فلاحی ریاست موجود تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے ۱۹۱۲ء میں "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے زیر عنوان سیاسی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اس زمانے میں مسلم لیگ عوامی جماعت نہیں تھی بلکہ مفاد پرستوں کا ایک گروہ اس پر قابض تھا جس نے اسے حکومت سے مراعات حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنا رکھا تھا۔ مولانا شبلی نے تحریر کیا:

"اس موقع پر پہنچ کر دفعتہ" ہمارے سامنے ایک چیز نمودار ہوتی ہے'

مسلم لیگ۔ یہ عجیب الخلقت کیا چیز ہے؟ کیا یہ پالیٹکس ہے؟ خدانخواستہ نہیں۔ انٹی کانگرس ہے؟ نہیں۔ کیا ہاؤس آف لارڈز ہے؟ ہاں، سوانگ تو اسی قسم کا ہے.... پالیٹکس کی بحث میں ہمارا سب سے پہلا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی... جس گروہ کے نزدیک صرف زبان سے کوئی لفظ بول دینا پالیٹکس ہے، وہ کیونکر پالیٹکس کی حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ پالیٹکس ایک سخت قوی احساس ہے۔ اس کا ظہور بیگار کے طریقے پر نہیں ہوتا۔ یہ احساس جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو دل و دماغ اور اعضا، سب مصروف کار ہو جاتے ہیں۔ لیگ کا طرز عمل بتاتا ہے کہ اس کی آواز ایک مصنوعی اور خارجی آواز ہے۔"

آپ نے مسلم لیگ کے نظام ترکیبی پر اعتراض کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا وہ قیامت تک درست ہو سکتا ہے؟ پہلا سوال یہ ہے کہ مسلم لیگ اس خصوصیت کو چھوڑ دے گی کہ اس کو سب سے پہلے دولت اور جاہ کی تلاش ہے۔ اس کو.... وہ مہرے مطلوب ہیں جن پو طلائی رنگ ہو، لیکن پالیٹکس کی بساط میں ان مہروں کی کیا قدر ہے؟ کیا ایک معزز رئیس، ایک بڑا زمیندار، ایک حکام رس دولت مند کسی تحریک کے لئے اپنی جائیداد، اپنی حکام رسی، اپنی فرضی آبرو کو نقصان پہنچانا گوارا کر سکتا ہے؟.... آج کل کسی شخص کی پرائیویٹ حالت پوچھنا خلاف تہذیب ہے، لیکن بہ ضرورت مسلم لیگ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ مالی حالت کے لحاظ سے آپ کی ہستی کیا ہے تو جواب ملے گا، ایک خاص 'دست کرم۔ اس بنا پر مسلم لیگ کے تمام منصوبے، تمام تجاویز، تمام ارادے اسی 'دست کرم' کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں۔"

میرے سفر کی چھٹی منزل برصغیر ہند میں 'مسلم قوم پرستی' کے فروغ کا مطالعہ تھا۔ میں نے اس باب میں فکر اقبال کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ ساتویں منزل آخری تھی۔ اس میں قائداعظمؒ کی شخصیت اور پاکستان کو معرض وجود میں لائے جانے کی تفصیل دی گئی۔

اس طویل سفر کے دوران میں مجھ پر دو مزید راز کھلے۔ ایک تو یہ کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں دو متضاد روئیں ایک دوسری سے متصادم ہوتی رہیں۔ پہلی رو تو اس مکتبہء فکر کی تھی جو ہندوؤں میں مسلمانوں کا ادغام عمل میں لانا چاہتا تھا۔ اس مکتبہء فکر کے حامی شہنشاہ اکبر، دارا شکوہ اور ہماری جدید سیاسی تاریخ میں مولانا ابو الکلام آزاد تھے۔ دوسری رو اس مکتبہء فکر سے ظاہر ہوئی جو مسلمانوں کی ملی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ رہ کر، اسلام کی بنیادوں پر، عمل میں لانے کا خواہش مند تھا۔ اس مکتبہء فکر کے حامی شیخ احمد سرہندی مجددالف ثانیؒ، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر، شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، سرسید احمد خان، جمال الدین افغانی، علامہ اقبال اور قائداعظم تھے۔ قیام پاکستان سے ثابت ہے کہ اس تاریخی تصادم میں بالآخر کونسی رو غالب آئی۔

اس مطالعے سے دوسرا راز جو مجھ پر افشا ہوا، وہ یہ تھا کہ جب سے اسلام برصغیر ہند میں وارد ہوا، روح اسلام اپنی نمو کی خاطر راہ ڈھونڈنے کی سعی پیہم کرتی رہی۔ گزشتہ بارہ سو سال میں کبھی تو اس نے مشاہدے کے ذریعے اور کبھی کشف کے ذریعے اسی کوشش کا اظہار کرنا چاہا۔ کبھی شہنشاہوں کے فرمان کی صورت اختیار کی، کبھی علماء کی وساطت سے اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی، کبھی مجاہدین کی تلواروں کی راہ سے، کبھی جدید سیاسیات کے بھیس میں، کبھی دنیائے اسلام کے اتحاد کی داعی کی ہیئت میں، کبھی ادب اور کبھی فلسفے کی شکل میں۔ غرض، اس نے مختلف ذرائع اختیار کیے حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں جا کر اسے واضح زبان نصیب ہوئی جب وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ڈھل گئی۔ اور بالآخر قائداعظم کے ہاتھوں پاکستان کے قیام کے ذریعے اس نے بارہ سو سال کی جدوجہد کے بعد اس مقصد کو پالیا۔

ارتقائے انسانی کے بارے میں مشرق و مغرب کے مفکروں نے مختلف نظریے پیش کیے ہیں۔ جلال الدین رومیؒ کے نزدیک انسان ارتقائی منازل طے کرتا ہوا فرشتوں کے مقام تک جا پہنچے گا۔ ابن مسکویہ کی نگاہ میں حیات، معدنی، نباتاتی اور حیواناتی منازل سے گزرتی ہوئی انسانی منزل تک پہنچی اور اس منزل سے اس کے ارتقا نے اسے نبوت کی منزل تک پہنچا دیا۔ ڈارون نے یہ مشاہدہ کیا کہ حیات کی ابتدا دراصل پانی میں ہوئی اور رفتہ رفتہ خشکی پر مختلف حیواناتی منازل طے کرتی ہوئی انسان تک پہنچی۔ اس سائنس دان کی رائے میں تحریک حیات دراصل ایک اندھی میکانکی قوت ہے جو اپنے آپ کو اپنے ہی وزن کے زور سے آگے دھکیلتی چلی آئی ہے۔ برگساں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تحریک حیات درحقیقت تخلیقی ہے اور حیات کی جس شاخ میں قوت تخلیق نہیں رہتی، وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ دریائے حیات اپنی

باطنی تخلیقی قوت کے زور سے بل کھاتا ہوا آگے بڑھا ہے اور اس کی جس شاخ میں قوت تخلیق ناپید ہوئی، وہ پس آب کی صورت میں پیچھے رہ گئی۔ حیات کی یہ پس آب کی صورت میں پیچھے رہی ہوئی جامد جھیل دلدل میں تبدیل ہوئی اور رفتہ رفتہ اس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ نطشے نے یہ تصور پیش کیا کہ تحریک حیات جاری و ساری ہے، لہٰذا انسان کی اگلی ارتقائی منزل 'مافوق البشر' ہے۔ اس کے نزدیک مافوق البشر' صاحب امر یعنی حاکم ہو گا اور عامی انسان اس کے تابع اور محکوم ہوں گے۔

ان نظریات اور تاریخ انسانی کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تغیر حیات کا اصل راز ہے۔ اگر ہم دنیائے جدید پر نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اب یہ تغیر انسان کے سیاسی، معاشری اور اقتصادی ارتقاء کی صورت میں منکشف ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں فکر انسانی جو نظام وجود میں لایا ہے، ان کا جائزہ لینا بھی لازم ہے۔ کہ وہ کس حد تک انسان کی باطنی قوت تخلیق کو اظہار کا موقع دے کر اس کے معاشری اور اقتصادی ارتقاء کی رفتار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

اشتراکی نظام میں چند خوبیاں ہیں لیکن اس کی سب سے بڑی کوتاہی ریاست کا جبر و استبداد ہے۔ اس جبرو استبداد کا منتہائے نظر صرف اس حد تک انسانی قوت تخلیق کو اظہار کا موقع دیتا ہے جو ریاست کو زیادہ سے زیادہ قوی اور مضبوط بنائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر اشتراکی نظام میں ریاست انسانوں کو ان کی انسانی سطح سے گرا کر حیوانوں کے غول میں منتقل کر دیتی ہے اور اپنی قوت اور مضبوطی کو بڑھانے کی خاطر ان سے یوں محنت و مشقت کرواتی ہے گویا وہ انسان نہیں، بن مانسوں کا غول ہیں۔ ان مسلسل مشقت کرنے والے انسانوں کے گروہوں میں یقیناً مساوات ہوتی ہے لیکن یہ 'مساوات شکم' بعینہٖ اس نوع کی ہے جو ان حیوانوں میں پائی جاتی ہے جو غول یا ریوڑ کی ہیئت میں زندہ رہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ جمہوری نظام انسان کی باطنی قوت تخلیق کے اظہار کے لئے نسبتاً زیادہ مواقع فراہم کرتا ہے۔ مگر اس نظام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ گو بظاہر حکومت جمہور کی ہوتی ہے لیکن حقیقی طاقت ان چند گنے چنے سرمایہ داروں کے جتھے کے ہاتھ میں رہتی ہے جن کے قبضے میں ملک کے وسائل دولت ہوتے ہیں۔

ان حالات میں انسان کی باطنی قوت تخلیق کو اظہار کا موقع دے کر اس کے معاشری اور اقتصادی ارتقاء کی رفتار میں اضافہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں میں نے ذاتی طور پر علامہ کے نظریات کو سود مند پایا ہے۔ علامہ کے نزدیک ارتقائے انسانی کا منتہائے نظر

فرشتوں کی منزل حاصل کرنا ہے نہ نبیوں کی۔ ان کی رائے میں تحریک حیات ایک اندھی میکانکی قوت نہیں۔ نہ ہی ارتقائے انسانی کا آخری مقصد کسی مافوق البشر کو وجود میں لانا ہے۔ بلکہ تحریک حیات ایک ایسی تخلیقی قوت ہے جو ہر دم تکمیل خودی اور تسخیر کائنات کے لئے رواں دواں ہے۔ اس قوت کا اصل جوہر تخلیقی عمل ہے کیونکہ جونہی تخلیقی عمل ناپید ہوتا ہے، موت یا فنا وقوع میں آتی ہے۔

پس، انسان کے معاشری اور اقتصادی ارتقاء کے لئے لازم ہے کہ ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جس کے ذریعے اس کا تخلیقی عمل تیز تر ہو سکے۔ جمہوریت بلاشبہ ایک ایسا نظام ہے جو انسان کے تخلیقی عمل کے لئے اظہار کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ مگر ایک ایسا نظام جو بظاہر جمہوری ہو اور درحقیقت فسطائی عناصر رکھتا ہو، کسی بھی صورت میں ان عظیم انسانی مقاصد کے حصول کے لئے ممد ثابت نہیں ہو سکتا جن کی سمت دریائے حیات رواں دواں ہے۔

علامہ کے نزدیک اسلام، انسان کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ایسے ہمہ گیر احکامات کے تابع لاتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسانیت کی راہ میں صرف کر دے۔ پس، اسلامی اصول پر مبنی جمہوریت کاملہ ایک ایسی دنیا وجود میں لا سکتی ہے جس میں شخصی ملکیت کو تولیت کے طور پر قبول کرنے کے باوجود سرمائے کو اس طرح جمع ہو سکنے کی اجازت نہ دی جائے کہ حقیقی پیداکاروں کو مغلوب کر لے۔

ظاہر ہے کہ جب تک پاکستان کو صالح سیاسی قیادت نصیب نہیں ہوتی، اور جب تک اسلامی اصول پر مبنی جمہوریت کاملہ کو وجود میں نہیں لایا جاتا، ملت کی انفرادی اور اجتماعی تخلیقی قوتوں کو اظہار کا موقع ملنا محال ہے اور ہمارے معاشری اور اقتصادی ارتقاء کی رفتار میں اضافہ ہونا ناممکن ہے۔ اسی بنا پر علامہ کے افکار و نظریات کا اطلاق ہماری آج کی کشمکش اور تگ و دو پر اسی طرح ہو رہا ہے جس طرح آج سے پیشتر ہمارے غلامی اور محکومی کے عہد میں ہوتا چلا آیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی فکر اقبال تروتازہ اور زندۂ جاوید ہے۔

میں نے جس سطح نظر کے تحت یہ مقالات تحریر کئے، وہ یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح "زندہ اقبال" کو مستقل طور پر پاکستانیوں کی نگاہوں کے سامنے رکھا جائے۔ "زندہ اقبال" کی اصطلاح سے میری مراد یہ ہے کہ فکر اقبال کا مطالعہ محض فکر برائے فکر کے تصور پر نہ کیا جائے بلکہ اس طور سے کیا جائے کہ اس کا اطلاق ہماری آج کی زندگی پر ایک فعال اور موثر قوت کی صورت میں ممکن ہو سکے۔

"جدید اسلام میں 'لبرل ازم' کی تحریک اور اقبال" تحریر کرتے وقت مجھے اس بات کا

خاص طور پر احساس تھا کہ قیام پاکستان چونکہ ایک لحاظ سے مسلمانوں کی فکری وسعت نظری کا نتیجہ ہے، لہٰذا اس کی تعمیر کے لئے ہمارا زاویہ نگاہ بھی وسعت نظری کی اساس پر قائم ہونا چاہیئے۔

"فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کا جائزہ" سکندر مرزا کے دور کی عکاسی کرتا ہے جب کہ سیاسی طور پر ہماری حالت ناگفتہ بہ تھی۔

"اقبال اور اسلامی ریاست" انقلابی حکومت سے تعاون کے دوران میں اس توقع اور امید سے تحریر کیا گیا کہ شاید اس کے ذریعے پاکستان میں ایک صالح سیاسی نظام کا نفاذ ہو سکے یا ایک صالح سیاسی قیادت منصہ شہود پر آ سکے۔

"اقبال اور اس کے زمانے کی مسلم سیاسی جماعتیں" سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ جمہوری نظام صحیح طور پر فعال اور موثر جبھی ہو سکتا ہے جب کہ دو سے زائد سیاسی جماعتیں وجود میں نہ لائی جائیں۔

"اقبال۔ پاکستانی قوم پرستی اور بین الاقوامی اسلام" سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پاکستان دراصل 'مسلم قوم پرستی' کے جذبے کے فروغ سے وجود میں آیا' لہٰذا ہمارے ملی استحکام کی خاطر یہی جذبہ زندہ و برقرار رکھنا لازم ہے۔

"اقبال کے شذرات" سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کسی سیاسی نظام کی ہیئت ترکیبی کی اہمیت اس اصول سے پرکھنی چاہئے کہ آیا وہ ملی سیرت کی تشکیل و تعمیر کے لئے ممد ثابت ہوتا ہے یا اس کی تخریب کا باعث بنتا ہے۔ اگر تخریب کا باعث بنتا ہے تو ناقص ہے' اس لئے اسے فوری طور پر رد کر دینا لازم ہے۔

"اقبال اور پاکستان کے محمود و ایاز" "اقبال بحیثیت شاعر انقلاب" اور "اقبال اور قومی کردار" صالح سیاسی قیادت اور صالح سیاسی نظام کی عدم موجودگی کی شدت احساس کے عالم میں تحریر کئے گئے۔

دراصل متذکرہ مقالات اس ملک کی گزشتہ دہ سالہ سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی تاریخ پر ایک طرح کا زندہ اقبالی تبصرہ ہیں۔ چونکہ میں نے انھیں اپنے سیاسی و معاشرتی ماحول کے ردعمل کے طور پر تحریر کیا ہے' اس لئے وہ ہر اس حساس پاکستانی کے فکری اور روحانی کرب کی عکاسی بھی کرتے ہیں جو اس ماحول کو بخوبی سمجھتا ہے۔ شاید اسی سبب سے ان کی زبان دل کی زبان ہے۔

جاوید اقبال

اشاعت دوم

مقالات کا یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس کی دوسری اشاعت کا اہتمام ۱۹۷۰ء سے ہو رہا تھا لیکن میری مصروفیات کی وجہ سے تاخیر ہوتی رہی۔ اب اس میں سات مقالوں کا اضافہ کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم و مغفور نے اس کتاب کی اشاعت دوم کے سلسلے میں نہ صرف پروف پڑھ کر ان کی تصحیح کی بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

جاوید اقبال

اشاعت سوم

مقالاتِ اقبال کا یہ مجموعہ جو ۲۷ مقالات پر مشتمل ہے، نئی ترتیب کے ساتھ اقبال اکادمی پاکستان شائع کر رہی ہے۔ اس مجموعے میں کئی مزید مقالات کا بھی اضافہ کیا جا رہا ہے جو قارئین کے لیے زیادہ مفید اور دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

جاوید اقبال

فکریات

جدید اسلام میں 'لبرل ازم' کی تحریک اور اقبال ☆

اٹھارہویں صدی میں سلطنت عثمانیہ' روس اور برطانیہ کے اقتدار کے زیر اثر دنیائے اسلام کا اخلاقی' سیاسی اور اقتصادی زوال اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ یہ اس عمومی زوال ہی کا نتیجہ تھا کہ عرب' شمالی افریقہ' جنوبی روس اور ہندوستان میں 'وہابی' طرز کی اصلاحی تحریکوں نے جنم پایا۔

ان اصلاحی تحریکوں کا اگرچہ ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا اور یہ محض اتفاق تھا کہ یہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں بیک وقت ابھریں' لیکن اغراض و مقاصد کے اعتبار سے یہ تحریکیں باہم مماثل تھیں۔ ان تحریکوں کا مقصد عالم اسلام سے ان تمام خرابیوں کی بیخ کنی تھا جو تصوف' ملائیت اور مطلق العنان سلطنت عثمانیہ کے زیر اثر پیدا ہو گئی تھیں۔ دنیا بھر کے مسلمان ان تحریکوں سے متاثر ہوئے کیونکہ یہ مصلحین اسلام کی اصل اور قدرتی سادگی کی طرف از سر نو توجہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ انہوں نے توحید' رسالت اور قرآن و سنت کے بنیادی مقاصد کو اپنی منزل قرار دیا اور تمام خلاف شرع بدعتوں کے مکمل استرداد پر زور دیا۔ اس امر کے باوجود کہ ان تحریکوں نے مسلمانوں میں اور خاص طور پر ان ممالک کے مسلمانوں میں جہاں وہ اقلیت میں تھے' فرقہ وارانہ رجحانات کو ہوا دی' مگر یہ تحریکیں عام طور پر بہ اعتبار نوعیت داخلی رہیں' اس وجہ سے کہ اس وقت تک اسلامی ممالک یورپ کی توسیع کے خطرے سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہوئے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام پر یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں کی اقتصادی ضروریات نے

☆ ۲۱۔ اپریل ۱۹۵۷ء کراچی میں یوم اقبال کے موقع پر انگریزی میں پڑھا گیا۔

انہیں مجبور کیا کہ وہ دنیائے اسلام کی طرف رجوع کریں۔ یہ رجوع بعض صورتوں میں تو اسلامی دنیا کے کچھ حصوں پر مغربی طاقتوں کے تسلط میں رونما ہوا اور بعض صورتوں میں اسلامی ممالک کے اقتصادی استحصال پر منتج ہوا۔ مغرب سے براہ راست تعلق کے باعث جدید تصورات مثلاً آئین پسندی، سیکولر ازم، نیشنل ازم اور ریڈیکل ازم دنیائے اسلام میں در آئے۔ جس وقت مسلمانوں نے اپنا منفی اور انفعالی رویہ ترک کیا اور ان میں کچھ بیداری پیدا ہوئی تو اسلامی ممالک میں سے بیشتر اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے یورپی طاقتوں کے قبضے میں آ چکے تھے۔ بہرحال، وہ مسلمان جو دنیائے اسلام کے وسطی حصے میں آباد تھے، اس وقت کا انتظار کرنے لگے جب ان کا اقتدار کم ازکم ان ممالک میں قائم ہونا تھا جہاں ان کی اکثریت تھی۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے نصف ثانی ہی میں مصلحین مغرب کے خلاف جہاد میں مصروف ہو گئے۔ عرب میں ابن عبدالوہاب، شمالی افریقہ میں محمد السنوسی اور ہندوستان میں سید احمد بریلوی اور ان سب کے معتقدین نے مغربی تہذیب و تمدن کی شدید مخالفت کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد حاضر میں اسلام کا احیاء 'وہابیت' کے ہاتھوں وجود میں آیا، لیکن ایک دو نسلوں کے بعد جب اس تحریک میں وسیع النظری پیدا ہوئی تو 'لبرل ازم' نے جنم لیا اور دنیائے اسلام میں کچھ ایسے مصلحین بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے مغربی تصورات کو اسلامی رنگ دینے کا کام شروع کر دیا۔ ترکی میں مدحت پاشا، جنوبی روس میں مفتی عالم جان، مصر میں شیخ محمد عبدہ، اور ہندوستان میں سرسید احمد خان نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں یہاں تک کہ گمان ہونے لگا کہ مصلحین کے دونوں گروہ (یعنی 'وہابی' اور 'لبرل') ایک دوسرے کی مخالفت ہی کرتے رہیں گے۔ لیکن چونکہ دونوں گروہ یورپ کے بیرونی خطرے سے خائف تھے، اس لئے اسلام کے دینی اور ملکی دفاع میں دونوں نے مشترکہ طور پر حصہ لیا۔ جدید اسلام میں 'وہابیت' اور 'لبرل ازم' کے ان دو بظاہر مخالفانہ رجحانات میں مصالحت کے سلسلے میں عام طور پر جمال الدین افغانی کا نام لیا جاتا ہے۔ انہوں نے یورپ کی ترقی کی تکنیک کو اپنانے پر زور دیا اور مسلمانوں کو مغربی طاقت کے اصل راز کو سمجھنے کی دعوت دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جمال الدین افغانی کے زیر اثر ہی 'وہابیت' اور 'لبرل ازم' باہم شیر و شکر ہو کر 'پان اسلام ازم' کی تحریک کی صورت میں رونما ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم کے کچھ عرصے بعد جب سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کئے جا رہے تھے تو 'پان اسلام ازم' کی تحریک 'اسلامی نیشنل ازم' کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ دنیائے اسلام میں 'لبرل ازم' 'پان اسلام ازم' اور 'اسلامی نیشنل ازم' کی تحریکیں یورپ کے بیرونی دباؤ کے

ردعمل کے طور پر پیدا ہوئیں۔

برصغیر ہند میں 'لبرل ازم' کی تحریک مسلمانوں کی 'سیاسی قدامت پسندی' کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا شبلی اور ان کے حامیوں کے سوا (جو 'ریڈیکل' رجحانات رکھتے تھے اور جنہیں ہندوستان کی قومی تحریک یعنی 'انڈین نیشنل کانگرس' میں شرکت کرنے میں کوئی عذر نہ تھا) ہندوستان کے دوسرے تمام مسلمان مصلحین کے 'لبرل ازم' کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی تھی کہ مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدرتی طور پر ان مصلحین کے 'لبرل ازم' کا واسطہ مسلمانان عالم سے بالعموم اور مسلمانان ہند سے بالخصوص تھا۔

علامہ محمد اقبال برصغیر ہند کے 'لبرل' مصلحین میں آخری ہیں۔ ۱۹۰۷ء کے بعد سے اگر ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی اخلاقی اور فلسفیانہ تعلیمات مثلاً فرد اور جماعت کی اہمیت' ان کی زبردست رجائیت' تخلیقی عمل پر ان کا اصرار' ہر لحظہ کسی نئی منزل کو پالینے کے لئے ان کی مسلسل تگ و دو' ایک اور صرف ایک ہی خواہش سے پیدا ہوئیں' یعنی مسلمانان عالم کی بالعموم اور مسلمانان ہند کی بالخصوص ترقی و سربلندی۔

علامہ اقبال کا 'لبرل ازم' سرسید کی 'سیاسی قدامت پسندی' مولانا شبلی کے 'ریڈیکل ازم' اور جمال الدین افغانی کے 'پان اسلام ازم' کا مرکب ہے۔ سرسید احمد خان کی طرح علامہ اقبال بھی مسلمانوں کی ہندوستان کی قومی تحریک یعنی کانگرس میں شرکت کے مخالف تھے اور نتیجتہً جداگانہ انتخابات کے حامی تھے' لیکن انہوں نے سرسید کی سرکار نوازی کو اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ علامہ اقبال' مولانا شبلی کی طرح مسلمان زراعت کاروں کی اقتصادی حالت میں انقلاب کی ضرورت سے باخبر تھے۔ مگر ان کی رائے میں یہ انقلاب ہندوؤں میں مدغم ہو کر نہیں (جیسے کہ مولانا شبلی کا خیال تھا) بلکہ ان سے علیحدہ رہ کر عمل میں لانا چاہیئے۔ اپنے ان نظریوں کے ساتھ علامہ اقبال نے جمال الدین افغانی کے 'پان اسلام ازم' کو منسلک کیا اور برصغیر ہند میں وہ نہ صرف 'اسلامی نیشنل ازم' کے پہلے داعی قرار دیئے گئے بلکہ اپنی تحریر اور عمل کے بل بوتے پر اس تحریک کو تقویت بخشی۔ 'اسلامی نیشنل ازم' کو علامہ اقبال نے ان لاتعداد قوموں کی سیاسی آزادی سے تعبیر کیا جو مختلف زبانیں بولنے کے باوجود اسلام پر ایمان رکھتی ہیں اور ان علاقوں میں آباد ہیں جو بحیثیت مجموعی دنیائے اسلام کہلاتا ہے' لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ یہ سیاسی آزادی مساوات اور اتحاد کے اسلامی اصولوں سے متصادم نہ ہونے پائے کیونکہ یہ اصول مسلمانوں کے دین اور کلچر کی روح ہیں۔

علامہ اقبال کے قول کے مطابق اسلام ایسے "نیشنل ازم" کے خلاف ہے جو دین سے بے تعلق ہو اور جس کی بنیاد خالصتاً" نسل، رنگ، ذات پات، زبان یا علاقائی حدود پر رکھی گئی ہو۔ ان کی نظر میں، "نیشنل ازم" بحیثیت ایک سیاسی مسلک، ایسے دعوے کرتا ہے جو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں، لیکن "حب الوطنی" یعنی اپنے وطن، اعتقاد، تاریخی روایات یا کلچر کی خاطر جان تک قربان کر دینے کا جذبہ ان کے نزدیک مسلمان کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔

جب وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نہ تو "نیشنل ازم" ہے نہ "امپیریل ازم" بلکہ ایک قسم کی "دول مشترکہ" ہے تو دراصل وہ "بین الاقوامی اسلام" پیش کرتے ہیں۔ "بین الاقوامی اسلام" ان کے خیال میں نسلی امتیازات اور ہمیشہ تبدیل ہونے والی جغرافیائی حدود کو صرف اقوام کے پہچاننے یا زمان و مکان میں ان کا تعین کرنے کے لئے قبول کرتا ہے، اپنے ارکان کے معاشری دائرے کو محدود کرنے کے لئے قبول نہیں کرتا۔

زندگی کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھنا علامہ اقبال کا بنیادی موضوع رہا ہے اور انہوں نے اپنے اس بنیادی موضوع کے لئے ایک فلسفیانہ اساس بھی قائم کر لی تھی۔ اپنے پیش رووں کے برعکس علامہ اقبال کا انداز تحریر نہ تو مناظرانہ تھا اور نہ ہی عذر خواہانہ۔ انہوں نے بڑے جرات مندانہ انداز میں "خودی" کی تعمیر پر زور دے کر مسلمانوں کی معاشری اور سیاسی حیات نو کی بنیادیں رکھیں۔ ان کا خیال تھا کہ "خودی" کی تعمیر سے ہی مسلمان ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت، قوت اور آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے بار بار اس امر کی تاکید کی کہ مسلمانوں کو اپنی زندگی اسلامی رنگ میں رنگ لینی چاہئے اور اپنے آپ کو "مرد مومن" کے قالب میں ڈھال لینا چاہئے۔ ان کے نزدیک ملت اسلامیہ ایک ایسی بے مثل جماعت ہے جو بے مثل افراد سے مل کر بنی ہے۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو اپنے انداز میں پیش کر کے خاص طور پر مسلمانان ہند کے دلوں میں "خودی" کی شمع جلائی اور اس طرح انہیں اپنی "انا" کا جائزہ لینا سکھایا۔

علامہ اقبال نے "نیشنل ازم" کی جگہ اسلام کو ایک اجتماعی تعمیری قوت کی حیثیت سے پیش کر کے دراصل "اسلامی نیشنل ازم" کے تصور کو آگے بڑھایا جو بالآخر برصغیر ہند کے مسلمانوں کی ایک جداگانہ ریاست کے قیام پر منتج ہوا۔ ہندی مسلمانوں ہی کے اندر سے ایک نئی قوم عالم وجود میں آئی جس کے کلچر اور تمدن کا نقشہ اسلامی خطوط پر کھینچا گیا تھا۔ اس نئی قوم نے آخرکار اپنے حق خود اختیاری کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص وطن بھی حاصل کر لیا۔

جہاں تک 'آئین پسندی' کی اسلامی تعبیر کا تعلق ہے' علامہ اقبال ترکوں کے خلافت کو ختم کر دینے کے فیصلے کو بالکل صحیح سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسلامی ممالک میں جمہوری روح کی بیداری کو قبولیت کی نظر سے دیکھا کیونکہ ان کے خیال میں جمہوریت اسلام کی اصلی اور قدرتی مساوات کی طرف رجوع تھا۔ اسی طرح وہ اسلامی ممالک میں آئین ساز مجالس کے قیام پر بھی بے حد خوش تھے۔ ان کے نزدیک یہ پے درپے ترقیاں اس امر کی متقاضی تھیں کہ موجودہ تجربات کی روشنی میں مسلمانوں کے قدیم اداروں اور روایتوں پر نظرثانی کی جائے' چنانچہ انہوں نے اسلامی فقہ میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت پر خاص طور پر زور دیا اور جدید تجربات کی روشنی میں شریعت اسلام کی تعبیر کرنے کے لئے 'اجتہاد' کی تائید کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ 'اجتہاد' اس انداز سے کیا جائے کہ قوانین شریعت کی اصل روح ختم نہ ہونے پائے۔

علامہ اقبال نے 'سیکولر ازم' کے خلاف بہت کچھ لکھا۔ ان کی نظر میں 'سیکولر ازم' کا تصور مسیحیت میں روح اور مادے کی بنیادی دوئی کی وجہ سے پیدا ہوا' اور اسی تصور کے باعث مغربی ممالک کے باشندوں کی زندگی سے مذہب بالکل خارج ہو چکا ہے۔ مگر علامہ اقبال کو محض نظم و نسق کی سہولتوں کے پیش نظر اسلامی ریاست میں شعبہ دینیات کو دوسرے شعبوں سے الگ رکھنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کا نظریہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ 'دستور' جو ملت کے مفادات سے ہم آہنگ ہو' صحیح طور پر 'اسلامی' کہلانے کا مستحق ہے بشرطیکہ وہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔

علامہ اقبال نے 'اشتراکیت' (سوشل ازم) کی اسلامی تعبیر بھی پیش کی۔ وہ خاص طور پر اسلامی قانون وراثت کی اقتصادی تعبیرات سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اس بات پر یقین کامل رکھتے تھے کہ اسلام ایک ایسی نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جہاں آدمی کا معاشری مرتبہ اس کی نسل' رنگ' ذات پات یا اس کی دولت سے نہیں بلکہ اس کے اعمال سے متعین ہو گا۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق انسانی معاشرے کی بنیاد 'مساوات شکم' پر نہیں بلکہ 'مساوات روح' پر رکھی گئی ہے۔ اس امر کے باوجود کہ اسلام شخصی ملکیت کو دولت کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے' وہ ایسی سرمایہ داری کی اجازت نہیں دیتا جہاں پیداکاروں کے ہاتھ سرمایے سے محروم رہیں۔ علامہ اقبال کی نگاہ میں جتنی دیر مسلمانوں کے قائدین خلوص دل سے ان کے اقتصادی مسائل کا حل نہ پیش کریں گے' مسلمانوں کا مستقبل تاریک رہے گا۔ بلکہ عجب نہیں کہ اس مسئلے کے حل میں تاخیر آخرکار ہم سب کی تباہی و بربادی کا باعث بنے۔

علامہ اقبال نے اسلامی ہند کے واقعاتی تسلسل کو اپنی تحریر کے زور سے بدل کے رکھ دیا تھا گو وہ پاکستان کے عالم وجود میں آنے سے پیشتر وفات پا گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین ۱۹۵۶ء کی بنیاد، قطع نظر اس کی خامیوں کے، علامہ اقبال کے چند "لبرل" اصولوں پر رکھی گئی تھی۔

علامہ اقبال اور ان کے پیش رووں نے 'لبرل ازم' (یا وسیع النظری) کی جو روح مسلمانان ہند کے دلوں میں پھونکی تھی، ضروری ہے کہ پاکستان میں اسے زندہ رکھا جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ان لوگوں کو 'لبرل ازم' کے غلط استعمال سے روکا جائے جو اس تحریک کے ماخذ، اس کی تاریخ اور حدود سے واقف نہیں ہیں۔ اگر ایسا ماحول پیدا کیا جا سکے (یا ایسی سہولتیں فراہم کی جا سکیں) کہ ہمارے ملک میں علی گڑھ کے مصلحین کے نمونے پر (علی گڑھ کے مصلحین نے ملی اصلاح کے لئے جو اخلاقی، دینی، علمی اور ادبی خدمات انجام دیں، علامہ اقبال نہ صرف ان کے معترف تھے بلکہ ان سے بہت حد تک متاثر بھی ہوئے تھے) مصلح، مفکر، فقہ و دینیات کے ماہر، شاعر، مصنف اور صحافی پیدا ہوں تو ہماری ملی زندگی کی ہمہ جہتی اصلاح و ارتقاء کے ضامن ہوں گے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا اطلاق ہر دور اور ہر زمانے پر ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام اپنے گزشتہ تجربات کی رہنمائی اور اعانت کے ذریعے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھنے کا قائل ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی اصلیت کو فراموش کیے بغیر، بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہیں۔

اقبال بحیثیت شاعر انقلاب ☆

گزشتہ چند سالوں سے اس ملک کے حالات ایک ہی محور کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ گردش ایام میں سے ایک یوم اقبال بھی ہے جو ہر سال آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ حوادث کے گرداب میں کشتی پاکستان کبھی ابھرتی اور کبھی ڈوبتی دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر میں ہر چہرے پر اس سکون و اطمینان کے آثار ہیں جو بعد از مرگ طاری ہوتا ہے۔ لیکن باطن میں کس کس نوع کی بجلیاں مدفون ہیں، کوئی قیاس آرائی کر سکنا محال ہے۔

گو علامہ اقبال کے نام سے بیشتر پاکستانی مانوس ہیں، مگر جہاں تک ان کے مقصد و مفہوم کا تعلق ہے، اس کا تصور ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف طبقوں میں جدا جدا ہے۔ عوام کی نگاہ میں حضرت علامہ اس لئے مقبول ہیں کہ وہ شیدائے اسلام، عاشق رسولؐ اور مصور پاکستان تھے۔ اہل ثروت طبقہ اقبال کا نام محض اس لئے جانتا ہے کہ یہ نام پاکستان میں اکثر سننے میں آتا ہے۔ سیاست دان اس نام سے واقف ہیں کیونکہ ان کی ذاتی اغراض کے حصول کے لئے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے مغرب زدہ یا نام نہاد اشتراکی دانشوروں کی نظر میں اقبال ایک رجعت پسند شاعر تھے جس نے بیسویں صدی میں اسلام کا تذکرہ کر کے نہ صرف ہندوستان کے حصے بخرے کرائے بلکہ پاکستان کے ارتقاء کے سب رستے مسدود کر دیئے۔

حضرت علامہ پر بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے۔ ان کی شاعری، فلسفے، اخلاقیات اور الٰہیات پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ابھی تک انہیں بحیثیت نقیب و داعی انقلاب

☆ ۲۱۔ اپریل ۱۹۶۴ء کو لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

شاعر و مفکر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے فکر کے اس خصوصی پہلو کو نمایاں طور پر پاکستانیوں کے سامنے رکھا جائے۔

اقبال کس قسم کے انقلاب کے متمنی تھے؟ کیا اس ملک میں ایسا انقلاب برپا ہوا ہے یا اس کے موہوم آثار تک بھی پیدا ہوئے ہیں؟ اقبال کے پیغام کی اصل روح آئین پیغمبرؐ کے تحت ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانا ہے جو اخوت، مساوات اور عزت نفس کی بنیادی قدروں پر مبنی ہو تاکہ معاشی انصاف کا حصول ممکن ہو سکے۔ ان کے نزدیک آئین پیغمبرؐ غریب و نادار کا دست گیر ہے لیکن سرمایہ دار کے لئے موت کا پیغام ہے۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

اپنی مشہور نظم "خضر راہ" میں علامہ سوال کرتے ہیں۔

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

جواب میں خضر بندۂ مزدور کو پیغام دیتے ہیں۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات!
ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بیخبر، سمجھا اسے شاخ نبات!
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک!
نغمہ ٔ بیداری جمہور ہے سامان عیش!
قصہ ٔ خواب آور اسکندر و جم کب تلک
آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!
توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام
دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغبان چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخم گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک؟
کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو!

لیکن عصر حاضر کی مسموم اور زہرآلود فضا بھی علامہ کی بصیرت سے پوشیدہ نہ تھی۔ فرماتے ہیں۔

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام
آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تب
انقلاب!
انقلاب !! اے انقلاب!!

انہیں احساس تھا کہ سرمایہ دار کیونکر مزدور کا خون چوستا ہے اور مزارع کی کھیتی کس طرح زمیندار کے ہاتھوں برباد ہوتی ہے۔

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب !! اے انقلاب!!

میر و سلطاں بساط اقتدار پر ایسی شاطرانہ اور ساحرانہ چالیں چل رہے ہیں اور جو ایسی مسلک ہیں کہ محکوموں کے تن سے جان کھنچی جا رہی ہے لیکن محکوم محو خواب ہیں۔

میر و سلطاں نرد باز و کعبتین شاں دغل
جان محکوماں ز تن بروند و محکوماں بخواب
انقلاب!
انقلاب !! اے انقلاب!!

اس مقصد کے حصول کی خاطر علم کو کس طرح سازش سازیوں کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ شیطنت کیونکر عزت کے مراتب حاصل کرتی ہے اور نیکی کیونکر ذلیل و خوار ہے۔

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزان و یزداں دیر یاب
انقلاب!
انقلاب !! اے انقلاب!!

بہرحال، ان سب مشکلات کے باوجود علامہ کو یقین تھا کہ ایک دن کمزوروں اور ناداروں میں بھی شیروں ایسی قوت پیدا ہوگی اور پانی کے بلبلوں سے بھی شعلے لپکیں گے۔

با ضعیفاں گاہ نیروے پلنگاں می دہند
شعلہ ء شاید بروں آید ز فانوس حباب!
انقلاب!
انقلاب !! اے انقلاب!!

کارل مارکس نے مذہب سے اس لئے انحراف کیا کہ اس کے قول کے مطابق مذہب سرمایہ دار کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ ہے جس کے ذریعے وہ بیکس و نادار کو اپنی حالت پر مطمئن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ گویا امیر، غریب سے کہتا ہے کہ تم اپنے حال پر قانع رہو کیونکہ خداوند تعالیٰ نے تمہیں ایسا ہی بنایا ہے۔ مگر یہ سبق ہمیں قرآن میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا بلکہ بار بار ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانے کی تنبیہہ کی گئی ہے جس میں کوئی بھی بھوکا نہ رہے، کوئی بھی ننگا نہ رہے، ہر ایک پر علم کے دروازے کھول دیئے جائیں اور لوگ شفاخانوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جانیں نہ دیں۔ اسی بناء پر علامہ کی نگاہ میں اسلام ایک معاشی نظام بھی ہے۔ یہی معاشی نظام شرع پیغمبرؐ یا آئین پیغمبرؐ ہے جس کے احیاء سے ابلیس خائف ہے۔ علامہ کی مشہور و معروف نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اپنے ذہن میں لایئے۔

ابلیس کہتا ہے۔

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں
جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں؟

پہلا مشیر کہتا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام
یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

دوسرا مشیر پہلے مشیر سے پوچھتا ہے۔

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

پہلا مشیر جواب دیتا ہے۔

ہوں، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر!
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کاروبارِ شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود 'میر و سلطاں' پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر!

تیسرا مشیر کہتا ہے۔

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
کیا بتاؤں کیا ہے کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روز حساب!
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اے ترے سوز نفس سے کار عالم استوار
تو نے جب چاہا، کیا ہر پردگی کو آشکار
وہ یہودی فتنہ گر، وہ روح مزدک کا بروز
ہر قبا ہونے کو ہے اس کے جنوں سے تار تار
فتنہ ٔ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پہ مدار

ابلیس اپنے مشیروں کو جواب دیتا ہے۔

ہے مرے دست تصرف میں جہان رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمان تو بتو
دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

○

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبرؐ کہیں
الحذر، آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر!
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ 'آئیں' تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

○

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!
تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تابساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

ابلیس کو خوف ہے کہ مبادا آئین پیغمبرؐ ایک روز نافذ ہو جائے اور ملت منتشر اخوت، مساوات اور عزت نفس پر مبنی اس معاشرے کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جائے جو اسے وحدت کے ساتھ ساتھ معاشی انصاف بھی دے سکے۔ پس اس کی روک تھام کے لئے ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں کے نام کیا فرمان جاری کرتا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو!
اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو!
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

علامہ کی نگاہ میں لینن کا مظہر دراصل بے ثمر مذہب، ظالم سرمایہ دارانہ نظام اور شہنشاہی استبداد کے ردعمل کے طور پر وقوع میں آیا۔ جس روحانی تباہی کا لینن مرتکب ہوا، اس کا مقصد غریب کی نجات تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بقول اقبال، لینن خدا کے حضور میں بھی اپنی گفتار کے اسلوب پر قابو نہ رکھ سکا اور جرأت سے گویا ہوا۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

خداوند تعالیٰ نے بھی آخرکار غریب کی فریاد سن لی اور فرشتوں کو فرمان جاری کیا۔

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ

جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ ء گندم کو جلا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کے سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو!

یہ تو تھے کلام اقبال سے چند اقتباسات جن سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں سے اسلام کس قسم کے معاشی نظام کا متقاضی ہے۔ لیکن اب اس سوال پر بھی غور کر لیجئے کہ جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے، کیا ہمارے سیاسی پیشواؤں نے آئین پیغمبرؐ کے نفاذ کے سلسلے میں کوئی مثبت یا عملی قدم بھی اٹھائے ہیں؟ ہم سیاسی پیشواؤں سے آخر کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟ علامہ ہی کے الفاظ میں سنئے۔

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند
خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!

بہرحال، پچھلے چند سالوں سے اس ملک میں مختلف قسم کی فروعی بحثیں بڑے جوش و خروش سے جاری ہیں۔ ان بحثوں میں ہمارے سیاسی پیشواؤں نے اسلام کو بھی بلادریغ گھسیٹا ہے۔ مثلاً براہ راست انتخاب اور بالواسطہ انتخاب کی بحث کے سلسلے میں ارشاد ہوا ہے کہ بالواسطہ انتخاب اسلام کے عین مطابق ہیں، یا یہ کہ اسلام کے اوائلی دور میں خلفائے راشدین کو مختلف طریقوں سے منتخب کیا گیا، کسی ایک واضح طریق کی تقلید نہیں کی گئی، یا یہ کہ بنیادی حقوق کا تحفظ ایک جدید اختراع ہے، اس کا اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ ایک سیاسی پیشوا نے تو یہ دریدہ دہنی بھی کی ہے کہ خلفائے راشدین ڈکٹیٹر تھے۔ اگر آپ تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس کے ہر دور میں پیشہ ور خوشامدیوں اور بے ضمیر موقع پرستوں نے وقت کی مصلحت کے تحت اور ذاتی اغراض کے حصول کی

خاطر نہ یہ کہ اسلام کی حقیقی جمہوری روح کو مسخ کرنے کی کوششیں کیں بلکہ وہ اپنی غلط کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے، اور یوں جسد ملت سے جمہوری روح عنقا ہو گئی۔ مثلاً جب امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنانے کا ارادہ کیا تو چند ابن الوقت برجستہ بول اٹھے کہ یہ تقرر تو اسلامی روایات کے عین مطابق ہے۔ کیا حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر نہ کیا تھا؟

ان خائبازوں کی نفسیات دراصل غلامی کی نفسیات ہے، اور بقول علامہ اقبال۔

شاعر بھی ہیں پیدا، علما بھی، حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ!
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرح معانی میں یگانہ!
"بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ!"
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ!

چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ خلفائے راشدین ڈکٹیٹر تھے۔ لیکن وہ کس قسم کے ڈکٹیٹر تھے؟ کیا وہ اپنی ذاتی اغراض کے حصول کے لئے ڈکٹیٹر تھے یا آئین پیغمبرؐ کے نفاذ کے لئے ڈکٹیٹر تھے؟ جو یتیموں اور بیواؤں کے لئے اپنی پیٹھ پر اناج کی بوریاں لاد کر ان کے گھروں تک پہنچاتے تھے، جو مرتے وقت یہ وصیت کرتے تھے کہ مجھ کو میرے پرانے کپڑوں میں ہی دفنا دینا کیونکہ نئے کپڑوں کی زندہ لوگوں کو ضرورت ہو گی، جن کی قبا اگر دوسرے مسلمانوں سے قدرے لمبی ہو جائے تو بھرے مجمع میں ان کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ مزید کپڑا کہاں سے حاصل کیا ہے، جن کی قباؤں پر چمڑے کے پیوند لگے ہوتے تھے، جو ذاتی امور پر بات کرتے وقت چراغ گل کر دیا کرتے تھے کہ اس میں مسلمانوں کے بیت المال کا تیل جل رہا ہے، جو دشمن کو پچھاڑ کر قتل کرنے سے اس لئے رک جاتے تھے کہ دشمن نے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا تھا اور انھیں یہ خیال آ گیا تھا کہ مبادا ایسی حالت میں اس کا قتل کرنا اللہ کی خوشنودی کے بجائے محض اپنی ذاتی توہین کا انتقام بن جائے، اور جن کے دسترخوانوں پر سوکھی روٹی کے سوا کوئی سالن شاید و باید ہی ہوتا تھا۔ غالباً ڈکٹیٹر انہی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن ان بے ضمیر موقع پرست سیاسی پیشواؤں کو کیونکر سمجھایا جائے کہ خلفائے راشدین کا مقام کیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

انہی پیشہ ور خوشامدیوں کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔

میں کار جہاں سے نہیں آگاہ، ولیکن
ارباب نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز
کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز!
معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت
کہہ دے کوئی الو کو اگر "رات کا شہباز!"

ان 'رات کے شہبازوں' سے ہماری دست بستہ التماس یہی ہے کہ شوق سے فروعی بحثوں میں اپنا وقت ضائع کیجئے، لیکن خدا کے لئے مصلحت وقت کی خاطر ان ابلیسی تاویلات سے باز رہئے۔ ہماری تاریخ شاہد ہے، ہم نے ماضی میں اس کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ ہم اپنی حیثیت بخوبی جانتے ہیں حضور! کہ۔

دور حاضر ہے حقیقت میں وہی عہد قدیم
اہل سجادہ ہیں یا اہل سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام!

○

اقبال اور ندرت فکر☆

علامہ اقبالؒ کے کلام میں ندرت فکر و عمل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ندرت فکر و عمل ہی مسلمانان عالم کے مرقد کے شبستان میں روح پھونک کر ایک نئے اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ نے ارشاد کیا۔

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب!
ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب!
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارا، لعل ناب!

علامہ، تاریخ اسلام کے ایسے دور میں پیدا ہوئے جب مسلمانان برصغیر ہند کے ہاتھ سے عزت و شوکت چھن چکی تھی اور آپس میں نفاق کے باعث نہ صرف یہ کہ ان کا ملی شیرازہ منتشر تھا بلکہ وہ انگریز اور ہندو اکثریت کے محکوم ہو چکے تھے۔ علامہ جانتے تھے کہ کلمہ گو غلامی و محکومی کی کیفیت میں مسلمان نہیں رہ سکتا۔ مسلمان کی حیات کے لئے آزادی، قوت اور شوکت لازمی شرائط ہیں۔

عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام
"وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام"!

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء کو مرکزیہ مجلس اقبال لاہور میں پڑھا گیا جسے بعد میں علامہ اقبال انشورنس فاؤنڈیشن لاہور نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔

قوت، مسلمان کے دینی نظریات اور اس کی آزادی کے تحفظ کے لئے اشد ضروری ہے کیونکہ مسلمان کے نزدیک اگر قوت۔

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک!

اسی لئے علامہ نے مسلمان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

سوچا بھی ہے اے مرد مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار
اس بیت کا یہ مصرع اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار!

علامہ کے زمانے میں مغرب سے درآمد شدہ نظریات مثلاً نیشنلزم، پٹریاٹزم، سیکولرزم، کانسٹی ٹیوشنلزم اور سوشلزم نے مسلمانوں کے اذہان پراگندہ کر رکھے تھے۔ مسلمانوں میں نظریاتی انتشار کا یہ عالم تھا کہ بقول علامہ۔

یہ کیفیت ہے مری جان ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

اس تاریک رات میں علامہ کی بصیرت نے ان کی رہبری کی اور انہیں احساس دلایا کہ۔

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

اس احساس کے ساتھ ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ غیرملکی نظریات کے ذریعے مسلمانان برصغیر ہند کی نجات ممکن نہیں۔

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیف غم نہیں، مجھ کو تو خانہ ساز دے

لیکن خانہ ساز کا سراغ کھوئے ہوؤں کی جستجو ہی سے مل سکتا تھا۔

جلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں، کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
باد صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو
خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

اس جستجو نے علامہ کو حقیقت سے روشناس کرا دیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل ان کے اپنے خون جگر میں پنہاں ہے۔ اور ان کی حیات کا راز کوشش پیہم میں مضمر ہے۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

یہی ذوق و شوق کی وہ منزل تھی جس پر علامہ کو حکم اذاں ہوا۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

علامہ کے سامنے ایک طرف تو صنم کدۂ مغرب کے لات و منات یعنی نیشنلزم، پٹریاٹزم، سیکولرزم، کانسٹی ٹیوشنلزم اور سوشلزم تھے، اور دوسری طرف پیغام محمدؐ تھا۔ لیکن چونکہ ان کا دل زندہ و بیدار تھا، انہیں اور ہی چشم نگراں عطا کی گئی۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

علامہ جانتے تھے کہ برصغیر ہند کے مسلمان مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں اور جغرافیائی طور پر وہ برصغیر ہند کے مختلف خطوں میں منتشر ہیں۔ ایسی کیفیت میں نیشنلزم کا مغربی تصور یعنی نسل، رنگ، زبان اور جغرافیائی وحدت کی بنیادوں پر انسانوں کی گروہ بندی، ان میں اتحاد کے بجائے انتشار کا باعث ہی نہیں بلکہ انہیں ہندو اکثریت کا محکوم بھی بناتا ہے۔ اس کے برعکس پیغام محمدؐ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے اس بنا پر منسلک کرتا ہے کہ ان سب کی روحانی تمنا مشترک ہے یعنی ان کا ایمان اسلام پر ہے۔

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو
وصال مصطفویؐ ، افتراق بولہبی!

اس اصول کی ضیا سے علامہ نے صنم کدۂ مغرب کے بت "نیشنلزم" کو پاش پاش کر دیا اور مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

اسی طرح علامہ نے صنم کدۂ مغرب کے بت "پیٹریاٹزم" کا قلع قمع کیا۔ "پیٹریاٹزم" کے مغربی تصور سے مراد ہے اپنے آبائی وطن کی بطور "دھرتی ماتا" یا "مادر وطن" پرستش کرنا اور اس کی خاک، درختوں، صحراؤں، پہاڑوں یا دریاؤں کی خاطر جان لٹا دینا۔ علامہ نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ سنت نبویؐ میں "وطن" کا تصور اپنے دینی نظریات کے تحفظ اور بقا کی خاطر دراصل "ترک وطن" ہے۔ آپ نے مسلمانوں پر یہ تاریخی حقیقت از سرنو واضح کی کہ اسلامی عہد سرور کائناتؐ کے یوم ولادت سے شروع ہوتا ہے نہ اس روز سے جب آنحضورؐ پر نبوت کا نزول ہوا۔ بلکہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب رسول اللہؐ نے مسلم مہاجرین کے ساتھ اپنے آبائی وطن مکہ کو خیرباد کہہ کر مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اس نئی سرزمین میں قرآنی اصولوں کے مطابق اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ظاہر ہے، مسلمانوں کے نزدیک "وطن" سے مراد "آبائی گھر" نہیں بلکہ کوئی بھی خطۂ ارض ہے جہاں وہ قرآنی اصولوں کے مطابق آزاد، باقوت اور باشوکت اسلامی معاشرہ قائم کر سکیں۔ پس مسلمانوں کا وطن "دارالاسلام" ہے جو قید مقامی سے آزاد ہے۔ اور وہ اس "دارالاسلام" کی خاک، درختوں، صحراؤں، پہاڑوں یا دریاؤں کی خاطر نہیں بلکہ ان دینی اور تمدنی نظریات کے تحفظ کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے ہروقت تیار ہیں جن کی بنیادوں پر "دارالاسلام" قائم ہے۔ "وطن" کے مغربی تصور پر علامہ نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ــــ رہ بحر میں آزاد وطن، صورت ماہی
ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہیؐ ــــ دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

علامہ نے صنم کدۂ مغرب کے بت سیکولرزم' اور کانسٹی ٹیوشنلزم' کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ ان کے نزدیک یہ بت انسانی محبت اور رواداری کے بجائے انسانی منافقت کے تراشے تھے۔ "سیکولرزم" کے مغربی تصور سے مراد ایک ایسی ریاست ہے جس میں ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہو اور جو بلاتمیز مذہب و نسل اپنے تمام شہریوں کو دنیاوی یا مادی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہے۔ لیکن دنیا میں کوئی بھی ریاست جو "سیکولر" ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، وہاں درحقیقت یہ اصول عملی طور پر کارفرما نہیں بلکہ مذہب، نسل یا رنگ کی تمیز کچھ اس انداز سے روا رکھی جاتی ہے گویا ان ممالک میں فکر کا عمل کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اور صرف ہوس ہی ہے جسے برتری حاصل ہے۔ بسا اوقات یہ ہوس نفرت و حقارت کے ایسے حیوانی مظاہروں کا سبب بنتی ہے جو خدا سے خوف کھانے والے کسی انسان کے ذہن میں بھی نہیں آسکتے۔ پس اسی بنا پر علامہ نے ارشاد کیا۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی طرح "کانسٹی ٹیوشنلزم" کے مغربی تصور سے مراد ایک ایسا جمہوری نظام حکومت ہے جس میں حاکمیت بظاہر تو عوام کی ہوتی ہے، لیکن حقیقی اختیار ان چند گنے چنے افراد کے جتھے کے ہاتھ میں محفوظ رہتا ہے جن کے قبضے میں ملک کے وسائل دولت ہوتے ہیں۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

یہ دولت مند افراد عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کی حیثیت سے آئین سازی کے معاملات میں ایک دیو بے زنجیر کے مانند آزاد ہوتے ہیں۔ ایسے آزاد کہ دہقاں کی کشت لوٹتے ہیں۔ کمزور کا گھر غارت کرتے ہیں اور بے نوا کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ جمہوریت کے

پردے میں غارت گری اور آدم کشی روا رکھنے کا نام مغربی لغت میں کانسٹی ٹیوشنلزم ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے' اثر خواب آوری
گرمی گفتار اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

علامہ نے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کی کہ چونکہ اسلام کا نظام حکومت احکام الٰہی کا پابند ہے' اس لئے قرآن حکیم کے عالمگیر اصولوں کی بنیاد پر ایسی ریاست وجود میں لاتا ہے جس میں ہر شہری کو مذہبی آزادی کا حق حاصل ہو اور جو بلاتمیز مذہب و نسل اپنے تمام شہریوں کی دنیاوی اور دینی' مادی اور روحانی فلاح و بہبود کے لئے یکساں کوشاں رہے۔

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم!

علامہ کی نگاہ میں اسلام کسی قسم کی روحانی "پیشوائیت" (تھیوکریسی) کے نفاذ کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اس کا ہدف درحقیقت مخصوص اقدار کا حامل ایک فعال معاشرہ وجود میں لاتا ہے۔ اسلام دین و دنیا یا مذہب و سیاست میں وہ امتیاز قبول نہیں کرتا جو نصرانیت کرتی ہے۔ اسلام کے نزدیک دین اور دنیا ایک دوسرے سے محض وابستہ ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان پر دنیا میں رہ کر دینی اقدار کا حصول لازم ہے۔ پس اسلام ایک ایسا جمہوری نظام حکومت ہے جس میں اللہ تعالیٰ بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

اور اس نے عوام کو اختیارات حکمرانی اپنی متعین کردہ حدود کے اندر نیابتاً" عطا کر رکھے ہیں۔ یہ اختیارات حکمرانی عوام کے ہاتھ میں ایک مقدس امانت ہے' اس لئے عوام کا دینی فریضہ ہے کہ ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لیں۔ ہر لحظہ بیدار اور ہوشیار رہیں۔ اپنے آپ میں قوت محاسبہ پیدا کریں اور اختیارات حکمرانی استعمال میں لانے کی خاطر دولت مند یا قلاش کے بجائے دیانت دار اور بااعتماد نمائندے منتخب کریں۔ مزید برآں نمائندوں کا انتخاب محض

گنتی یا جماعتی اکثریت حاصل کرنے کی خاطر نہ ہو بلکہ انہیں پوری طرح تولنے اور پرکھنے پر ہو۔ پس اسلامی نظام حکومت میں عوام اور ان کی نمائندہ مجلس آئین ساز ایک دیو بے زنجیر کے مانند آزاد نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مقرر کردہ حدود کی پابند ہے' اس لئے اس پر لازم ہے کہ عوام میں اخوت' مساوات' اتحاد' حریت اور عدل کی اقدار کے نفاذ اور فروغ کے لئے کوشاں رہے۔ علامہ کے نزدیک مسلم ممالک میں مجالس آئین ساز کا قیام اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع تھا اور وہ ان مجالس کے ذریعے بالآخر حقیقی اسلامی معاشرے کے وجود میں آنے کے سلسلے میں بڑی توقعات رکھتے تھے۔

علامہ نے صنم کدۂ مغرب کے بت "سوشلزم" پر بھی سخت ضرب لگائی۔ ان کی نگاہ میں گو "سوشلزم" مساوات کی بنیاد پر انسانی معاشرہ قائم کرنے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ اللہ اور اس کے احکام کی نفی کرتا ہے اور انسان کے انفرادی حق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا۔ نتیجے کے طور پر اس نظام میں ملک کے تمام وسائل دولت ریاست کے قبضے میں آ جاتے ہیں اور ریاست ایک دیو بے زنجیر کی طرح ہر قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو زیادہ قوی اور مضبوط بنانے کی خاطر اپنے کارندوں یا حاکم و آمر جماعت کے اراکین کے ذریعے شہریوں کو ان کی انسانی سطح سے گرا کر حیوانوں کے غول میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ان کی زبان پر تعزیریں لگواتی ہے اور ان سے محنت و مشقت کرواتی ہے۔ ان مسلسل مشقت کرنے والے بے زبان انسانوں کے گروہوں میں مساوات ضرور ہوتی ہے لیکن یہ مساوات شکم بعینہ اس نوع کی ہے جو ان حیوانوں میں پائی جاتی ہے جو غول یا ریوڑ کی صورت میں کسی وسیع زنداں میں زندہ رکھے جاتے ہوں۔

اس کے برعکس اسلام کے نزدیک ایسا ہر نظام باطل ہے جو اللہ اور اس کے احکام کی نفی کرتا ہے اور انسان کے انفرادی حق آزادی کو تسلیم نہیں کرتا۔ جہاں تک معاشری اخوت و مساوات کا تعلق ہے' یہ اسلام کے لئے کوئی نیا سبق نہیں بلکہ آج سے چودہ سو برس پیشتر اسلامی معاشرے کی بنیاد انہی اصولوں پر استوار کی گئی تھی۔ علامہ کے نزدیک اسلام کا مقصود اخوت اور مساوات کی بنیادوں پر ایک ایسا بے طبقاتی معاشرہ وجود میں لاتا ہے جس میں ہر فرد کے بنیادی حق ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے سرمائے کو اس طرح جمع ہو سکنے کی اجازت نہ دی جائے کہ حقیقی پیداکاروں کو مغلوب کرے۔ علامہ کی رائے میں قرآن مجید سرمایہ دار کے لئے موت کا پیغام ہے' اسی لئے اسلامی معاشرے میں مال و دولت اگر ہر آلودگی سے پاک و صاف ہو تو تبھی باقی رہ سکتی ہے۔ علامہ کو یقین تھا کہ ہر فرد کی خاطر زندگی کی بنیادی

ضروریات یعنی روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، طبی امداد اور ملازمت کی فراہمی ریاست کے لئے عین ممکن ہے بشرطیکہ وہ اسلام کا معاشی نظام نافذ کرے۔ اسی بنا پر علامہ اپنی ساری عمر اسلام کی انقلابی روح مسلمانوں کے روبرو پیش کرتے رہے اور بالآخر اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں شیطان کے منہ سے کہلوایا۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ ء فردا نہیں، اسلام ہے

علامہ کی ندرت فکر کسی راہب کی سکوں پرستی کا نتیجہ نہ تھی کیونکہ بقول ان کے۔

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

یہ ایک فقیر کے سفینہ ء طوفانی کا اعجاز تھا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے دل میں احساس پیدا ہو کہ ان کی قومیت اور وطنیت کی اساس اسلام ہے۔ اسلامی جمہوریت کا نفاذ ان کی آزادی و بقا کا ضامن ہے اور ان کے تمام اقتصادی مسائل کا حل صرف اسلام کے معاشی نظام کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہی تھی وہ وحدت افکار جس کی بدولت مسلمان ازسرنو زندہ ہوگے۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!

ملی وحدت کے احساس نے مسلمانوں میں ذوق انقلاب پیدا کیا۔ انہوں نے متحد ہو کر آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی اور بالآخر ان خطوں سے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد تھی، انہوں نے اپنے لئے ایک آزاد وطن تراش لیا۔ پاکستان کا قیام مسلمانوں کی ندرت فکر و عمل اور ان کے ملی شباب کا ایک معجزہ تھا۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے دن قائداعظم نے مسلم مہاجرین کے ساتھ اپنے دینی اور تمدنی نظریات کے تحفظ اور بقا کی خاطر بھارت کو خیرباد کہہ کر پاکستان کی طرف ہجرت کی اور اس نئی سرزمین میں آزاد اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھ کر نبوت کی صداقت پر گواہی دی۔ لیکن اپنے تخیل کو حقیقت میں منتقل ہوتے دیکھ سکنا علامہ کے نصیب میں نہ تھا۔ وہ یہ روز سعید دیکھنے سے محروم رہے کیونکہ خود ہی کہہ گئے تھے۔

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثال زمانہ کم پیوند!
جو کوکنار کے خوگر تھے' ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پرشکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقام شوق و سرور و نظر سے محرومی!

قیام پاکستان کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ جس طرح مسلمانوں کی جدت گفتار و کردار بالآخر ان کی سیاسی آزادی پر منتج ہوئی' اسی طرح اس ندرت فکر و عمل کی تحریک کو ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری کیا جاتا تاکہ مسلمان سیاسی آزادی کے ساتھ بھوک' گرانی اور افلاس کی گرفت سے بھی آزاد ہو سکتے۔ مگر پاکستان میں جو حکومتیں یا افراد وقتاً" فوقتاً" برسراقتدار آتے رہے' انہوں نے ندرت فکر و عمل کے جن اصولوں پر اس ملک میں اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی تھی' انہیں قطعاً نظر انداز کیا۔ اگرچہ یہ دعویٰ بارہا کیا گیا کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے' لیکن نظریات کو عملی جامہ پہنانا تو ایک طرف رہا' نظریہ ء پاکستان سے نئی نسل کو روشناس کرانے تک کی زحمت گوارا نہ کی گئی۔ ایوبی استبداد کی دس سالہ طویل رات کے دوران پاکستان کی عصمت فکر کو اس بے دردی سے لوٹا گیا کہ نظریاتی طور پر مسلمان ۱۹۴۷ء سے بھی پچاس برس پیچھے دھکیل دیئے گئے۔ جب ایوب خان اور اس کے ہمنواؤں کو اقتدار سے محروم کیا گیا' تو پاکستان اپنی تاریخ کے ایک نہایت ہی خطرناک موڑ پر کھڑا تھا۔ ہیجان' بے یقینی' بداعتمادی اور افتراق کی نفسیاتی کیفیات نے مسلمانوں کو پھر آ گھیرا اور عصر رفتہ کے ٹوٹے ہوئے لات و منات بھیس بدل کر پھر لوٹ آئے۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم' جواں ہیں لات و منات

سیاسی جماعتوں کی تعداد میں اضافے نے اصولوں پر دیانت دارانہ اختلاف کے بجائے شخصیتوں میں کشمکش اقتدار کی کیفیت پیدا کر دی اور اہل سیاست اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہو کر رہ گئے۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار

پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدت گفتار ہے نے جدت کردار
ہیں اہل سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاس تخیل میں گرفتار!

قافلہ سالاروں کی آپس میں کشمکش سے حق و باطل یوں شیر و شکر ہوتے نظر آئے گویا لاعلمی اور آگاہی کی تمیز مٹ گئی ہے۔

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللہی!
ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک
ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی!

اس نظریاتی اضطراب کی کیفیت میں مغرب سے درآمد کردہ جن پرانے نظریات کو نئے لبادے پہنا کر پیش کیا جا رہا ہے' وہ یہ ہیں کہ پاکستان میں چونکہ اسلام کے موضوع پر سب متفق ہیں' اس لئے یہاں اسلام کا نام نہ لیا جائے۔ پاکستان دراصل "ہیوز" اور "ہیوناٹس" یعنی "دولتیوں" اور "بے دولتیوں" کی کشمکش کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ قرآن مجید اگرچہ ہمارے مذہب کی اساس ہے مگر اس میں دستوری یا اقتصادی مسائل کا حل موجود نہیں' لہٰذا اسے صرف مسجد تک محدود رکھنا چاہئے۔ گویا۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ پاکستان ایک کثیر النسلی' کثیر اللسانی اور کثیر القومی ملک ہے لہٰذا اس کی معیشت' دفاع' رسد و رسائل' خارجہ پالیسی اور خارجہ تجارت واحد نہیں بلکہ علاقائی طور پر متعدد ہیں۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا

پھر کہا جاتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے بعض عرب ممالک میں نیشنلزم اور سوشلزم نافذ ہیں۔ لیکن وہاں تو کوئی معترض نہیں۔ اس لئے ان نظریات کے عملی نفاذ کے سلسلے میں پاکستان میں بھی اعتراض نہیں کیا جانا چاہئے۔ غرضیکہ آزادی افکار کی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' یہاں جو کسی کے جی میں آتا ہے بلاروک ٹوک کہے چلا جاتا ہے۔ کوئی "جلاؤ گھیراؤ"

کے نعروں کے ساتھ اللہ کی رضا پوری کرنے کی خاطر مومنوں یا مجاہدوں کی تنظیم کے بجائے "گوریلوں" کو منظم کرنے کی دھمکی دیتا ہے' اور کوئی خانقاہی رقص کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اگر روٹی کا مسئلہ حل نہ کیا گیا تو انتخابات ہوں گے نہ دستور بننے دیا جائے گا۔ مختصراً:

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسانوں کو حیوان بنانے کا طریقہ!

اس نظریاتی انتشار کے عالم میں آج ملت خوب و ناخوب کے امتیاز کے لئے ترسنے لگی ہے' لیکن ؎

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات!

پاکستان میں مسلمان کی حیات کیا ہے' اس کی تصویر "جواب شکوہ" میں ملاحظہ ہو ؎

ہاتھ بے زور ہیں' الحاد سے دل خوگر ہیں ۔۔۔ امتی باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں
بت شکن اٹھ گئے' باقی جو رہے بت گر ہیں ۔۔۔ تھا براہیم پدر' اور پسر آزر ہیں

بادہ آشام نئے' بادہ نیا' خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا' بت بھی نئے' تم بھی نئے

کیا کہا' بہر مسلماں ہے فقط وعدۂ حور ۔۔۔ شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور!
عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور ۔۔۔ مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے' موسیٰ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی' نقصان بھی ایک ۔۔۔ ایک ہی سب کا نبی' دین بھی' ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی' اللہ بھی' قرآن بھی ایک ۔۔۔ کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!

کون ہے تارک آئین رسول مختار؟ ۔۔۔ مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟ ۔۔۔ ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں!

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا، تو غریب
زحمت روزہ جو کرتے ہیں گوارا، تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا، تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا، تو غریب
امرا نشہ ء دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غربا کے دم سے

ہر مسلماں رگ باطل کے لئے نشتر تھا
اس کے آئینہ ء ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے، قوت بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو!

ہر کوئی مست مے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم!
تخت فغفور بھی ان کا تھا، سریر کے بھی
یونہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ء ہستی پہ صداقت ان کی!

عہد نو برق ہے، آتش زن ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے
ملت ختم رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری
وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوی اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے، تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں!

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے حصول کی خاطر جدوجہد کے وقت ہمارا نعرہ تھا: لا الٰہ الا اللہ۔ لیکن آج پاکستان میں طاغوتی طاقتوں کی سرکوبی اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے ہمارا نعرہ ہے: محمد الرسول اللہ!

پاکستان کے بعض پڑھے لکھے ان پڑھ جب کہتے ہیں کہ یہاں اسلام کا نام لینے کی ضرورت نہیں تو وہ اس تاریخی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ مسلمان جب کبھی بھی افتراق یا افتاد کے دور سے گزرے تو ان کی مدد کے لئے اسلام ہی آیا۔ اسلام مسلمانوں کی صرف مذہبی ضرورت ہی نہیں، بلکہ سیاسی ضرورت بھی ہے کیونکہ اسلام پاکستان کی اساس ہے۔ اگر پاکستان میں اسلام کا نام فراموش کر دیا جائے تو پاکستان کے قیام کے جواز میں کوئی دلیل نہ رہے گی۔

یہ کہنا بھی تاریخ کو مسخ کرنا ہے کہ پاکستان 'ہیوز' اور 'ہیو ناٹس' یا 'دولتیوں' اور 'بے دولتوں' کی کشمکش کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو ہندو اور سکھ 'بے دولتے' بھی پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے مسلمان 'بے دولتوں' کا ساتھ دیتے۔ لیکن ایسا ہرگز نہ ہوا۔ پاکستان، اسلام اور ہندومت کے تصادم کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر اسلام پاکستان کی اساس ہے۔ اور چونکہ اسلام مسلمانوں کے نزدیک ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اس لئے وہ اپنے تمام مسائل کا حل قرآن مجید میں پاتے ہیں۔

مسلمانان برصغیر ہند نے آزادی کے لئے اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران کبھی بھی مشرق وسطی کے ممالک کے سیاسی عمل کو مشعل راہ نہیں بنایا۔ جب برصغیر ہند کے مسلمان اپنی مختلف قومیتوں کے باوجود اسلام کی بنیاد پر، ملی طور پر متحد ہو رہے تھے تو مشرق وسطی میں 'نیشنلزم' کا دور دورہ تھا اور مسلمانان مشرق وسطی ترک، ایرانی، عرب اور افغان قومیتوں میں منقسم ہو رہے تھے۔ پس جب مشرق وسطی کے مسلمان نیشنلزم کے زیر اثر مختلف قومیتوں میں منتشر ہو رہے تھے تو ہم نے پاکستان

قائم کر کے انہیں اسلامی اتحاد کی عملی مثال پیش کی۔ آج اگر ان میں سے چند عرب ممالک 'سوشلزم' سے متاثر ہو کر عربوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کئے ہوئے ہیں' تب بھی پاکستان انہیں اسلام کی بنیادوں پر متحد ہونے کی تلقین کر سکتا ہے۔

یہ استدلال بھی نیک نیتی پر مبنی نہیں کہ روئی کا مسئلہ انتخابات یا دستور سازی سے پہلے حل کیا جائے۔ روئی کے مسئلے کے حل میں دلچسپی لینا بظاہر تو ایک نہایت مستحسن جذبہ ہے جو ہر محب وطن پاکستانی کی ہمدردی کا باعث بنتا ہے' لیکن اس مسئلے کو اس انداز میں اٹھانے والے درحقیقت روئی کے مسئلے کا حل نہیں چاہتے۔ انہیں احساس ہے کہ پاکستان ابھی 'ملحدانہ انقلاب' کے لئے تیار نہیں اس لئے انہیں خدشہ ہے کہ اگر انتخابات ہو گئے اور دستور بن گیا تو دستور کے تحت جمہور کی نمائندہ جو حکومتیں بھی پاکستان میں برسراقتدار آئیں گی' وہ کہیں روئی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مثبت قدم نہ اٹھالیں۔ پس اس مرحلے پر ان کی سیاسی حکمت عملی کا تقاضا یہی ہے کہ پاکستان میں انتخابات ہونے دیئے جائیں نہ دستور بننے دیا جائے' بلکہ مارشل لاء کی حکومت قائم رہے' گرانی بڑھتی چلی جائے' اقتصادی مسائل حل نہ ہونے دیئے جائیں' ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا جائے' عوام پر بے یقینی' بے اطمینانی' بداعتمادی اور افتراق کی ہیجانی کیفیات طاری رکھی جائیں۔ اور یوں ممکن ہے مستقبل قریب میں ایسی صورت حالات پیدا ہو جائے کہ پاکستان میں 'ملحدانہ انقلاب' لایا جا سکے۔ لیکن ان اہل حرم کے سومنات کو شاید یہ علم نہیں کہ پاکستان کی کارگہ حیات میں ہر مسلمان غزنوی ہے جو انہیں منتظر بیٹھے رہنے کا موقع نہ دے گا۔

پاکستان اپنی تاریخ کے جس خطرناک موڑ پر آج کھڑا ہے' اسے بحفاظت تمام یہاں سے آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں ندرت فکر و عمل کی تحریک کو از سر نو زندہ کر کے ان میں وحدت افکار پیدا کی جائے' اور وحدت افکار صرف تعاون اور اتحاد کے ماحول ہی میں جنم لے سکتی ہے۔ پاکستان کے تحفظ اور بقا کے لئے قابل قبول دستور' مضبوط دفاع اور اقتصادی مسائل کا حل لازمی شرائط ہیں۔ لیکن جب تک دستور کا تعین نہیں ہو جاتا' پاکستان کے دفاع اور اقتصادی مسائل کا حل ممکن نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دستور سازی کے لئے تعاون' اتحاد' حلم اور بردباری کے ماحول میں یہاں انتخابات کرائے جائیں۔ ظاہر ہے مسلمانان پاکستان ایسا دستور کبھی قبول نہ کریں گے جس سے پاکستان کی سالمیت کو کوئی گزند پہنچے۔ پاکستان کی سالمیت صوبوں کی خود مختاری کے باوجود مضبوط مرکز ہی سے قائم رہ سکتی ہے کیونکہ بقول علامہ ؎

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی!

دفاعی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لئے "ٹیکنالوجی" کے میدان میں اسی ندرت فکر و عمل اور وحدت افکار کی ضرورت ہے جس کے ذریعے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلمانوں کی جدت فکر و عمل تبھی بروئے کار لائی جا سکتی ہے جب یہاں ریاستی تحویل میں فولاد کے کارخانے نصب کئے جائیں تاکہ پاکستان بیرونی امداد سے بے نیاز ہو کر ہر قسم کے اوزاروں، صنعت و حرفت کی مشینوں، ٹریکٹروں، لاریوں اور دفاعی ساز و سامان کی ساخت نہ صرف خود کرنے لگے بلکہ خود کفیل بھی ہو جائے۔ ہمارے سامنے جاپانیوں اور چینیوں کی مثالیں موجود ہیں جو بیرونی امداد کی محتاجی کے بغیر اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آج دنیا کی ترقی پذیر قوموں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مسلمانان پاکستان کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ مستقبل میں قوموں کی حیات کا انحصار "ٹیکنالوجی" کے میدان میں جدت فکر و عمل پر ہو گا، اس لئے ہمیں قرآن مجید کی "سورۃ الحدید" میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لینا چاہئے:

> "ہم نے رسول نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کی معیت میں کتاب اور میزان اتارے تاکہ عوام الناس انصاف پر قائم رہ سکنے کی حقیقت کو سمجھیں۔ اور ہم نے فولاد نازل کیا جس میں اصل قوت کا راز پنہاں ہے۔ اور جس کے ذریعہ انسانیت بے انتہا فوائد اٹھاتی ہے۔"

قرآن مجید میں کتاب 'میزان' اور فولاد کے نزول کا ذکر جو یکجا کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ احکام الٰہی کے تحت معاشی عدل کے تصور کا فولاد سے ایک مخصوص تعلق ہے۔ دنیا میں صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد جو قوم بھی فولاد کی ساخت کی اہل ہوئی، وہ دوسری قوموں کی محتاجی سے بے نیاز ہو گئی۔ آج اگر مسلمانان پاکستان سمجھ سکیں کہ اسلام کے معاشی عدل کے تصور کا فولاد سے کیا تعلق ہے تو وہ بھی بیرونی امداد یا دوسری قوموں کی محتاجی سے بے نیاز ہو کر اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے ہیں اور اپنے تمام دفاعی اور اقتصادی مسائل حل کر کے اسلامی معاشرہ وجود میں لا سکتے ہیں۔ ان سے یہ عمل کوئی بعید بھی نہیں کیونکہ مسلمان اپنی گزشتہ تاریخ میں کئی آزمائشوں اور امتحانوں سے کامیاب و کامران گزر چکے ہیں۔ جو قوم انگریز اور ہندو کی طاقت سے نبرد آزما ہو کر پاکستان وجود میں لا سکتی ہے، جو قوم اپنے آپ سے پانچ گنا بڑی دشمن کی فوجوں کو شکست فاش دے سکتی ہے، جو قوم ایک آمر کی گیارہ سالہ آمریت کو گیارہ ہفتوں میں ملیامیٹ کر سکتی ہے، اس سے ناامید ہونا اس کے مزاج کو نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔

مسلم خوابیدہ اٹھ! ہنگامہ آرا تو بھی ہو
وہ چمک اٹھا افق، گرم تقاضا تو بھی ہو

وسعت عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب
دامن گردوں سے ناپیدا ہوں یہ داغ سحاب
کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز
پھر سکھا تاریکی باطل کو آداب گریز
ہاں، نمایاں ہو کے برق دیدۂ خفاش ہو
اے دل کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو!

○

اقبال اور مسئلہ تعلیم جدید☆

(رجحان قرآنی اور اخلاق نبویؐ کی روشنی میں)

اسلام نے انسان کی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور مادی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک نیا طریق حیات پیش کیا۔ یہ طریق حیات مسلمانوں کے فطری تجسس کے فروغ کے لئے مہمیز ثابت ہوا اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ اسی طریق حیات کی بدولت مسلمانوں نے دنیا میں ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، اور یہ تمدن نہ صرف مشرق میں علم و حکمت کی تحصیل کا ذریعہ بنا بلکہ مغرب نے بھی اپنے اخلاقی، ذہنی اور مادی ارتقاء کے لئے اسی سے استفادہ کیا۔ مگر جونہی مسلمانوں کے ہاتھ سے دنیا کی تمدنی قیادت چھوٹی، وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو گئے۔

گزشتہ دو صدیوں میں یورپی اقوام نے ذہنی اور مادی طور پر نمایاں ترقی حاصل کی اور یہ ترقی بالآخر ممالک اسلامیہ کے تسلط اور معاشی استحصال کا باعث بنی۔ نوآبادیاتی دور میں مسلمانون کے تمدن کا نام و نشان مٹانے کی خاطر ان کے تعلیمی نظام کو مغرب کے لادین تمدنی نظریات کے تابع لایا گیا۔ یورپ سے براہ راست تعلق کے سبب مغربی تصورات مثلاً سیکولرزم، نیشنلزم، کیپیٹلزم، سوشلزم اور کمیونزم دنیائے اسلام میں در آئے۔ مسلم ممالک میں مغربی ٹیکنالوجی کو قبول کرنے کے جواز میں ایک نئے انداز فکر کی تشہیر کی گئی یعنی مادی ترقی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذہن کو مذہب کی قید سے آزاد کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

☆ فروری ۱۹۷۷ء

مغرب کے لادینی نظریات کے زیر اثر روح اور جسم کی وحدت، جسے اسلام نے برقرار رکھا تھا، ٹوٹ گئی۔ بانگ درا کی نظم "فردوس میں ایک مکالمہ" میں علامہ اقبال، اسی صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سعدی شیراز، حالی سے مسلمان برصغیر کی کیفیت بیان کرنے کو کہتے ہیں۔ حالی جواب دیتے ہیں ۔

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا، پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستان کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضور شہ یثرب میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

بہرحال، مغربی نظریات کے زیر اثر نافذ کردہ نظام تعلیم کو روایتی اسلامی نظام تعلیم کے حامیوں نے قبول نہ کیا۔ لہٰذا سیکولر تعلیمی اداروں کے دوش بدوش دینی تعلیم کے مدرسے جاری رہے۔ مگر اس طریق کار یعنی دو طرز کے تعلیمی نظاموں کے نفاذ کے سبب دنیائے اسلام میں ہر جگہ مسلم معاشرہ تمدنی دوئی کا شکار ہو گیا۔ اور یہ صورت حال آج تک قائم ہے۔

مغربی طرز کے نظام تعلیم کا نصب العین ہے: تحصیل علم برائے علم یا تحصیل علم برائے استعمال۔ یہ نظام تعلیم انسانی تجسس کے جذبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، بلاشبہ علم میں اضافے کا باعث بنتا ہے یا علم کی وساطت سے گرد و نواح کی تغیر پذیر قوتوں پر قابو پا کر انسان کی مادی زندگی کو بہتر بنانے کے وسائل سے روشناس کراتا ہے، لیکن اس کا منتہائے نظر یک طرفہ ہے۔ وہ جدید انسان تو پیدا کر دیتا ہے، مگر صالح انسان پیدا کرنے کا اہل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان قدروں کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

آج پاکستان سمیت دنیائے اسلام کے مختلف ممالک میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ: اگر مسلمان تمدنی دوئی کا شکار رہے تو مستقبل قریب میں اخلاقی انحطاط کے ساتھ وہ اپنا تشخص بھی کھو بیٹھیں گے۔ مسلمانوں کے تشخص کا برقرار رہنا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کے مخصوص تمدن کی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور مادی قدروں کا تحفظ کیا جائے تاکہ تمدنی دوئی کا خاتمہ ہو۔ یہ مقصد صرف ایک مخلوط نوعیت کے نظام تعلیم کے نفاذ کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن جدید تعلیم کو عملی طور پر اسلامی بنانے کی غرض سے اب تک جو قدم اٹھائے گئے، وہ ناکافی ثابت ہوئے ہیں۔ اکثر مسلم ممالک کے تعلیمی نصابوں میں لسان و ادب، فنون لطیفہ،

قدیم و جدید علوم اور مغربی ٹیکنالوجی کی تحصیل کا بندوبست کیا گیا ہے۔ بعض ممالک میں آرٹ اور سائنس کی تعلیم کے ساتھ ایک مخصوص مرحلے تک دینیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ مگر اس طریق کار نے دینیات کو محض ایک موضوع کا مقام عطا کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، دیگر شعبہ ہائے تعلیم میں دینیات کے شعبے کا اضافہ ہوا ہے لیکن یہ اضافہ نہ تو تمدنی دوئی کے خاتمے کا سبب بنا ہے نہ اس کردار کی ساخت و تعمیر کے لئے کافی ہے جس سے من حیث الملت مسلمانوں کا تشخص برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کو سامنے رکھتے ہوئے وہ انسانی مسرت یا سعادت کی تحصیل کے لئے ایک دو پہلو نظریۂ حیات پیش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس دنیا میں مادی طور پر مسرت کی تحصیل انسان کا حق ہے بشرطیکہ وہ اپنی زندگی خداوند تعالیٰ کے احکام اور متعین کردہ عالمگیر اخلاقی اصولوں کے مطابق گزارے تاکہ آخرت میں بھی وہ مسرت کی تحصیل کا اہل ہو سکے۔ پس اسلامی نقطۂ نگاہ سے نظام تعلیم کا نصب العین "تحصیل علم برائے سعادت دارین" ہے۔ اسی بنا پر اسلام تعلیم کے ساتھ تربیت اخلاق پر بھی زور دیتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم کی تحصیل کے متعلق آیات قرآنی کا رجحان کیا ہے اور تربیت کے سلسلے میں اخلاق نبوی سے کیا سبق ملتا ہے۔ انسان کو علم کی تحصیل کے لئے تین ذرائع سے نوازا گیا ہے: حواس، ادراک اور وجدان۔ قرآن مجید نے علم کے حصول کے سلسلے میں انسان کی توجہ بار بار ان ذرائع کی طرف مبذول کرائی ہے اور واضح کیا ہے کہ ان کے استعمال سے انسان اپنی تقدیر کا مالک خود بن سکتا ہے۔ قرآن مجید کے سوا کسی الہامی کتاب میں انسان کو اپنے حواس اور ادراک کو پورے طور پر استعمال کرنے اور فطرت کی قوتوں کو اپنے فائدے کے لئے تصرف میں لانے کی ترغیب نہیں دی گئی۔ قرآن مجید کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ انسان کو تصورات کے عالم فن میں رہنے کے بجائے عالم محسوسات اور ٹھوس حقائق کو سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے حواس اور ادراک کو استعمال میں لا کر فطرت کا مشاہدہ و مطالعہ کرے گا تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کائنات دراصل متحرک، متناہی اور اضافہ پذیر ہے۔ پس قرآنی تعلیمات کا رجحان یہی ہے کہ انسان اپنی قوت مشاہدہ و مطالعہ کو بروئے کار لا کر اپنی علمی روح بیدار کرے اور مظاہر فطرت، جو انسان کی خدمت کے لئے مامور ہیں، کی تسخیر کر کے انہیں اپنی اغراض یا بہبود کے لئے استعمال میں لائے۔ تاریخ تمدن اسلام کے مطالعے سے واضح ہے کہ علم و حکمت کی جستجو

میں اسلامی تمدن کی روح محسوس اور متناہی پر مرکوز رہی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں علم و حکمت کے میدان میں مسلمانوں ہی نے مشاہداتی یا تجربی طریق یا بہ اصطلاح جدید' سائنٹیفک انداز فکر کی ابتدا کی۔ علامہ اقبالؒ درست ارشاد فرماتے ہیں کہ اسلام کا ظہور اصل میں استقرائی عقل کا ظہور تھا۔ اور اسلامی تمدن کی روح یا تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کا اگر بنظر غور مطالعہ کیا جائے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہون منت دکھائی دے گا۔

قرآن مجید میں علم و حکمت کی تحصیل پر زور دیا گیا ہے۔ پہلی آیت جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوئی' اس میں آنحضورؐ کو حکم دیا گیا کہ "پڑھیے"۔ اسی طرح آنحضورؐ سے کہا گیا کہ علم میں اضافے کے لئے دعا مانگا کیجئے۔ رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ علم حاصل کریں خواہ اس کی خاطر انہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ ایک عالم کی روشنائی ایک گوشہ نشین کی عبادتوں سے کہیں زیادہ مقدس ہے۔ پس تحصیل علم و حکمت مسلمانوں کے دینی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے۔

رسول اللہؐ کی حیات کے مطالعے کے بغیر قرآن مجید کے اخلاقی آئیڈیل کو سمجھنا محال ہے۔ آنحضورؐ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔ وہ اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھے۔ اخلاق و عمل کا جو بھی اصول دوسروں کو سکھاتے' خود اس کا عملی پیکر تھے۔ آپ حق کی حمایت کرتے تھے۔ غریبوں کی اعانت کرتے تھے۔ مقروضوں کا بار اٹھاتے تھے۔ مصیبت میں لوگوں کے کام آتے تھے۔ برائی کے بدلے برائی نہ کرتے تھے بلکہ درگزر اور معاف فرما دیتے تھے۔ آنحضورؐ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملے میں انتقام نہیں لیا۔ آپؐ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں بھیجی۔ آپؐ نے کبھی کسی کی جائز درخواست رد نہیں فرمائی۔ آپؐ فطرتاً" خندہ جبیں' خوش مزاج' نرم خو' مہربان طبع اور رحیم سیرت تھے۔ عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے۔ متحمل مزاج' فیاض' راست گو' رحم کرنے والے اور خوش صحبت تھے۔ ایفائے عہد آنحضورؐ کی ایک ایسی خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے۔ کھانا جس قسم کا بھی سامنے آتا' تناول فرماتے۔ جو میسر آتا' پہن لیتے۔ جس کیفیت میں بھی نیند آتی' آرام کر لیتے۔ کسی کو ملتے وقت پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے۔ حسن معاملہ کا سخت اہتمام کرتے۔ آپؐ کی دیانت اور حسن معاملہ کی وجہ سے قریش نے آنحضورؐ کو امین کا خطاب دیا تھا۔ آپؐ جس عمل کو اختیار کرتے' اس پر ثابت قدمی اور استقلال سے قائم رہتے۔ عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ آپؐ کے اخلاق میں جو صفت سب سے نمایاں تھی' وہ آپؐ کا ایثار تھا۔ کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے۔ آپؐ کو ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی

پسند تھی- امارت پسندی سے اجتناب کرتے تھے- آپؐ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے- آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنا پسند کرتے تھے- محنت و مشقت سے گریز نہ کرتے تھے- کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگا لیتے تھے- گھر میں جھاڑو دے لیتے تھے- دودھ دوہ لیتے تھے- بازار سے سودا خرید لاتے تھے- جوتا پھٹ جاتا تو خود گانٹھ لیتے تھے- دوسروں کے کام کر دیتے تھے- آنحضورؐ عزم و استقلال کا پیکر تھے- میدان کار زار میں سب سے زیادہ شجاع تھے- تمام عرب کے زیر نگیں ہو جانے کے بعد بھی آپؐ فاقہ کش ہی رہے اور زہد و قناعت کے ساتھ زندگی بسر کی- غریبوں، ناداروں، یتیموں اور بچوں کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتے- عورتوں کی حق رسی کرتے اور عزت و منزلت کے دربار میں ان کو مردوں کے برابر جگہ دیتے تھے- حیوانات پر رحم فرماتے تھے- آنحضورؐ کی ذات اقدس تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئی تھی- اس خزانہ ء رحمت میں دوست و دشمن، کافر و مسلم، بچے، بوڑھے، عورت و مرد، آقا و غلام، انسان و حیوان ہر ایک صنف ہستی برابر کی حصہ دار تھی-

تحصیل علم اور تربیت اخلاق کے متعلق اگر آیات قرآنی کے رجحان اور اخلاق نبویؐ کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر ایک کامل نظام تعلیم و تربیت اسلامی ممالک میں نافذ کیا جائے تو مسلم معاشرے میں تمدنی دوئی کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور مسلمان من حیث الملت اپنا تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں- آج کی دنیائے اسلام میں اسلامی تاریخ اور اسلام علوم کے بارے میں صحیح علم نہایت ہی محدود ہے- دین و اخلاق کے اصول و فروع کی تلقین کے لئے موجودہ زمانے کے علماء کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائق سے روشناس ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے ادب اور تخیل سے بھی واقفیت لازمی ہے- تمدنی دوئی کے خاتمے کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کی رائے تھی کہ مغربی طرز کے اسکول اور کالج، دینی مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، ان تمام منتشر قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلوم ہونا چاہئے جہاں افراد ملت نہ صرف جدید علوم کی تحصیل کے ذریعے خاص قابلیتوں کو نشوونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا اسلوب یا سانچا بھی تیار کیا جا سکے جس میں عہد حاضر کے مسلمانوں کا ڈھلنا اشد ضروری ہے-

○

اقبال اور گردش ایام ☆

گردش ایام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تلخی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس گردش ایام ہی کے باعث آج عامتہ المسلمین، آزادی حاصل کر لینے کے باوجود، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آزادی سے مراد محض سیاسی آزادی نہیں بلکہ وہ فطری کیفیت ہے جس میں ہر فرد اپنے منشا کے مطابق بے خوفی سے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کر سکے اور اپنی خواہش کے مطابق اسے غذا، پارچات، تعلیم اور طبی امداد فراہم کر سکنے کی آزادی ہو۔ اگر کسی معاشرے میں ایسی آزادی کی نعمت صرف گنتی کی چند 'راکب' شخصیتوں کو میسر ہے اور باقی تمام "مرکب" افراد پر خوف سوار ہے تو ایسے معاشرے کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ غیر ذمہ دار طاقت کے شکنجے میں گرفتار ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ غیر ذمہ دار طاقت کے شکنجے میں ہے، اور علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح غیر ذمہ دار طاقت کے مخالف تھے تو ہمیں ملازمان سلطان کی طرف سے جواب ملتا ہے۔

محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں، ان فسانوں کو نہ چھیڑ

جب علامہ نے مسلمانان پاک و ہند کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تو کیفیت یہ تھی کہ غیر ملکی حاکموں کو غلامی کے باعث ان کا کردار من حیث الملت بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ وہ تقویٰ کا احترام چھوڑ چکے تھے، بلند کرداری کی عزت کرنا انہوں نے فراموش کر دیا تھا، علم کی قدر نہیں رہی تھی، حتیٰ کہ دولت کا رعب بھی بے اثر تھا۔ انہیں فقط یہی سکھایا گیا تھا کہ طاقت و اقتدار کے سوا کسی کی عزت نہ کرو۔ غلام قوم خود بخود طاقت و اقتدار کے سامنے

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

احترام سے سر جھکانے لگتی ہے، کیونکہ وہ طاقت و اقتدار سے خائف ہوتی ہے۔ اس عالم میں علامہ نے مسلمانوں کے درخشاں ماضی کے تصور میں پناہ ڈھونڈی جبکہ ان کے صبح و شام آزاد تھے اور وہ حقیقی معنوں میں لا الٰہ الا اللہ کہہ سکنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ آپ اپنے تصور سے مخاطب ہو کر کہتے۔

ہاں، دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!

علامہ گردش ایام کو عالم خیال میں وقتی طور پر پیچھے کی طرف تو دوڑا لیا کرتے لیکن جب کبھی ان کی نگاہ اپنی بے حس ملت پر جا پڑتی تو ناامید ہو جاتے اور سوچتے۔

جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں

غلام قوم ذوق جستجو سے محروم ہوتی ہے اور اسے جس حالت میں بھی رکھا جائے، مطمئن رہتی ہے۔ علامہ کو مسلمانوں کی غلامی سے مطمئن طبیعت پریشان رکھتی تھی۔ وہ بار بار ان سے مخاطب ہو کر کہتے۔

مطمئن ہے تو، پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوق جستجو رہتا ہوں میں

علامہ کے نزدیک شاعر اپنی ملت کی آنکھ ہوتا ہے۔ آنکھ ہی جسم کا ایک ایسا عضو ہے جو آگے دیکھ سکنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے جب جسم کے دوسرے اعضا کو اذیت پہنچتی ہے تو آنسو آنکھ ہی سے بہتے ہیں۔

محفل نظم حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگین نوا ہے دیدہ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ!

علامہ بحیثیت شاعر ملت اسلامیہ کی آنکھ تھے۔ ان کے کلام سے شان خلیل اس لئے عیاں ہوئی کیونکہ ان کی ملت نے آزری کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ آپ فرماتے ہیں۔

شاعر دل نواز بھی بات اگر کہے کھری ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری

علامہ کو احساس تھا کہ ملت اسلامیہ کے تمام امراض کی علت اس کی محکومی میں ہے۔

محکومی کے باعث مسلمان خود فروش ہے' اپنے تن کی آسودگی کے فکر میں گرفتار ہے' ڈرپوک ہے' حتیٰ کہ شرع و آئین کی پابندی بھی اس کے لئے دشوار ہے۔ انہوں نے مسلمان سے مخاطب ہو کر کہا۔

چو بلبل نالہ ء زارے نداری
کہ در تن جان بیدارے نداری

(تو بلبل کی طرح اس لئے آہ و نالہ بلند نہیں کرتا کہ تیرے تن میں جان بیدار موجود نہیں)

دریں گلشن کہ گل چینی حلال است
تو زخمے از سر خارے نداری!

(اور گو اس گلشن میں گل چینی حلال ہے' تو اس خوف سے پھول نہیں توڑتا مبادا کوئی کانٹا چبھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تیرے ہاتھ میں کانٹے کی کوئی خراش نہیں۔)

انہوں نے مسلمان کو آگاہ کیا کہ۔

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار با مزاج او بسازو روزگار

(جو شخص خود دار اور عمل کا پکا ہو' زمانہ خود اس کے مزاج سے موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے)

گر نہ سازد بامزاج او جہاں ی شود جنگ آزما با آسماں

(اگر زمانہ اس کے مزاج کے مطابق اپنے آپ کو نہ ڈھالے تو ایسا شخص آسمان سے جنگ آزمائی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔)

بر کند بنیاد موجودات را ی دہد ترکیب نو ذرات را

(جو نظام بھی اس کے سامنے آتا ہے' وہ اس کے پرخچے اڑا دیتا ہے' پھر ٹکڑوں اور ذروں کو سمیٹ کر انہیں نئی ترکیب دیتا ہے)

گردش ایام را برہم زند چرخ نیلی فام را برہم زند

(وہ گردش ایام کو درہم برہم کر دیتا ہے بلکہ اس چرخ نیلی فام کو بھی باقی نہیں چھوڑتا جو ایام کی گردش کا باعث ہے)

ی کند از قوت خود آشکار روزگار نو کہ باشد سازگار

(پس یوں وہ اپنے زور عمل سے ایک نیا نظام وجود میں لاتا ہے جو موافق اور راس ہوتا ہے)

علامہ کی تعلیمات کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں خودداری اور عمل کی آتشیں روح پھونکنا تھا تاکہ وہ اپنی ملی زندگی کے ہر دور میں اپنے منشا کے منافی گردش ایام کو درہم برہم کر کے اپنی رضا کے مطابق روزگار نو کی تخلیق کر سکنے کے اہل ہوں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ضروری تھا کہ انہیں امتیاز غلام و آزاد سے شناسا کیا جائے۔ علامہ کی نگاہ میں غلام وہ ہے جو شب و روز کی چادر اپنے آپ پر تانتا ہے' ایام کے تار و پود سے اپنا کفن تیار کرتا ہے اور جو کچھ بھی واقعات کی صورت میں پیش آتا ہے' اسے بسر و چشم قبول کر لیتا ہے۔ غلام پر لذت پرواز حرام ہے کیونکہ وہ اس پرندے کی طرح ہے جو صبح و شام کے جال میں پھنسا ہو۔ اس کے نزدیک جو کچھ ہے' وہ عین فطرت ہے۔ اسے کوئی نئی راہ نہیں سوجھتی کیونکہ وہ ایام کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ پس اس کے لبوں پر ہمیشہ تقدیر کا لفظ رہتا ہے۔ اس کے برعکس' آزاد اپنے آپ کو مٹی سے باہر نکال کر مادی بندشوں سے چھوٹ جاتا ہے' ایام پر حاوی ہوتا ہے اور زمانے کو اپنے منشا کے مطابق چلاتا ہے۔ وہ ہر لحظہ نئی راہیں پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ قضا اس سے مشورے لینے لگتی ہے اور حادثات اسی کے ہاتھ سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

غلام و آزاد کے فرق سے روشناس کر کے علامہ نے مسلمان کو یہ تلقین کی کہ اس کی ہر ذاتی کمزوری کا باعث خوف ہے' وہ خوف کو دل سے نکال دے۔ اپنے منشا کے منافی گردش ایام کو نیست و نابود وہی کر سکتا ہے اور اپنی رضا کے مطابق روزگار نو کو وجود میں وہی لا سکتا ہے جو خود دار اور باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ جرائت مند اور بیباک بھی ہو۔ آپ نے واضح کیا۔

هر شر پنهاں که اندر قلب تست   اصل او بیم است اگر بینی درست

(ہر وہ برائی جو تیرے دل کے اندر چھپی ہوئی ہے' اگر تو اسے صحیح طور پر دیکھے تو اس کا سبب دراصل خوف ہے)

لابه و مکاری و کین و دروغ   این همه از خوف می گیرد فروغ

(خوشامد' مکر و فریب' کینہ اور جھوٹ' یہ سب خوف ہی کی وجہ سے پھلتے پھولتے ہیں)

زانکه از همت نه باشد استوار   می شود خوشنود با ناسازگار

(جس شخص کی ہمت مضبوط اور مستحکم نہیں رہتی' وہ ناموافق حالات کو بھی خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے)

ہر کہ رمزِ مصطفیٰؐ فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است
(لیکن جو شخص رسولؐ اللہ کی تعلیمات کی حقیقت کو سمجھتا ہے' وہ یقیناً شرک کو خوف میں چھپا ہوا پاتا ہے)

اسی لئے علامہ نے مسلمان کو نصیحت کی کہ وہ اپنے دل کو بیم و ریا سے پاک کر دے اور حق بات کہنے سے کبھی گریز نہ کرے۔

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

علامہ کو یہ بھی یقین تھا کہ اگرچہ محکومی کے باعث مسلمان پر بے غیرتی کا رنگ چڑھ گیا ہے لیکن اسلام سے نسبت ہی کی بنا پر یہ رنگ ابھی پختہ نہیں ہوا۔ اس لئے انہوں نے نہایت عاجزی سے رسول اکرمؐ کی خدمت میں التماس کی۔

حق آں دہ کہ مسکین و اسیر' است
فقیر و غیرت او دیر میر است

(یارسولؐ اللہ! مسلمان کا حق اسے عنایت فرمائیے کہ وہ مسکین بھی ہے اور اسیر بھی ہے۔ وہ ایک ایسا فقیر ہے جس کی غیرت' اغیار کی انتہائی کوششوں کے باوجود' ابھی تک پوری طرح مٹ نہیں سکی)

بروئے او در میخانہ بستند دریں کشور مسلماں تشنہ میر است
(اس پر میخانے کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے' یعنی اسے شریک حکم نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا اس ملک میں مسلمان ابھی تک پیاسا ہے اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے مضطرب ہے)

پھر اسی عاجزی کے عالم میں خداوند تعالیٰ سے دعا کی۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہم دوش ثریا کر خودداری ساحل دے' آزادی دریا دے!

مسلمان گردش ایام کو تہ و بالا کر سکنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں یوں ہو سکنا ممکن نہ تھا۔ لیکن علامہ نے اسے آگاہ کیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا!

اسی یقین کے پیش نظر علامہ نے خداوند تعالیٰ سے ایک ایسا رفیق عطا کرنے کے لئے

استدعا کی جس کے دل میں وہ اپنی تمناؤں کا عکس دیکھ سکیں، جو مسلمانوں کی قیادت کرے اور انہیں ان کا حق دلوادے۔ آپ نے اللہ سے عرض کی کہ یا تو اپنی عطا کردہ آتش عشق مجھ سے واپس لے لے ______

یا مرا یک ہمدمِ دیرینہ دہ   عشقِ عالم سوز را آئینہ دہ
(یا مجھے کوئی ہمدم دیرینہ عطا کر جو میرے عشق عالم سوز کا آئینہ ہو)

گرچہ تو در ذات خود یکتا ستی   عالمے از بہر خویش آراستی
(اگرچہ تو اپنی ذات میں یکتا ہے اور تجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں، لیکن اپنی دلچسپی کے لئے تونے بھی ایک جہان آراستہ کر رکھا ہے)

من مثالِ لالۂ صحرا ستم   درمیانِ محفلے تنہا ستم
(میری مثال لالۂ صحرا کی ہے۔ میں تو بھری مجلس میں تنہا ہوں)

خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے   از رموزِ فطرتِ من محرمے
(میری فریاد ہے کہ اپنے لطف و کرم سے مجھے ایک ایسا ساتھی عطا کر جو میرا ہمدم ہو اور میری فطرت میں جو رمزیں بھری ہوئی ہیں، ان کا محرم ہو)

ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ   از خیالِ این و آں بیگانۂ
(ایسا ہمدم جو دیوانہ بھی ہو اور عقل مند بھی۔ اور جسے دنیوی عزہ و جاہ سے کوئی واسطہ نہ ہو)

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش   باز بینم در دلِ او روئے خویش
(تاکہ میں اپنے عشق کی آگ اس کے سپرد کردوں اور پھر اس کے دل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھوں)

سازم از مشتِ گلِ خود پیکرش   ہم صنم او را شوم ہم آزرش
(میں اپنی خاک میں سے مٹھی بھر لے کر اس کا پیکر بناؤں اور اس کے لئے صنم بھی بنوں اور آزر بھی، یعنی میں ہی اسے بناؤں اور میری ہی تعلیمات اور عشق کا وہ ترجمان ہو)

خداوند تعالیٰ کے حضور میں یہ دعا قبول ہوئی اور علامہ کو اپنی زندگی کے آخری حصے میں قائداعظم کی رفاقت ملی۔ ہم میں سے جس کسی نے بھی مکتوبات اقبال بنام جناح کا مطالعہ کیا ہے، وہ قائداعظم کے ساتھ علامہ کی گہری وابستگی کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اب علامہ تنہا نہ تھے۔

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغان سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند!

علامہ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے روز داعئ اجل کو لبیک کہا۔ لیکن وہ اس جہان فانی سے ناامیدی کے عالم میں نہ گئے، بلکہ انہیں یقین تھا کہ عنقریب قائداعظم کی قیادت میں مسلمان گردش ایام کو تہ و بالا کر دیں گے۔ پس آپ یہی بشارت دے کر رخصت ہوئے۔

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

(میں اس خاک کہن میں از سرِ نو زندگی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر ذرے کی آنکھ ستارے کی طرح بیدار ہو چکی ہے)

دانہ ء را کہ باغوش زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم

(وہ دانہ جو ابھی تک زمین کی آغوش میں پوشیدہ ہے، مجھے شاخ در شاخ پھلتا پھولتا اور جوان ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔)

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیر افلاک بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

(میں ایسے انقلاب کو بسرعت تمام آتے دیکھ رہا ہوں جو افلاک کے ضمیر میں نہیں سما سکتا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ جو کچھ مجھے نظر آ رہا ہے، کیوں اور کس طرح نظر آ رہا ہے۔)

علامہ کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے روز قائداعظم کے زیر قیادت لاہور میں قرار داد پاکستان منظور کی گئی۔ اس سے اگلے دن اسی یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال کی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت قرار داد پاکستان پیش کرنے والے شیر بنگال مولوی اے کے فضل الحق نے اور دوسرے اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی۔ قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا:

"اگر میں مسلم ریاست کے نصب العین کے حصول کو دیکھنے کے لئے زندہ رہوں اور تب اگر مجھے کلام اقبال اور مسلم ریاست کی حکمرانی میں سے ایک کو چننے کے لئے کہا جائے تو میں اپنے لئے کلام اقبال کو منتخب کرنا بہتر سمجھوں گا۔"

قائداعظم نے یہ الفاظ کیوں کہے؟ اس لئے کہ مسلم ریاست کی حکمرانی سے کہیں زیادہ

بیش قیمت وہ جذبہ یا تخیل تھا جس کے نمو کا سبب مسلم ریاست تھی۔ اور قائداعظم کے نزدیک وہ جذبہ یا تخیل کلام اقبال میں موجود تھا۔ بہرحال، قائداعظم کے زیرِ قیادت مسلمانوں نے بالاخر اپنے منشا کے منافی گردش ایام کو درہم برہم کر دیا اور اپنی رضا کے مطابق روزگار کو وجود میں لائے۔ جو کچھ بیان کیا گیا' وہ تحریک پاکستان کا روحانی پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن بقول اقبال۔

ستارگان فضا ہائے نیلگوں کی طرح
تخیلات بھی ہیں تابع طلوع و غروب

علامہ کی بصیرت سے یہ مخفی نہ تھا کہ جس گردش ایام کو مسلمانوں نے نیست و نابود کر دیا، وہ رحلت اقبال اور حصول پاکستان کے بعد اپنا انتقام لینے کے لئے واپس بھی آ سکتی ہے۔ تدبر و تخیل میں تغیر آ سکتا ہے' فکر نئے رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے' نئی طرز کا خوف لوگوں کے دلوں پر بٹھایا جا سکتا ہے' غلامی کی نئی نوع دریافت کی جا سکتی ہے اور اسے حیات تازہ کا نام دے کر گردش ایام اپنا دائرہ مکمل کر سکتی ہے۔

فکر کا یہ نیا رنگ کیا ہے جسے رحلت اقبال اور حصول پاکستان کے بعد گردش ایام نے ہم پر مسلط کر دیا؟ اس فلسفہ انقلاب کا ملخص یہ ہے کہ مسلمان بے شعور اور جاہل ہے۔ اسے خوب و ناخوب کی تمیز نہیں۔ خوب وہ ہے جو ذاتی منافع کا باعث ہو۔ لہذا مسلمان کو مجموعی منافع کے حصول پر اپنی تمام تر توجہ مبذول کرنی چاہئے' اسے اپنے حقوق کی پامالی کی رٹ نہیں لگانی چاہئے۔ اسے معاشی انصاف و عدل کا تقاضا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ سب جذباتی باتیں ہیں اور ایک ترقی پذیر معاشرے کو زیب نہیں دیتیں۔ مسلمان کو ہمیشہ اپنی عقل سے کام لینا چاہئے۔ اسے یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ گنتی کے چند افراد کے امیر سے امیر تر بننے میں اس کا خسارہ ہے۔ بلکہ اس میں تو اس کا فائدہ ہے کیونکہ جب کسی ملک میں ایک محدود طبقہ امیر سے امیر تر بنتا ہے تو وہ باقی افراد کے لئے وسائل روزگار پیدا کرتا ہے' اور یوں اجتماعی طور پر ہر فرد کی آمدنی اوسطاً" بڑھنے لگتی ہے۔ اس ملک میں حساب دانوں کے اربعہ کے مطابق فی کس آمدنی اوسطاً" بڑھ گئی ہے۔ اور یہ ایک نہایت اہم کارگزاری ہے۔

آپ نے غالباً "اربعہ جوں کا توں اور کنبہ ڈوبا کیوں" کا لطیفہ سن رکھا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ایک کنبہ کسی دریا کو عبور کرنے کی غرض سے اس کے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس کنبے میں ایک حساب دان بھی تھا۔ کنبے کے سربراہ نے حساب دان سے کہا کہ اپنا اربعہ لگا کر دریا کی گہرائی معلوم کرو۔ حساب دان نے حساب لگا کر بتایا کہ دریا کی گہرائی اوسطاً" تین فٹ ہے۔

اس پر کنبہ دریا میں اتر گیا اور اسے عبور کرنا شروع کر دیا۔ جب انہوں نے کچھ فاصلہ طے کر لیا تو کنبہ ڈوبنے لگا۔ سربراہ نے حساب دان سے پوچھا کہ تو نے کیسا حساب لگایا ہے' کنبہ تو ڈوب رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کنبہ ڈوبتا ہے تو ڈوبے' میرا حساب غلط نہیں ہو سکتا۔

فلسفہ ء انقلاب کے مطابق اگر اجتماعی آمدنی کا اوسط بڑھانے کے سلسلے میں بدعنوانی یا رشوت ستانی کا دور دورہ ہے تو اس پر بھی اعتراض نہ کرنا چاہئے۔ رشوت ستانی کے مسئلے پر جذبات سے نہیں' عقل سے غور کرنا چاہئے۔ آخر رشوت وہی دیتا ہے جو دے سکتا ہے اور اس کے عوض اپنا کام نکلواتا ہے۔ اسی طرح رشوت وہی لیتا ہے جسے ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس کے معاوضے میں دوسرے کا کام کر دیتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لئے روپیہ ایک جیب سے دوسری جیب میں جائے تو ملکی سرمایہ بہرصورت ملک کے اندر رہتا ہے' ملک سے باہر تو نہیں جاتا۔ اور ویسے بھی ترقی پذیر معاشرے کی بنیادی ضرورت یہی ہے کہ سرمایہ ایک مقام پر جامد نہ ہونے پائے بلکہ اسے گردش میں رہنا چاہئے۔

خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
پر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
چاہئے خانہ ء دل کی کوئی منزل خالی
شاید آجائے کہیں سے کوئی مہمان عزیز

جن دانشوروں نے یہ فلسفہ ترتیب دیا ہے' وہ انقلاب صبح و شام کے اسیر ہی نہیں بلکہ جمشید کے ساغر بھی ہیں۔ ان کی دانست میں قومیں متاع کردار سے نہیں' گندم و جو سے بنتی ہیں۔ اور گندم و جو عقل سے حاصل ہوتی ہے' دل سے نہیں۔ انہی عقلائے دہر سے علامہ سوال کرتے ہیں۔

من اے دانشوراں در پیچ و تابم
خرد را فہم ایں معنی محال است
چساں در مشت خاکے تن زند دل
کہ دل دشت غزالاں خیال است!

اے عقلائے دہر! میں اس بات کو سمجھنے کے لئے بیتاب ہوں کیونکہ عقل کے لئے اس کا جواب دے سکنا محال ہے۔ دل خاک کی مٹھی یعنی بدن میں خاموش کیونکر رہ سکتا ہے؟ دل تو ایسا دشت ہے جس میں خیال کے غزال چوکڑیاں بھرتے رہتے ہیں۔)

"دانشور" بجائے خود ایک ایسی اصطلاح ہے جسے حالیہ گردش ایام نے نئے معانی عطا کیے ہیں۔ علامہ کی زندگی میں اشتراکی دہریے اپنے آپ کو دانشور کہتے تھے۔ اب اس اصطلاح سے مراد وہ اہل دانش ہیں جو نظر سے محروم ہیں اور مصلحت وقت کے تحت مسلمانوں کو آداب خداوندی سکھانے کے بجائے اسے کاروبار لات و منات میں طاق کرتے ہیں۔

معاوضے میں مراعات حاصل کرتے ہیں۔

اہل دانش عام ہیں، کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخ مکتب کے طریقوں سے کشاد دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

وہ دل کو محبوس اور عقل کو آزاد کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی آزادی عقل مصلحت وقت کی قیود کی پابند ہے، اس لئے خیالات کو بے ربط و نظام چھوڑ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، ان کی تعلیمات روشنی اور سکون کے بجائے مزید تاریکی اور بے اطمینانی کا باعث بنتی ہیں۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام!

انہی دانشوروں کے حلقے میں فقیہان حرم بھی ہیں، کاسہ لیس سیاستدان بھی ہیں، "ترقی پسند" ادیب بھی ہیں اور ملازمان سلطان بھی ہیں۔ گردش ایام نے دانشوروں کے ہر گروہ کو اہم ذمہ داریاں سونپ رکھی ہیں۔ مثلاً فقیہان حرم کا کام آیات قرآنی کی تاویل مصلحت وقت کے تحت کرنا ہے لیکن۔

حلقہء شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

کاسہ لیس سیاستدانوں کا کام شان حاضر کی پرستش کرنا اور ہم سے اس کی پرستش کرانا ہے۔ ان کے نزدیک جو لا الٰہ الا اللہ کہے، وہ کافر و غدار ہے لیکن جو اپنا سر جھکا کر شان حاضر

کے ہاتھ کو بوسہ دے، وہ باوفا اور باایمان ہے۔ علامہ فرماتے ہیں؎

عارضی ہے شان حاضر، سطوت غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربط جان و تن
شعلہ ء نمرود روشن ہے زمانے میں تو کیا
"شمع خود را می گدازد درمیان انجمن"

کاسہ لیس سیاستدان اپنے "خالق و رازق" کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر عوام کی نگاہوں میں قائداعظم کی شخصیت کا تاثر مسخ کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ کبھی کہتے ہیں کہ قائداعظم ڈکٹیٹر تھے۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہم نے قائداعظم کو قائداعظم کہہ کر نہیں پکارا۔ کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قائداعظم تو لادین ریاست کے قائل تھے اور انہیں اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ انہوں نے اسلام کو محض وقتی ضرورت کے تحت استعمال کیا اور حصول پاکستان کے بعد اسلام چھوڑ کر قوم پرستی کا مسلک قبول کر لیا۔ ان کاسہ لیس سیاستدانوں پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی ہے اور ان کی نگارشات، علمی تحقیق و تجسس کو ابھارنے کے بہانے سرکاری اخبار بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔

"ترقی پسند" ادیب گردش ایام کے جادوگران سامری فن ہیں۔ انہیں سحر اقبال کو توڑنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایک زمانے میں ان کا نعرہ تھا کہ اقبال مذہب کی افیون بیچتا ہے اس لئے رجعت پسند ہے، لیکن اب انہیں یہ خیال آیا ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں ہی کے نعرے استعمال کرو اور مسلمانوں ہی کی برگزیدہ ہستیوں کو اپنے نظریات کی حمایت میں بطور سند پیش کرو۔ یعنی الحاد کے زہر کی گولی اسلام کی شیرینی میں لپیٹ کر دو تاکہ وہ حلق سے نیچے اترتے وقت کڑوی نہ لگے۔ لہٰذا اب وہ نعتیں اور مرثیے تحریر کرتے ہیں، علی رضی اللہ عنہ کو اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال تو دراصل اشتراکی انقلاب کا مدح سرا تھا۔ اس کی اسلام سے وابستگی محض برسر راہے تھی اور اس نے پاکستان کا تخیل بھی حادثاتی طور پر دیا۔ اس کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ مسلمان اشتراکی انقلاب کے ذریعے ہی اسلام کی صحیح خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ آخر ہم انہیں کیا کہہ سکتے ہیں۔

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا

گردش ایام نے ملازمان سلطان کے ہاتھ میں بہت کچھ سونپ رکھا ہے۔ وہ فوارۂ طاقت

سے پیوست ہیں، اس لئے شریک حکم ہیں۔ ان کا غنچہ برگشتہ عوام کے نفس کے زور سے وا نہیں ہوتا بلکہ اسے آفتاب جلوہ فرما کا پرتو کھلاتا ہے۔ لہٰذا جس طرح گلستان میں ہر صبح گل خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں، اسی طرح ان کا کام دن رات فلسفہء ذات و صفات کی بحث جاری و ساری رکھنا ہے۔ غالباً اسی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ نے اپنی نظم بعنوان "حکومت" میں واضح کیا۔

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و ملا کو بری لگتی ہے درویش کی بات!
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاع کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفہء ذات و صفات!
گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستور قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات!
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخاب حیات!

ملت پر اس فلسفہء انقلاب کا اثر کیا ہوا ہے اور گردش ایام کیونکر اپنا بدلا لینے میں کامیاب ہوئی؟ نوجوانوں نے بددیانتی کو شعار زندگی بنا لیا ہے اور بڑے رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی اور ہوسناکی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ ذرے پلک جھپکنے میں جگنو بن جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ناچیز چیز اور بے شعور، باتمیز بن جاتے ہیں۔

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
کیا ذرے کو جگنو، دے کے تاب مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں، تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کیا گم تازہ پروازوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دلکشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ دانشوروں کا مقصد کیا ہے اور وہ مسلمانان پاکستان کی نگاہوں میں علامہ اور قائداعظم کی شخصیتوں کا تاثر کیوں مسخ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں؟ کیونکہ وہ عقل کے غلام ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانان پاکستان ان زندہ جاوید شخصیتوں

کو چھوڑ کر طاغوتی عقل کی ایک ایسی میت کو کندھا دینے کے لئے تیار ہو جائیں جو ہمہ صفت موصوف ہے' یعنی۔

صیاد آپ' حلقہ ء دام ستم بھی آپ
بام حرم بھی' طائر بام حرم بھی آپ!

علامہ کے نزدیک۔

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

حصول پاکستان کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان گردش ایام کی زد سے باہر ہے۔ ہم نے پاکستان قائداعظم کے زیر قیادت حاصل کیا۔ اور اب گردش ایام سے اس کا تحفظ فکر اقبال کے احیاء ہی سے ممکن ہے۔

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو
میں نو نیاز ہوں' مجھ سے حجاب ہی اولیٰ کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

اسی باعث قائداعظم نے مسلم ریاست کی حکمرانی کے مقابلے میں اپنے لئے کلام اقبال کو ترجیح دی تھی۔ پس گردش ایام جب بھی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے گی' فکر اقبال اسے پاش پاش کر دے گا۔ حالیہ گردش ایام کی تخلیق کے شاہکار مجاوران خانقاہ سلطانی اور گورکنان نصب العین ملی ہیں۔ لیکن آج بھی اگر مسلمان فکر اقبال سے مزین ہو' غلام و آزاد کے امتیاز کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے' خوف کو اپنے دل سے نکال دے' خوددار' باعمل' جرأت مند اور بیباک ہو تو اس گردش ایام کا قلع قمع کر کے اپنی رضا کے مطابق روزگار نو کو وجود میں لا سکتا ہے۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

○

اقبال اور نژاد نو☆

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں بارہا نوجوانان ملت سے خطاب کیا ہے۔ اقبال شناسوں کے نزدیک پیغام اقبال کی تروتازگی کا راز دراصل اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ مسلمانوں کی ہر نئی نسل کے لئے ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

اس مرحلے پر دو اہم سوال اٹھائے جا سکتے ہیں :۔ پہلا یہ کہ نوجوانان ملت کے لئے حضرت علامہ کا پیغام کیا تھا' اور دوسرا یہ کہ کیا ہماری نسل کے نوجوانوں نے ان کی شخصیت اور تعلیمات سے کوئی اثر قبول کیا ہے۔

علامہ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ ء حیات ہے' اور ایسے انداز فکر کی ترغیب دیتا ہے جس میں دین' سیاست اور معیشت ایک دوسرے سے الگ نہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ان پر یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ کلمہ گو سیاسی آزادی کے ماحول ہی میں عوام کی رضا

☆ ۲۴ اپریل ۱۹۶۹ء کو نوائے وقت لاہور میں شائع ہوا۔

کے مطابق اسلامی کردار کی اساس پر ایک مثالی معاشرہ تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن غلامی یا محکومی کے عالم میں ایسا ہو سکنا محال ہے۔

علامہ کے دور کا مسلمان، ہندو اکثریت کی دلدل میں پھنسا، غیر مسلموں کا تابع تھا۔ وہ مومن ہونے کے باوجود غیروں کی اطاعت کرتا تھا۔ اپنی ملت سے غداری کا مرتکب ہوتا تھا اور افلاس و نفاق کی زندگی بسر کرتا تھا۔ چند مراعات کی خاطر دین و ملت فروخت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا اور یوں اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ ملی روایات کو بھی تباہ و برباد کر رہا تھا۔ اللہ سے محبت کرنے کی بجائے اس نے زر کو اپنا معبود بنا رکھا تھا۔ وہ موت سے ڈرتا تھا۔ اس کا سینہ قرآن کی گرمی سے اور اس کی زندگی مستی و ذوق و سرور کی لذت سے خالی تھی۔ چونکہ بحیثیت فرد وہ ناہموار تھا، اس لیے ملت بے نظام و منتشر تھی۔ اور نوجوانان ملت کی کیفیت کیا تھی۔ وہ تشنہ لب، خالی ایاغ، شستہ رو، تاریک جان اور روشن دماغ تھے۔ زندگی کے حقائق سے بے خبر، یقین و امید کی دولت سے محروم تھے۔ چونکہ وہ اپنی ملی روایات کے منکر تھے اس لئے غیر ان کی خاک سے اپنے اپنے بت کدے تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود مومن بغیر
خشت بند از خاک شاں معمار دیر

علامہ نے مسلمانوں کو ان کی ملی وحدت کا احساس دلایا۔ ان پر واضح کیا کہ وہ قوم رسول ہاشمیؐ ہیں۔ یعنی ان کی قومیت مصطفوی ہے اور ان کی جمعیت کے استحکام کا باعث قوت دین ہے۔ آپ نے فرمایا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!ا

قوت دیں سے علامہ کی مراد نکتہء توحید تھا۔ آپ ارشاد کرتے ہیں۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

کلامِ اقبال کا بیشتر حصہ دراصل اسی نکتے کی وضاحت ہے۔ لیکن کلامِ اقبال کی طرف رجوع کرنے سے پیشتر اس سلسلے میں حضرت علامہ کے ایک خطبہء صدارت کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ یہ خطبہء صدارت مسلمانانِ لاہور کے ایک جلسے میں دیا گیا جو ۳ جون ۱۹۳۱ء کو موچی دروازہ کے بیرونی باغ میں منعقد ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"برادرانِ اسلام! گزشتہ چالیس پچاس سال سے مسلمانوں کے متعلق ہندوستان میں جس قسم کے خیالات ظاہر کئے جا رہے ہیں، ان میں مسلمانوں کے لئے عبرت و بصیرت کا مستقل سرمایہ موجود ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان واقعات کا پیغام سمجھیں۔ چونکہ مسلمان منتشر ہیں، اس لئے یہاں کی ہر قوم مسلمانوں سے عناد رکھتی ہے۔ یہ صورت حال قابلِ افسوس ہے۔ تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لئے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو۔ اب ایک تدبیر محمدؐ عربی کی بھی آزماؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اتحاد امتی حجتہ قاطعہ"۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو۔ اگرچہ اب تک کی تمام تدابیر ناکام ثابت ہو چکی ہیں، لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا یہ نسخہء شفا کبھی ناکام نہیں ہو گا۔ اتحاد کامیابی کا سرچشمہ ہے اور حصولِ اتحاد کا راز "واعتصموا بحبل اللہ جمیعا" کی اطاعت میں مضمر ہے۔ اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہی وہ رسی ہے۔ اگر یہ دل میں اتر جائے تو دونوں جہانوں کی کامیابیاں تمہارے قدموں میں ہیں۔

علامہ کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دل و دماغ سے غیر اللہ کا تسلط ختم کر کے صرف اللہ کی حاکمیت تسلیم کرے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اللہ کی حاکمیت سے مراد عوام کی حاکمیت ہے کیونکہ اللہ کی رضا کا اظہار عامتہ الناس کی آواز کے ذریعے ہوتا ہے۔ مگر غیر اللہ کی صورتیں لاتعداد ہیں اور انہیں نیست و نابود کر کے اللہ کی حاکمیت قبول کرنے کی منزل تک پہنچنا آسان نہیں۔ اسی لئے علامہ فرماتے ہیں۔

چو می گویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

محمد الرسول اللہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نافذ کردہ آئین کا پابند ہے اور اس کی نگاہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ کے سوا کسی بھی شخصیت کی خواہ وہ کیسا ہی نظام حیات پیش کرے، قطعی کوئی وقعت نہیں۔ پس علامہ کے نزدیک توحید و رسالت محمدیہؐ کا مقصد حریت، مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ملت اسلامیہ کی تشکیل و تاسیس ہے اور اسی ملت پر مصطفوی قوم کی جمعیت کا انحصار ہے۔

لیکن اس تشریح کے باوجود علامہ کو احساس تھا کہ نکتہ ء توحید کی وضاحت الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ آپ "خطاب بہ جاوید" میں نوجوانان ملت سے مخاطب ہو کر نہایت عجز سے فرماتے ہیں ؎

گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب
نکتہ ء دارم کہ ناید در کتاب!
گر بگویم می شود پیچیدہ تر
حرف و صوت او را کند پوشیدہ تر
سوز او را از نگاہ من بگیر
یا ز آہ صبح گاہ من بگیر!

ان اشعار سے ثابت ہوا کہ جب علامہ، اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں ع

جوانوں کو مری آہ سحر دے!

تو دراصل آہ سحر سے ان کی مراد یہی دعا ہے کہ خداوندا! مصطفوی قوم کے نوجوانوں کو نکتہ ء توحید سمجھنے کی توفیق عطا کر۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اے نوجوان کلمہ ء توحید صرف زبان سے کہنے پر اکتفا مت کر۔ اگر تو اسے ادا کرنا چاہتا ہے تو دل و جان سے ادا کر تاکہ تیرے جسم کے روئیں روئیں سے توحید کی خوشبو آسکے۔ کلمہ ء توحید میں غیر اللہ کی قطعی کوئی گنجائش نہیں اس لئے اُس کے اندر درویشی اور حاکمیت، دونوں پنہاں ہیں۔ کلمہ ء توحید محض گفتار نہیں، بلکہ یہ تو باطل کو مٹانے کے لئے ایک تلوار ہے۔ جس کسی میں بھی توحید کا سوز پیدا ہو جاتا ہے، وہ اللہ کی صفت قہاریت کا مظہر بن جاتا ہے۔ پس کلمہ ء توحید محض کلمہ نہیں بلکہ ضرب کاری ہے۔

لا الہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں
لا الہ از غیر حق نا آگہی است

اندر او درویشی و شاہنشی است
ایں دو حرف لا الہ گفتار نیست
لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است
لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

جب تک مسلمان اپنے کردار کی تاریکی کو توحید کی ضیاء سے منور نہیں کرتا' اس کا مقام اس کی اپنی نگاہ سے پوشیدہ رہے گا۔

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام!

بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہ کے نزدیک توحید و رسالت محمدیہؐ کا مقصد ملت اسلامیہ کی تشکیل و تاسیس ہے۔ لیکن کوئی بھی نظام ملت آئین کے بغیر معرض وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ آئین قوم مصطفوی کیا ہے؟ قرآن --- جس کے متعلق علامہ فرماتے ہیں۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ!

علامہ کی رائے میں انسان کے معاشی امراض کا بہترین علاج قرآن حکیم تجویز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ کے ایک خط مورخہ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کا اقتباس ملاحظہ ہو جو اخبار "زمیندار" میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں کسی نے علامہ کے متعلق یہ تحریر کیا تھا کہ اگر اشتراکی خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر علامہ اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتے ہیں۔ اشتراکی نظام حکومت کی بنیاد کارل مارکس کے نظریات ہیں اور کارل مارکس کے نظریات کو عام فہم زبان میں سوشلزم یا کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی علامہ کی "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔ علامہ نے اس تحریر کی تردید میں لکھا کہ میرے نزدیک اشتراکی خیالات رکھنا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ آپ نے فرمایا:

"میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے' اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی

لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر نتائج سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جا۔ جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں---- روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم' دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے.... شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بناء پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے' اور اس مدعا کے حصول کے لئے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف حضرت شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے "فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں' اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے معاشی نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو..... بھارت اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں' ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہو۔"

یہ درست ہے کہ بحیثیت شاعر حضرت علامہ نے اپنے کلام میں ان قوتوں کی عکاسی کی جو ان کی ہمعصر دنیا میں بین الاقوامی طور پر برسرِ عمل تھیں۔ انھوں نے مغرب کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام، ملوکیت، آمریت اور اشتراکیت کے موضوعات پر بہت کچھ تحریر کیا لیکن ساتھ ساتھ وہ اپنے ذاتی نظریات بھی، جو قرآن سے اخذ کردہ تھے، مسلمانوں کے روبرو پیش کرتے رہے۔ آپ اپنی مشہور نظم "اشتراکیت" میں فرماتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار!
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار!
جو حرف "قُلِ العَفو" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

علامہ کے نزدیک قرآن ایک زندہ معجزہ ہے کیونکہ اس کی آیات کی تعبیر ہر زمانے، ہر دور اور ہر نسل کی ضروریات کے مطابق کی جا سکتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تجھ میں مسلمانوں کا سا حوصلہ ہے تو پہلے اپنے ضمیر پر نگاہ ڈال اور پھر قرآن کا مطالعہ کر۔ اس کی آیات میں سینکڑوں انقلاب پوشیدہ ہیں اور اس کی ہر آن میں ہزاروں دور لپٹے ہوئے ہیں۔ عصر حاضر کی اصلاح کے لئے تو اس کے صرف ایک ہی نکتے کی تشریح کافی ہے۔ لیکن تو اس نکتے کو تبھی سمجھ سکتا ہے جب تیرے سینے میں 'معنی رس' دل ہو۔ بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت ہے لہٰذا وہ ہر دور میں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر یہ جہاں فرسودہ ہو چکا ہے تو وہ قرآنی تعلیمات کی رہبری میں ایک نیا جہاں تعمیر کر سکتا ہے جو اس کی ضروریات اور حاجات کے مطابق ہو۔

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہان تازہ در آیات اوست
عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است

گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیات خدا است
ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

علامہ نے سرمایہ دارانہ نظام جمہوریت پر مبنی ملوکیت اور اشتراکی آمریت دونوں کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد انہیں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ناقص و فاسد قرار دیا۔ ان کی رائے میں یہ دونوں نظام انسانی زندگی کی بے چینی بڑھاتے ہیں کیونکہ دونوں یزداں ناشناس اور آدم فریب ہیں۔ ان میں سے ایک تو طبقاتی منافرت کی بنا پر قتل و غارت یعنی خروج پر آمادہ کرتا ہے اور دوسرے کا مقصد محکوموں سے خراج وصول کرنا ہے۔ گویا پتھر کی ان دو سلوں کا منتہائے نظر اپنے درمیان انسان کو پیسنا ہے۔ ایک علم دین اور فن کے خاتمہ کے درپے ہے، دوسرا انسان کے جسم سے روح کھینچنے کے علاوہ اس کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا بھی چھین لیتا ہے۔ دونوں نظام مادہ پرستی میں غرق ہیں۔ اور دونوں کا مقصد تن کو روشن اور روح کو تاریک کرنا ہے۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب!
زندگی ایں را خروج، آں را خراج
درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج!
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست
آں برد جاں را ز تن، ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل!

یہی تاثر علامہ کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں پایا جاتا ہے۔ شیطان نے یورپ کو سرمایہ دارانہ جمہوری نظام پر مبنی ملوکیت کا خواب دکھلایا جس کے باعث انسانیت حاکموں اور محکوموں میں بٹ گئی۔ اس کے قدرتی ردعمل کے طور پر اشتراکی انداز فکر پیدا ہوا جو بالآخر اشتراکی نظام کی صورت میں مسلط ہو گیا۔ شیطان کے مشیر اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تو آئندہ کے اشتراکی انقلاب سے خائف نہیں۔ وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے اشتراکیت سے قطعی کوئی

خدشہ نہیں کیونکہ میں نے اس کا توڑ فاشی آمریت کی ہیئت میں نافذ کر رکھا ہے' اور جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق ہے' اسے کوئی غارت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا خالق و محافظ میں ہوں۔ جب میں نے ایک بار اقوام مغرب کا لہو گرما دیا تو قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا نظارا ساری دنیا دیکھ لے گی۔ اگر میں کسی نظام سے خائف ہوں تو وہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیونکہ میری نگاہ میں مستقبل کا سب سے بڑا فتنہ اشتراکیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

جانتا ہے' جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ ء فردا نہیں' اسلام ہے

اس لئے وہ اپنے مشیروں کو تلقین کرتا ہے کہ تم کسی نہ کسی طرح مسلمان کی نگاہ سے آئین محمدؐ کو پوشیدہ رکھو۔ اسے گمراہی کے رستوں پر گامزن کرتے رہو تاکہ وہ محروم یقین رہے۔ عالم کردار سے بیگانہ رہے اور زندگی کی تگ و دو میں اس کے سب مہرے مات ہوں۔

قرآن کا اقتصادی پہلو جس کی طرف علامہ مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں' مختصراً کیا ہے؟ علامہ کی رائے میں انسان کے معاشی امراض کا جو علاج قرآن تجویز کرتا ہے' اس کی اساس خدا کی نفی اور طبقاتی منافرت پر قائم نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کے خالق کل ہونے پر اقرار اور انسانی اخوت پر رکھی گئی ہے بہ الفاظ دیگر قرآن کا انداز نظر منفی نہیں بلکہ مثبت ہے' لہذا وہ شخصی ملکیت کے بنیادی انسانی حق کو تسلیم کرتے ہوئے کسی فرد کو اس قدر سرمایہ اکٹھا کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسروں کے لئے استحصال کا باعث بن سکے۔ قرآن نے اکتناز یعنی اجتماعی حقوق نظر انداز کر کے دولت کو خزانہ کرنا اور احتکار یعنی ناجائز وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا' دونوں حرام و ممنوع قرار دیئے ہیں۔

قرآنی لغت کی زبان میں اصطلاح اقتصاد' جس کا ماخذ "قصد" ہے' بمعنی میانہ روی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی بذریعہ اعتدال محنت و سرمایہ کا صحیح توازن برقرار رکھنا۔ علامہ فرماتے ہیں۔

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوف سلطان و امیر
عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

(اپنے اندر اخلاص کی صفت پیدا کر یعنی ہر حالت میں اللہ کی رضا مد نظر رکھ۔ اور

سلطان و امیر کا خوف اپنے دل سے نکال دے۔ قہر و رضا کے عالم میں عدل ملحوظ خاطر رکھ اور تونگری و مفلسی کی صورتوں میں میانہ روی اور اعتدال کا رستہ اختیار کر)

مسلمان صرف اللہ کی حاکمیت کے اصول کا قائل ہے اس لئے آئین قرآنی کے مطابق کسی ایک مخصوص طبقے کی حکمرانی خواہ وہ سرمایہ داروں پر مشتمل ہو خواہ مزدوروں پر، اس اصول کے منافی اور ناجائز ہے۔ آئین قرآنی کا ہدف انسان کے بنیادی حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسے متوازن معاشی نظام کا نفاذ ہے جس میں کوئی ایک کسی دوسرے کے لئے استحصال کا باعث نہ بن سکے۔ پس قرآن سرمائے کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے ربا، قمار وغیرہ کو ممنوع قرار دیتا ہے اور قانون میراث، زکوٰۃ، صدقہ، عشر وغیرہ کا نظام تجویز کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اجتماعی معیشت کے لئے انفاق کے سلسلے میں ریاست کو ایسے اختیارات بھی آئین قرآنی کی رو سے تفویض کئے جا سکتے ہیں جن کے ذریعے دولت کی متوازن تقسیم ہو سکے۔ مثلاً علامہ نے اپنے مندرجہ ذیل شعر۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

میں سورۃ بقرہ کی اس قرآنی آیت کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

"وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں۔ قل العفو، یعنی ان سے کہئے کہ وہ، جو تمہاری حاجت سے زائد ہے۔"

سورۃ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جس کو زیادہ روزی دی ہے، وہ اپنی روزی کو زیردستوں پر لٹا دیں تاکہ اس روزی میں سب برابر ہو جائیں، پھر کیا یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں۔"

پھر سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور وہ لوگ جو ایسی نعمت میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے ہرگز خیال نہ کریں کہ یہ بخل ان کے لئے اچھا ہو گا، بلکہ یہ ان کے لئے بہت برا ہے۔ قیامت کے روز اسی چیز کا جس کا انہوں نے بخل کیا، طوق انہیں پہنایا جائے گا۔"

پھر سورۃ الذاریات میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور رکھنے والوں کے مال میں، نہ رکھنے والوں کا حصہ ہے۔"

یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآنی احکام کی نوعیت اخلاقی ہے۔ گویا قرآنی احکام کا مقصد یہ ہے

کہ مسلمان ریاست کے قانونی جبر کے ذریعے نہیں بلکہ رضاکارانہ طور پر ان کی تعمیل کریں۔ مگر یہ نظریہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ ہر ریاست کے سیاسی، معاشی اور قانونی نظام کے پس منظر میں بعض معروف اخلاقی اصول ہوتے ہیں۔ اگر انسان اپنی انفرادی کمزوریوں کے باعث رضاکارانہ طور پر اخلاقی احکام کی پابندی نہ کر سکے تو ریاست کو اجتماعی بہبود کی خاطر ان احکام کی تعمیل کروانے کے لئے قانونی جبر کے ذرائع استعمال کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

قرآن کے سرسری مطالعے سے ظاہر ہے کہ وہ بنیادی انسانی حقوق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کسی فرد کو دوسروں کے لئے استحصال کا باعث بننے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح قرآنی احکام کی رو سے ریاست کا بھی فرض ہے کہ وہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات اور حاجات پوری کرنے کے لئے وسائل مہیا کرنے کی کوشش کرے، لہٰذا اس سلسلے میں وہ جو اقدام بھی اٹھائے گی، قرآن کے منافی تصور نہیں ہو سکتے بلکہ عین مطابق ہوں گے۔ رسولؐ اللہ کی سیرت اور خلفائے راشدین کے عمل سے ظاہر ہے کہ اسلام میں سرمایہ داری کی قطعی کوئی گنجائش نہیں، اسی لئے علامہ فرماتے ہیں۔

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

علامہ نے جب برصغیر میں مصطفوی قوم کے لئے آزاد ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا تو ان کا مقصد اس آزاد ریاست میں دراصل اسلامی معاشی نظام جمہوریت کا نفاذ تھا۔ اس سلسلے میں قائداعظم کے نام ان کے ایک خط مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ علامہ نے قائداعظم کو تحریر کیا:

"مجھے یقین کامل ہے کہ اسلامی ہند کی نزاکت حالات کا آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ لیگ کو انجام کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ وہ مسلمانوں کے صاحب ثروت طبقہ کی نمائندہ رہے یا مسلم عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرے جنہیں اب تک بجا طور پر لیگ میں کوئی وجہ دلکشی نظر نہیں آئی۔ میری ذاتی رائے میں کوئی سیاسی جماعت جو مسلم عوام کی معاشی بہبود کی ضامن نہ ہو، ان کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کرنے لگے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی غربت و افلاس کا باعث ہندو ساہوکاری اور سرمایہ داری ہیں..... جواہر لال کا لادین سوشلزم ان کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ کیوں کر حل کیا جائے۔ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف

ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر ایسی کوشش نہ کی گئی تو مسلم عوام پہلے کی طرح لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور جدید تجربات کی روشنی میں فقہ اسلامی کا ارتقا ممکن ہے۔ شریعت اسلامیہ کے عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی قانون صحیح طور پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو کم ازکم ہر فرد کی بنیادی ضروریات و حاجات پوری کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ایسا تبھی ممکن ہے جب اس ملک میں آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کو معرض وجود میں لایا جا سکے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسے ہی مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں.... اسلام کے لئے معاشی جمہوریت کی کسی قابل قبول شکل میں ترویج' جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو' حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہو گا..... لیکن جیسے میں اوپر ذکر کر چکا ہوں' اسلامی ہند میں ان مسائل کے حل باآسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم اشد ضروری ہے.... کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آن پہنچا؟ میرے خیال میں جواہر لال کے لادین سوشلزم کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔"

اسلامی معاشی جمہوریت کے اصول کی وضاحت اگر اقتصادیات کی جدید اصطلاحوں کی روشنی میں کی جائے تو اس سے مراد "مخلوط معیشت" لی جائے گی' یعنی ایسی معیشت جو نجی کوشش کو ایک متعین حد تک قبول کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ریاستی تحویل کا اصول بھی نافذ کرے۔ بہ الفاظ دیگر اسلام کے نزدیک اجتماعی معیشت کا نصب العین طبقاتی منافرت' قتل و غارت یا انقلاب کے ذریعے نہیں بلکہ مساوات' اخوت اور بہ رضائے عوام یعنی جمہوری طرز عمل ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ قبل جب قائداعظمؒ سے سوال کیا گیا کہ اس نئی ریاست کا معاشی نظام کیا ہو گا تو انہوں نے فرمایا:

"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ اس معاملہ میں حکومت کیا کرے گی۔ ذاتی طور پر میرا یقین ہے کہ موجودہ زمانے میں بنیادی اور کلیدی صنعتوں کو ریاستی تحویل اور انتظام میں ہونا چاہیے۔ اس کا اطلاق بعض عوامی ضروریات اور افادوں کے شعبوں پر بھی ہوتا ہے لیکن کلیدی صنعت کون سی ہے اور عوامی افادہ کون سا ہے' اس کا فیصلہ تو واضعین قانون ہی کر سکتے ہیں' میں نہیں کر سکتا۔"

اسلام کا مقصود ایک صالح اور متوازن معاشی نظام کے ذریعے دراصل درمیانے طبقے کی

فلاحی ریاست کا قیام ہے' یہی وجہ ہے کہ اسلامی ضابطہ ء اخلاق میں کسی فرد کی عزت و تکریم کا انحصار اس کی امارت یا غربت پر نہیں بلکہ اس کی شرافت پر ہے' لٰہذا قرآنی احکام کا مقصد یہ ہے کہ غریب کو درمیانے طبقے تک پہنچنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں اور امیر کو درمیانے طبقے سے تجاوز کرنے سے روکا جائے۔ یہی اعتدال کا راستہ ہے جو آسان بھی ہے اور قابل عمل بھی۔

نئی نسل کے لئے پیغام

پس اپنے زمانے کے نوجوان کے لئے علامہ کا پیغام یہ تھا کہ اگر خدا تجھے صاحب نظر بننے کی توفیق عطا کرے تو اس دور کو دیکھ جو تیرے سامنے آ رہا ہے۔ عقلیں خدا کے خوف سے آزاد اور دل گداز عشق سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ نگاہوں میں شرم و حیا باقی نہیں رہی اور سراسر مجاز میں گم ہیں۔ علم و فن' دین و سیاست اور عقل و دل سب کے سب مادہ پرستی کے طلسم کے اسیر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے مسلمانوں کی حالت زار پر مدتوں فکر کیا ہے' تب جا کر اس قابل ہوا ہوں کہ انہیں انقلاب کا پیغام دے سکوں۔

گر خدا سازد ترا صاحب نظر
روزگارے را کہ می آید نگر!
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز
چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن' دین و سیاست' عقل و دل
زوج زوج اندر طواف آب و گل!
درمیان سینہ دل خوں کردہ ام
تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ دنیوی علوم بے شک حاصل کر' لیکن یہ نہ بھول کہ دین کا راز سچ بولنا اور جائز طریقوں سے رزق حاصل کرنا ہے۔ دین کیا ہے؟ ہر لحظہ جستجو کرتے رہنا! اس کا آغاز ادب سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا عشق ہے۔ اے نوجوان! گل کی آبرو اس کے رنگ اور خوشبو سے ہے لٰہذا جو بے ادب اور بے رنگ و بو ہو گا' اس کی کوئی آبرو نہیں ہو سکتی۔ جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو رنج سے میرا دن' رات کی ظلمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

دیدہ سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغازش ادب!
آبروے گل ز رنگ و بوے اوست
بے ادب بے رنگ و بو' بے آبروست!
نوجوانے را چو بینم بے ادب
روز من تاریک می گردد چو شب

تو اگر صاحب قرآن ہوتے ہوئے بھی بے ذوق طلب ہے تو نہایت افسوس کا مقام ہے۔

صاحب قرآن و بے ذوق طلب
العجب' ثم العجب' ثم العجب!

یاد رکھ! جو مسلمان غیروں کے نظریات سے متاثر ہیں' وہ سراب سے چشمہ ء کوثر نکالنے کی کوشش میں ہیں۔ گویا وہ تقلید تو غیروں کی کر رہے ہیں مگر توقع یہ رکھتے ہیں کہ اس عاریتاً لی ہوئی طرز حیات سے انہیں وہ برکات حاصل ہو جائیں گی جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ایسے لوگ' سب کے سب' دین کے راز سے بے خبر ہیں کیونکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف حسد' بغض اور کینہ بھرا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے خواص کے طبقے سے خیر و خوبی کی امید رکھنا حرام ہے۔ میں نے اگر صدق و صفا کہیں دیکھی ہے تو صرف عوام میں دیکھی ہے۔ تو ان اہل کیں سے دور رہ اور اہل حق کی صحبت میں بیٹھ کیونکہ گدھ کی رسم و آئین مردار پر زندہ رہنا ہے' لیکن شاہین کی' جو اپنا مارا ہوا شکار کھاتا ہے' سطوت، پرواز اور شے ہے۔

ہم مسلمانان افرنگی مآب
چشمہ ء کوثر بجویند از سراب!
بے خبر از سر دین اند ایں ہمہ
اہل کین اند' اہل کین اند ایں ہمہ
خیر و خوبی بر خواص آمد حرام
دیدہ ام صدق و صفا را در عوام
اہل دیں را بازداں از اہل کیں
ہم نشین حق بجو با او نشیں

کرگساں را رسم و آئیں دیگر است

سطوت پرواز شاہیں دیگر است!

پس اس دنیا میں اگر تو اپنا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو ع

بحق دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو!

علامہ چاہتے تھے کہ مصطفوی قوم کے جوان جسور و غیور ہوں۔

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور

قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

اسی لئے انہوں نے اپنے زمانے کے نوجوانوں کو اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی۔ علامہ نے انہیں احساس دلایا کہ ان کا دین ہے، جستجوئے مسلسل۔ ان کی سیاست ہے، حاکمیت اللہ اور ان کی معیشت ہے، آئین قرآنی۔ جب یہی نوجوان پیغام اقبال سے متاثر ہوئے تو انہوں نے قائداعظمؒ کی قیادت میں "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ! کا نعرہ بلند کر کے مصطفوی قوم کے لئے وطن حاصل کر لیا۔

پاکستان کا مقصد

آج پاکستان قائم ہوئے بائیس برس ہونے کو آئے ہیں۔ اس دوران مسلمانوں کی نئی نسل جوان ہو گئی ہے۔ کیا اس نئی نسل کے نوجوانوں نے علامہ کی شخصیت اور تعلیمات سے کوئی اثر قبول کیا ہے؟ یہ دعویٰ بار بار دہرایا گیا ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے، لیکن جس مقصد اور نصب العین کے حصول کی خاطر پاکستان معرض وجود میں لایا گیا تھا، نوجوانوں پر اس کی وضاحت کرنے کی توفیق ہم میں سے کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت

وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

پاکستان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اس خطہ ء زمیں پر مصطفویؐ قوم کو ہندو ساہو کار اور سرمایہ دار سے نجات دلا کر اس کی روٹی کا مسئلہ اسلامی معاشی جمہوریت کے نفاذ کے ذریعے حل کیا جائے۔ پاکستان کے قیام کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ یہاں ہندوؤں کی جگہ مسلمان ساہوکار اور سرمایہ دار بٹھا دیئے جائیں۔ جب کسی قوم کی قیادت اپنے نصب العین سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کرتی ہے تو اس سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرے گی جن سے نوجوانوں کے لئے وجود ملت کا بنیادی مقصد سمجھنا آسان ہو

جائے۔ گزشتہ برسوں کی اس کوتاہی کا نتیجہ ہم نے حال ہی میں دیکھا ہے۔

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن
کہیں ترسا بچوں کی چشم بیباک
ردائے دین و ملت پارہ پارہ
قبائے ملک و دولت چاک در چاک
مرا ایماں تو ہے باقی و لیکن
نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک!

لیکن اگر ہم ایک بار پھر تجدید عہد کریں۔ ایک بار پھر انہی عشق جسور اور فقر غیور کے جذبوں سے سرشار ہو جائیں جن سے پاکستان حاصل کیا گیا تھا تو ہماری تمام مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور
فیض نظر کے لئے ضبط سخن چاہئے!
حرف پریشاں نہ کہہ اہل نظر کے حضور
خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور!

اب بھی پانی سر سے نہیں گزرا۔ اب بھی پیغام اقبال ان نوجوانوں کی طرح جوان و تروتازہ ہے۔ آج بھی علامہ ان سے یہی کہہ رہے ہیں۔

حریم تیرا، خودی غیر کی، معاذ اللہ!
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ "تو" تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات!

آج بھی جہان تازہ، علامہ کی آہ صبح گاہ یعنی نکتہء توحید کو حقیقی طور پر سمجھنے اور اس پر عمل کرنے ہی سے معرض وجود میں لایا جا سکتا ہے۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا!
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے!
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا

وہ مشت خاک ابھی آوارگان راہ میں ہے!
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہان تازہ مری آہ صبح گاہ میں ہے!
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے!

○

اقبال اور نظریاتی بحران ☆

علامہ اقبال کے ایک معروف قول میں جسے آپ نے ۱۹۱۰ء میں ترتیب دیا' شاعر اور سیاست دان کی تمیزیوں کی گئی ہے:

"قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں۔ لیکن ان کی خوشحالی یا موت سیاست دانوں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوتی ہے"۔

اس قول کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہے برصغیر ہند میں اسلامی عصبیت کی بنا پر مسلم قومیت کا تصور علامہ ہی کے دل میں پیدا ہوا۔ اس تصور کی محرک جو خارجی صورت حالات تھی' اس کی نوعیت کی تھی؟ برصغیر ہند میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد کیفیت یہ تھی کہ ہندو غالب اکثریت میں تھے اور دس کروڑ مسلمان اقلیت سمجھے جانے لگے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نظریاتی بعد اس قدر تھا کہ آئے دن برصغیر کے کسی نہ کسی حصے میں فسادات برپا ہوتے تھے۔ ہندو تعلیمی' تمدنی اور اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں سے آگے نکل چکے تھے۔ برصغیر کی داخلی تجارت پر ہندو قابض تھے اور خارجی تجارت پر انگریز۔ نتیجتہً ہندو دولت مند تھا اور مسلمان غربت کا شکار۔ مسلمانوں کے آپس میں اتحاد کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ برصغیر کے مختلف صوبوں میں منتشر تھے۔ اور جن صوبوں میں ان کی واضح اکثریت تھی' وہاں بھی وہ نسلی' لسانی اور علاقائی اعتبار سے ایک دوسرے سے دور تھے۔ ان حالات میں مغربی نظریات مثلاً نیشنلزم' سیکولرزم' کانسٹی ٹیوشنلزم' سوشلزم وغیرہ جو برصغیر میں وارد ہو چکے تھے اور جنہیں ہندوؤں نے اپنا لیا تھا' مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا باعث بنتے نظر نہ

☆ ۲۱۔ اپریل ۱۹۷۱ء یوم اقبال کے موقع پر خطبۂ صدارت۔ واپڈا آڈیٹوریم' لاہور

آتے تھے۔ علامہ نے ان بیرونی نظریات کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ٹھکرا دیا۔ آپ نے ان بیرونی تصورات کو محض ذاتی تعصب کی بنا پر رد نہیں کیا بلکہ منطقی طور پر انہیں اسلام سے کمتر پایا۔ اس موازنے نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ ء حیات ہے اور اس میں مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

نیشنلزم کا تصور جس سے مراد نسل' لسان اور علاقے کے اصول پر انسانوں کی گروہ بندی ہے' برصغیر ہند کے مسلمانوں کی شیرازہ بندی کا متحمل کیسے ہو سکتا تھا جبکہ اسی اصول کے تحت بالخصوص مسلم اکثریتی خطوں میں بنگالی' پنجابی' سندھی' پٹھان اور بلوچ کے ناموں سے انسانوں کے مختلف گروہ آباد تھے۔ اس قسم کی قومیت کے تقاضے تو علاقائی خواہشات کے احترام اور ان کے باہمی تعلق میں ان کے منشا کے مطابق توازن پیدا کرنے سے پورے کیے جا سکتے تھے بشرطیکہ مسلمانوں کی شیرازہ بندی کسی ایسے اصول کے ذریعے کی جائے جو ان کی متفرق قومیتوں یا علاقائی تمدنوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان میں اخوت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کر دے۔ منطقی طور پر ان میں اخوت اور اتحاد کا یہ جذبہ وہی قدر پیدا کر سکتی تھی جو ان میں مشترک تھی' اور وہ قدر مشترک کونسی تھی؟ ان کا روحانی مطمح نظر یعنی اسلام پر ان کا ایمان۔ علامہ کو توقع تھی کہ آزادی کے لئے ان میں سیاسی جدوجہد کی تاریخی یکسانیت کی بناء پر اگر مسلمانان برصغیر ہند تعمیر قوم کی خاطر اسلام کو ایک سیاسی قوت کے طور پر بروئے کار لا کر آزاد خطہ ء زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مستقبل میں اسی اصول کے تحت مسلمانان عالم کے اتحاد کے ذریعے اسلامستان وجود میں لایا جا سکے گا۔ علامہ کا تصور کسی جذباتی فلسفے پر نہیں بلکہ منطقی استدلال پر مبنی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ نیشنلزم کی بنیاد پر دنیائے اسلام کی شیرازہ بندی ممکن نہیں' بلکہ اس تصور کا فروغ تو مستقل طور پر مسلم قومیتوں کو منتشر کر دے گا۔ اگر نیشنلزم اتحاد کا ذریعہ بن سکتا تو یہودیوں کے دباؤ کے زیر اثر ہی کم از کم عرب قومیتیں تو متحد ہو جاتیں لیکن مشرق وسطیٰ کے حالیہ سیاسی تجربے نے ثابت کر دیا کہ نسل' لسان' تمدن یا علاقے کے مشترک ہونے کے باوجود اس کا الحاق یا وفاق نیشنلزم کے ذریعے ممکن نہیں۔

کیا سوشلزم جو دنیا بھر کے غریبوں کے اتحاد کا داعی ہے' برصغیر ہند کے پسماندہ مسلمانوں کی ہندوؤں کے مقابلے میں شیرازہ بندی کر سکتا تھا؟ افسوس تو یہ ہے کہ انسانی فطرت نے آج تک انسانی اخوت و مساوات کے حصول کی خاطر جو تصورات بھی روحانی مطمح نظر کو رد کر کے وضع کیے ہیں' وہ بجائے خود چونکہ منافقت پر مبنی ہیں اس لئے خام ہیں۔ مثلاً سیکولرزم

کے لغوی معنی ہیں کسی ریاست کا بلاتمیز مذہب و نسل اپنے تمام شہریوں کی دنیاوی یا مادی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہنا' لیکن کیا دنیا میں کوئی ایسی سیکولر ریاست کہیں ہے جو حقیقی معنوں میں بلاتمیز مذہب و نسل اپنے تمام شہریوں کی دنیاوی یا مادی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہو؟ بھارت اپنے آپ کو سیکولر کہتا ہے' لیکن اپنے مسلمان شہریوں کی نسل کشی سے باز نہیں آتا۔ امریکہ اپنے آپ کو سیکولر کہتا ہے' مگر سیاہ فام شہریوں سے اس کا کیا سلوک ہے؟ اسی طرح کانسٹی ٹیوشنلزم سے مراد دستوری حکومت لی جاتی جو ڈیموکریسی یا جمہور کی رضا کے اصول پر قائم ہو۔ لیکن دنیا میں کونسی ایسی ڈیموکریسی ہے جس میں حقیقی اقتدار ان چند گنے چنے سرمایہ داروں یا جاگیرداروں کے جتھے کے ہاتھ میں محفوظ نہیں جن کے قبضے میں ملکی وسائل دولت ہوتے ہیں۔ سوشلزم میں اگر معاشی اخوت و مساوات کی بنیاد پر انسانی اتحاد وجود میں لاسکنے کی اہلیت ہوتی تو آج چین اور روس میں ایسے اختلافات موجود نہ ہوتے کہ چین کے گھیراؤ اور استحصال کی خاطر روس سوشلزم کے ازلی دشمن امریکہ سے رسم و راہ بڑھاتا اور چین کو مجبور ہو کر کیپیٹلسٹ امپریلزم کے ساتھ ساتھ روس کے رویے کی تشریح کے لئے سوشل امپریلزم کی اصطلاح وضع کرنی پڑتی۔

علامہ بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمانان برصغیر ہند کی اخوت و مساوات کا قیام نہ نسل پر ہو سکتا ہے' نہ لسان پر' نہ علاقے پر' اور نہ معیشت پر۔ آپ نے صاف کہہ دیا۔

سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

علامہ کے فلسفۂ خودی کی سیاسی تعبیر یہی ہے کہ انہوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر برصغیر ہند کے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ اسلامی عصبیت کی بنا پر ہی مسلم قوم وجود میں آ سکتی ہے اور اسلامی تعلیمات کی تخلیقی تعبیر ہی سے وہ اپنے آج کے تمام سیاسی' دستوری یا اقتصادی مسائل حل کر سکتی ہے۔ آپ نے اس حالت میں مسلمانوں کو پختہ افکار دیے جبکہ ہر طرف انتشار کا دور دورہ تھا۔ اس ماحول کی تصویر آپ نے یوں کھینچی ہے۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام!

مردہ، لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام!

علامہ کے نزدیک قوموں کی حیات کا انحصار پختہ عقائد پر ہوتا ہے۔ اور پختہ عقائد کا تعین تبھی ہوتا ہے جب کسی قوم میں فکر و تدبر کا سلیقہ ہو۔

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر!
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر!

جس طرح روشنی کی عدم موجودگی تاریکی کا باعث بنتی ہے، اسی طرح پختہ عقائد سے تہی عقل فکر خام وجود میں لاتی ہے اور فکر خام زندہ قوموں کو "آناً فاناً" کفن پوش کر دیتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

قوموں کی حیات ان کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغ چمن کو
ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردک ناداں کے کفن کو؟

علامہ کو یقین تھا کہ اگر مسلمانوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی تمدنی روایات کے تاریخی تسلسل سے عشق، جاہ و منصب یا دنیا کی مادی آسائشوں سے بے نیازی اور فقر، حق گوئی کی جرأت اور صحیح معنوں میں حریت کی اخلاقی خصوصیات پیدا کی جا سکیں تو وہ من حیث القوم متحرک ہو سکتے ہیں اور ان کے عمل کا ہر پہلو تخلیقی ہیئت اختیار کر سکتا ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے نوجوانان ملت کو ہمیشہ یہی تلقین کی کہ ان کی زندگی کسی ندی کی طرح ہمکنار خاک ہو کر مت بہے بلکہ اپنے تمدن کے تاریخی تسلسل کے زور دروں سے فوارے کی طرح پھوٹتی چلی جائے۔

یہ آبجو کی روانی، یہ ہمکناری خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
ادھر نہ دیکھ، ادھر دیکھ اے جوان عزیز!
بلند زور دروں سے ہوا ہے فوارہ

علامہ کے نزدیک تخلیقی عمل کے بجائے اندھا دھند تقلید کے اصول کو اپنانا یا اغیار کے

افکار و تخیل کے لئے دست سوال دراز کرنا مسلمانوں کو ہمیشہ جمود غلامی اور محکومی کی طرف لے جاتا رہا ہے۔ پس آپ نے ان بے غیرت مسلمانوں کو جو بیرونی نظریات سے متاثر تھے، ان کی غیرت کا واسطہ دلا کر کہا۔

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟
دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے

جونہی مسلمانان برصغیر ہند نے زمانے کو اپنی نظر سے دیکھنا شروع کیا، شاعر کے دل میں ایک قوم نے جنم لے لیا۔ اس قوم کی تاریک سحر میں قائداعظمؒ کی قیادت نور بن کر آئی اور افلاک منور ہو گئے۔ گویا اسلامی عصبیت کی بنا پر مسلم قومیت کا تصور علامہ کے دل میں پیدا ہوا اور اس کے خوشحال مستقبل کے حصول کی خاطر پاکستان قائداعظمؒ جیسے سیاست دان کے ہاتھوں وجود میں آیا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی اساس پر قائم کیا گیا اور اس کے قیام کے وقت اس کی نظریاتی اساس قطعی واضح تھی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تخیل جس کے ذریعے پاکستان کا طلوع ممکن ہوا، اس کی آب و تاب کم کیوں ہوتی چلی گئی اور وہ تابع غروب کیوں ہونے لگا؟ فکر اقبال کے فسوں اور عمل قائداعظمؒ کے اعجاز سے جو سونے کا ہمالہ تعمیر ہوا تھا، وہ کس تیزاب کے اثر سے مٹی کا ڈھیر بننے لگا؟

پاکستان مسلم قوم کی معاشی خوشحالی اور فلاح و بہبود کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ قوموں کی خوشحالی یا فلاح و بہبود کا انحصار ملکوں کی سالمیت پر ہوتا ہے۔ پاکستان کی سالمیت کا باعث اس کی نظریاتی اساس ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس نظریاتی اساس کو زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے ریاست شروع ہی سے مناسب قدم اٹھاتی لیکن اس طرف قطعی توجہ نہ دی گئی۔ صوبوں کی خود مختاری کی حدود، مرکز کے اختیارات یا علاقائی مفادات کے تحفظ پر تو لے دے ہوتی رہی مگر اساسی نظریاتی ذمہ داریوں کا احساس کسی کو نہ تھا۔ پاکستان اپنے مختصر سے ابتدائی دور سے نکل کر نوکر شاہی کے تسلط میں آیا اور مضبوط آدمیوں کا عہد شروع ہوا۔ اس عہد میں بھی ہوس اقتدار تو آزاد تھی لیکن تخیل پاکستان محبوس رہا۔ ایوب خاں کے زمانے میں دیدہ و دانستہ طور پر کوششیں کی گئیں کہ مسلمانان پاکستان اپنی نظریاتی اساس بھلا کر ایوب خاں کے فلسفہء انقلاب کو اپنائیں۔ یونیورسٹیوں کے نصاب سے کلام اقبال خارج کیا گیا،

سیاسیات کے شعبوں میں تحریک پاکستان یا نظریہ ٔ پاکستان کے موضوعات کو لازمی کی بجائے اختیاری بنا دیا گیا۔ تصور پاکستان کے مخالف اساتذہ مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں میں داخل کیے گئے اور مشرقی پاکستان کی یونیورسٹیوں میں بھارت نواز ہندو اساتذہ چھا گئے۔ ریڈیو، ٹیلیویژن اور اطلاعات کے دیگر محکموں میں بھی اسی قسم کے عناصر آ داخل ہوئے۔ ایوبی استبداد کی آستین میں نیشنلزم، سیکولرزم اور سوشلزم کے سانپ نشوونما پانے لگے۔ گو بظاہر ہر کسی نے لا الہ ہی کا ورد کیا لیکن بقول علامہ۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

ایوبی استبداد کی طویل رات ختم ہوئی تو قوم کا شعور پراگندہ تھا۔ بزرگ فراست سے محروم ہو چکے تھے اور نوجوان محبت سے بے نصیب تھے۔ ہر طرف ہیجان، بے یقینی اور بد اعتمادی کا دور دورہ تھا۔ سیاسی، دستوری، اخلاقی اور معاشی مسائل کی بھرمار تھی۔ کہیں سے آواز بلند ہوتی کہ اسلام پاکستان کی وحدت و استحکام کی اساس نہیں۔ کوئی کہتا کہ پاکستان ایک کثیر النسلی، کثیر اللسانی اور کثیر القومی ملک ہے لہذا اس کی اجتماعی زندگی کا کوئی بھی پہلو واحد نہیں بلکہ سب متعدد ہیں۔ علیحدگی پسندی کے ان رجحانات کو بڑھتے دیکھ کر پاکستان کے دشمن، بھارت کے کارندے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر برسر عمل ہو گئے۔ ایسے منفی رجحانات کا فروغ عموماً قوموں کے انتشار اور ملکوں کی تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے بنیادی تخیل ہی سے بیزار کر دی جائے تو وہ زندہ کیونکر رہ سکتی ہے۔

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

صدر یحییٰ خاں نے تاریخ کے ایک نہایت ہی نازک دور میں پاکستان کی قیادت سنبھالی۔ کئی سالوں کے طویل عرصے کے بعد اس ملک میں غیر جانب دارانہ طور پر انتخابات کرانے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ انتخابات کا دور بھی عجیب و غریب تھا۔ جو سیاست دان نظریہ ٔ پاکستان کی علمبرداری کا دم بھرتے تھے، وہ آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ بہ الفاظ دیگر ائمہ مساجد نفاق و افتراق کی اذانیں دینے لگے اور ان کے مقابلے میں علاقائی قوم پرستی اور سوشلزم کی اذانیں بھی بلند ہونے لگیں۔ پاکستان کے عوام نے تو صدق دلی سے بیک آواز اس خواہش کا

اظہار کیا کہ ان کی معاشی حالت بہتر بنائی جائے مگر اقتدار کے متمنی خواص نے محبت کی بجائے ہر طرف نفرت کا تیزاب پھیلا دیا۔ بہرحال، جب "اذانیں" تھمیں تو معلوم ہوا کہ کسی بھی سیاسی قائد کی اذان میں پاکستان کی سحر کا پیام نہیں کیونکہ انتخابات کے بعد جو قیادتیں منصۂ شہود پر آئیں، وہ علاقائی یا صوبائی تو یقیناً تھیں لیکن ان کی نوعیت ملی یا قومی قطعاً نہ تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کار بے نظام او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است

بلاشبہ مسلم قوم کے تصور نے ایک شاعر کے دل میں جنم لیا اور اس قوم کے خوشحال معاشی مستقبل کی خاطر ایک عظیم سیاستدان نے پاکستان حاصل کیا۔ لیکن وہ کون تھے جنہوں نے ذاتی اقتدار کی فصل کاٹنے کے لئے اس سرزمین میں منافرت کا بیج بویا جن کے ہاتھوں یہ قوم موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی اور قبائے ملک و دولت، چاک در چاک ہونے لگی۔

شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی!
ہاں، ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
براں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی!

ہمیں اس قوم کے عمل پر اعتراض نہیں۔ سیاسی قیادت کے اعمال پر اعتراض ہے۔ یہ مٹی تو زرخیز ہے، لیکن ہر آزمائش کے موقع پر اسے نم پہنچانے والے بخیل نکلتے ہیں۔ علامہ آج زندہ ہوتے تو ان سے مخاطب ہو کر یہی کہتے۔

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں گرمی یوم النشور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں، میرے جنوں کا قصور!

اگر مشیت ایزدی کو قوموں کی زندگی مقصود ہو تو ہر بیس پچیس سال بعد زندہ قومیں اپنی نظریاتی اساس کو قائم و دائم رکھنے کی خاطر تجدید عہد کرتی ہیں۔ حال ہی میں چینی قوم نے تمدنی انقلاب بپا کر کے اپنے نصب العین کی روشنی میں اپنے فکر و عمل کی تصحیح کی۔ بھارت میں بھی ہندوؤں نے حالیہ انتخابات میں کانگرس کو کامیاب کرا کے پاکستان دشمنی کے عہد کی تجدید کی۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ تخیل پاکستان کا غروب آمادہ آفتاب اس کے طلوع کا پیش خیمہ ہو؟ عین ممکن ہے، بشرطیکہ مسلم قوم پر دم ہو۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد!

علامہ فرماتے ہیں۔

جس کے پرتو سے منور رہی تیری شب دوش
پھر بھی ہو سکتا ہے روشن وہ چراغ خاموش!
مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حر کے لئے نشتر تقدیر ہے نوش!

زندہ قومیں نشتر تقدیر کی اذیت سے بے تاب تو ہوتی ہیں مگر ہمت نہیں ہارتیں کیونکہ۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

اس نازک مرحلے پر جب کہ بھارت پاکستان کو ختم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے، اس ملک کی سالمیت اور اس قوم کی وحدت کے تحفظ کا انحصار پاک فوج کے استقلال پر ہے۔ ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ پاکستان کی معاشی خوشحالی کا حصول تبھی ممکن ہے جب اس ملک کی سالمیت اور اس قوم کی وحدت برقرار رہے، اور سالمیت و وحدت کے استحکام کے لئے تخیل پاکستان کا احیاء لازمی ہے اس لئے ہم قیادت سے یہی التماس کریں گے کہ عوام نے جس صدق دلی سے اپنی معاشی حالت بہتر بنائے جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، اس کی تکمیل کی خاطر جتنی جلد ممکن ہو سکے، زرعی اصلاحات کے نفاذ کے ذریعے زمین

کی حد ملکیت مقرر کی جائے اور جو صنعتیں، بنک یا بیمہ کمپنیاں قومیائے جانے کی مستحق ہیں، انہیں قومیا لیا جائے۔ مگر یہ حقیقت فراموش نہ کی جائے کہ جس طرح جسم کو تندرست و توانا رکھنے کے لئے بنیادی ضروریات فراہمی لازمی ہے، اسی طرح اسے زندہ رکھنے کے لئے روح کی موجودگی بھی لازم ہے۔ پاکستان اور بھارت کی رقابت ایک ازلی حقیقت ہے۔ ہم بھارت کا مقابلہ اپنے زور بازو ہی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بازو بازوئے حیدر تبھی بن سکتا ہے جب اس کے پس پشت نظریہ ء پاکستان پر ہمارا مستحکم ایمان ہو۔ اگر یہ قوم اپنا چاک دامن رفو کرنا چاہتی ہے تو اسے ایک بار پھر اپنے آپ میں ڈوب کر عقیدۂ پاکستان کا سراغ پانا ہو گا۔

حقیقت ازلی ہے رقابت اقوام
نگاہ پیر فلک میں نہ میں عزیز نہ تو!
خودی میں ڈوب، زمانے سے ناامید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے در پردہ اہتمام رفو!

○

اقبال کے معاشی تصورات☆

فکر اقبال کے کسی بھی پہلو کا جائزہ لینے سے پیشتر یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کے فکر کی اساس کیا تھی، وہ کن سے مخاطب تھے، اور اپنے فکر کے عملی نفاذ کے سلسلے میں انہیں کیا توقعات تھیں۔

علامہ خود ہی فرماتے ہیں کہ ان کے فکر کی اساس قرآن ہے۔ آپ 'رموز بیخودی' کی آخری نظم بعنوان 'عرض حال مصنف بحضور رحمتہ للعالمین' میں ارشاد کرتے ہیں۔

گر دلم آئینہ ء بے جوہر است | ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردهٔ ناموس فکرم چاک کن | ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسہ ء پا کن مرا
گر در اسرار قرآں سفتہ ام | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیش خدائے عزوجل | عشق من گردد ہم آغوش عمل

(اے رسولؐ اللہ! اگر میرے دل کا آئینہ جوہر سے خالی ہے اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا بھی کچھ ہے تو آپ میری فکر کی عزت و حرمت کا پردہ چاک کر دیجئے، میرے کانٹے سے اپنی امت کے خیابان کو پاک کر دیجئے، قیامت کے دن مجھے ذلیل و رسوا کیجئے اور اپنے پائے مبارک کے بوسے سے محروم رکھیے۔ لیکن اگر میں نے اپنے کلام میں صرف قرآنی اسرار کے موتی پروئے ہیں اور مسلمانوں سے سچی باتیں کہی ہیں تو میری طرف سے خدائے عزوجل کی بادگاہ میں عرض کیجیے کہ میرا عشق حق عمل سے ہمکنار ہو!)

☆ ۲۶ جون ۱۹۷۱ء کو کراچی میں پڑھا گیا۔

لیکن علامہ مخاطب کن سے تھے؟ آپ "جاوید نامہ" کی نظم "مناجات" میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔

من کہ نومیدم ز پیران کہن دارم از روزے کہ می آید سخن!

برجواناں سہل کن حرف مرا

بہرشاں پایاب کن ژرف مرا

(میں بوڑھوں سے ناامید ہوں اور آنے والے دور کے لئے میرے پاس ایک پیغام ہے۔ نوجوانوں پر میرا کلام سہل کر دے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنا آسان بنا دے تاکہ وہ اس کے معانی سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔)

اپنے فکر کے عملی نفاذ کے سلسلے میں انہیں کیا توقعات تھیں؟ آپ "اسرار خودی" میں ارشاد کرتے ہیں۔

نغمہ ام' از زخمہ بے پرواستم من نوائے شاعر فرداستم

(میں ایک ایسا نغمہ ہوں جو دور حاضر کی مضراب سے بے نیاز ہے۔ دراصل میں ایک ایسے شاعر کی آواز ہوں جس کا دور مستقبل میں شروع ہو گا۔)

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ فکر اقبال کی اساس قرآن ہے۔ ان کا تخاطب شبان ملت سے ہے اور ان کے فکر کا عملی نفاذ ابھی ہونا ہے۔

علامہ تاریخ اسلام کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب مسلمان مغربی نو آبادیاتی طاقتوں کے غلام تھے' نفاق و افتراق کی وجہ سے ان میں باہم انتشار تھا اور معاشی طور پر وہ اپنے حاکموں کے استحصال کا شکار تھے۔ اس مایوسی کے عالم میں جبکہ مسلمانوں کا اپنا فکر جامد تھا' مغرب سے حاکم و محکوم کے تعلق کے باعث جدید تصورات یعنی نیشنلزم' پٹریاٹزم' سیکولرزم' کانسٹی ٹیوشنلزم' سوشلزم وغیرہ دنیائے اسلام میں در آمد ہو رہے تھے۔ علامہ ان سب نظریات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ خواہ اپنی جگہ کتنے ہی محمود ہوں' مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کو وجود میں نہیں لا سکتے۔ علامہ سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی قوم پرست اور بے دین مغربی جمہوریت کے مخالف تھے کیونکہ اس نے ملوکیت کو جنم دیا تھا اور ملوکیت مسلمانوں کے سیاسی' معاشی' اخلاقی اور تمدنی استحصال کا سبب تھی۔ پس علامہ کے سامنے دو مقصد تھے۔ اول' ملوکیت کے خلاف مغرب میں جو بھی تحریکیں سوشلزم یا فاشزم کی ہیئت میں اٹھیں' آپ نے اپنے کلام میں ان کے خیالات کی عکاسی کی تاکہ مسلمانوں پر واضح ہو سکے کہ دنیائے مغرب میں کیا ہو رہا ہے۔ دوم' آپ نے مسلمانوں کو

آگاہ کیا کہ مغرب کے استحصال سے ان کی نجات اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں باہم اتحاد کا جذبہ پیدا کریں کیونکہ ان کی ہر بیماری کا علاج اسلام میں موجود ہے۔

اسی نصب العین کی وضاحت کی خاطر، پہلی جنگ عظیم سے بے نیاز، علامہ "اسرار خودی" تحریر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ "اسرار خودی" ۱۹۱۵ء میں اور "رموز بیخودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ اسی دور میں علامہ نے فلسفہ ء خودی کی تشکیل کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ "خودی" کی تعمیر سے وہ ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت، شوکت، قوت اور آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک ملت اسلامیہ ایک ایسی بے مثل جماعت ہے جو بے مثل افراد میں اخوت سے وجود میں آئی ہے۔ علامہ نے بیسویں صدی میں مغرب سے درآمد شدہ غیر اسلامی تصورات کی تردید کر کے کچھ اس انداز میں اسلامی تعلیمات کا احیاء کیا جس طرح بارہویں صدی میں امام غزالی نے یونان سے اخذ کردہ غیر اسلامی تصورات کو رد کر کے علوم اسلامیہ کا احیاء کیا تھا۔

علامہ "علم الاقتصاد" سے کتنی دلچسپی رکھتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی سب سے پہلی تصنیف اردو نثر میں اسی عنوان کے تحت ایک کتاب تھی جو ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب غالباً اس ارادے سے تحریر کی گئی تھی کہ اردو شناس طبقے کی توجہ "علم الاقتصاد" کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اس کتاب میں علامہ کے اپنے معاشی تصورات موجود نہیں بلکہ اس علم پر یہ محض ایک ابتدائی کتاب ہے۔ بہرحال، دیباچے میں علامہ تحریر کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں جن قوموں کو اپنی اجتماعی معیشت کو بہتر بنانے کا احساس نہیں، ان کا زندہ رہ سکنا محال ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران روس میں انقلاب آیا اور وہاں اشتراکی نظام قائم ہوا۔ چونکہ یہ نظام ملوکیت کے خلاف رد عمل تھا، اس لئے علامہ کے کلام کے اس دور میں اس کی عکاسی کی گئی۔ "پیام مشرق" ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے باب "نقش فرنگ" (یعنی دنیائے فرنگ میں کیا ہو رہا ہے) میں چند نظمیں بعنوان پیام، صحبت رفتگان (در عالم بالا) محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مرد مزدور، موسیو لینن و قیصر ولیم، قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور، اور نوائے مزدور شامل تھیں۔ اسی سال ان کی مشہور نظم "خضر راہ" بھی شائع ہوئی۔ علامہ کے معاشی تصورات کو سمجھنے کے لئے ان نظموں کا جائزہ لینا ازحد ضروری ہے۔

"پیام مشرق" کی نظم "پیام" دراصل یورپی نو آبادیاتی طاقتوں کو پیام ہے۔ اس نظم کے ساتویں اور آٹھویں بند میں علامہ ان قوموں سے مخاطب ہو کر ارشاد کرتے ہیں کہ ملوکیت کا دور ختم ہو رہا ہے۔ مزدور بجائے خود حکومت کا خواہشمند ہے۔ پس اگر تم صاحب نظر ہو تو حالات حاضرہ سے یہ سبق حاصل کرو کہ انسانی زندگی اپنے لئے ایک اور جہان کی تعمیر کے درپے ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ میں اس خاک کہن (دنیائے محکوم) میں از سرنو زندگی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب ملوکیت کا خاتمہ ہو گا اور محکوم آزاد ہوں گے۔ میں اس انقلاب کو بسرعت تمام آتے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ کیونکر دیکھ رہا ہوں۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جو موجودہ آثار و قرائن کو دیکھ کر مستقبل میں زندہ رہنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لے۔

نظم "صحبت رفتگاں" (در عالم بالا) ٹالسٹائے، کارل مارکس، ہیگل، مزدک اور کوہکن (مزدور) کی آپس میں ایک بحث ہے۔ ٹالسٹائے کہتا ہے کہ ملوکیت کا استحکام فوجی طاقت پر موقوف ہے۔ شاہوں کی فوج کا ہر گماشتہ شیطان کا خادم ہے کیونکہ وہ اپنے پیٹ کی خاطر بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت، کلیسا اور وطنیت تینوں بیہوشی کی دارو ہیں جن کو پلا کر حاکم محکوموں کی جانیں خرید لیتا ہے۔ کارل مارکس اس کی تائید میں کہتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت انسان اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹتا ہے۔ اس مرحلے پر ہیگل کہتا ہے کہ کائنات میں بظاہر جو بھی اختلافات ہیں، وہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ فطرت نے کائنات کے متضاد پہلوؤں میں کشمکش کی لذت اس لئے پیدا کر رکھی ہے کہ نظام کائنات رواں دواں رہے۔ اس لئے سرمایہ دار اور مزدور یا حاکم اور محکوم میں جو پیکار ہے، وہ بالکل فطری امر ہے۔ یہ سن کر ٹالسٹائے کہتا ہے کہ تو اپنا خود پرست فلسفہ اپنے تک محدود رکھ کیونکہ وہ مزدور کو اپنی حالت پر مطمئن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ پھر مزدک کہتا ہے کہ جو بیج میں نے ایران میں بویا تھا، وہ روس اور جرمنی میں پھل پھول رہا ہے۔ سلطانوں اور امیروں کے محلوں میں صف ماتم بچھ گئی ہے۔ اے مزدور اٹھ! ملوکیت کا دور ختم ہوا۔ اب اس نعمت گم گشتہ (حاکمیت) کو آقا کے ہاتھ سے چھین لے۔ یہ بات سن کر کوہکن (مزدور) کہتا ہے کہ سرمایہ دار کی زبان پر تو صلح کے الفاظ ہیں مگر اس کا باطن چنگیز کی طرح خون آشام ہے۔ میں نے اس کی عیاری سے تنگ آ کر عقل کا دامن چھوڑ، جنون کی کیفیت اختیار کر لی ہے۔ اور اپنے ساتھیوں سے فریاد کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ اگرچہ میرے تیشے نے پہاڑ کاٹ کر رکھ دیا لیکن دنیا میں ابھی تک پرویزیت کا دور دورہ ہے۔ پس

اے مزدورو! زمین سے لے کر آسمان تک جو کچھ بھی ہے، سب کا سب مصروف عمل ہے، اس لئے تم بھی متحد ہو کر قدم اٹھاؤ تاکہ رفتار کارواں تیز ہو سکے۔

نظم "محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مرد مزدور" میں حکیم اگسٹس کومٹ، مرد مزدور سے کہتا ہے کہ تمام انسان آپس میں اسی طرح مربوط ہیں جیسے ایک جسم کے اعضا۔ اصول فطرت کے مطابق جس طرح انسانی اعضا کے مختلف وظائف متعین ہیں، مثلاً دماغ کا کام سوچنا اور پاؤں کا کام چلنا ہے، اسی طرح مختلف انسانی طبقات بھی فطرت ہی نے قائم کر رکھے ہیں۔ کوئی سرمایہ دار ہے، کوئی مزدور ہے، کوئی حاکم ہے، کوئی محکوم ہے۔ پس زندگی میں تقسیم کار ہی کی بدولت راحت و اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ یہ سن کر مرد مزدور کہتا ہے کہ اے حکیم! تو مجھے اپنے فلسفے سے دھوکا دینا چاہتا ہے اور مجھے غلامی کا سبق پڑھا رہا ہے۔ میرے تیشے کی بدولت پہاڑوں سے دودھ کی ندیاں رواں ہیں لیکن تو کوہکن کا حق پرویز کو دینا چاہتا ہے۔ سرمایہ دار کا وجود زمین کے کندھوں پر بوجھ ہے۔ وہ کھانے اور سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتا۔ پس دنیا کی تمام فارغ البالی اور مسرت مزدور کی جفاکشی کے سبب ہے۔

نظم "موسیو لینن و قیصر ولیم" میں موسیو لینن، قیصر ولیم سے کہتا ہے کہ اس دنیا میں انسان صدیوں سے دانے کی طرح چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا ہے۔ وہ ایک طرف تو زار اور قیصر کا غلام ہے اور دوسری طرف کلیسا کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ بالاخر اس ذلیل زندگی سے تنگ آ کر اس نے اپنے آقاؤں کی قمیص کو جو اس کے خون سے رنگین تھی، پھاڑ دیا ہے۔ آتش جمہور کے شعلوں نے پیر کلیسا کی چادر اور سلطان کی قبا دونوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ سن کر قیصر ولیم جواب دیتا ہے کہ ملوکیت کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل غلامی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ جب وہ پرانے خداؤں سے بیزار ہوتا ہے تو خود بخود نئے خدا تراش لیتا ہے۔ رہزنوں کے ظلم کی شکایت ٹھیک نہیں کیونکہ رہرو آپ ہی اپنے رہزن ہیں۔ اگر تاج شاہی جمہور پہن لیں تو ان کی انجمن بھی ہنگاموں سے خالی نہیں رہے گی۔ انسان کے دل سے اقتدار کی ہوس مٹ نہیں سکتی۔ آتشدان میں ہمیشہ آگ ہی جلتی ہے۔ لہٰذا عروس اقتدار بدستور عوام کو غلام بنانے میں مصروف رہتی ہے۔ شیریں کے ناز اٹھانے والے خریدار ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اگر خسرو نہیں تو کوہکن سہی۔ گویا۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی!

"قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" ایک طنزیہ نظم ہے جس میں سرمایہ دار، مزدور کو اسبابِ معیشت کی منصفانہ تقسیم کا طریقہ بتاتا ہے تاکہ کسی فریق کو شکایت کا موقع نہ رہے۔ سرمایہ دار، مزدور سے کہتا ہے کہ فولاد کے کارخانوں کا شوروغل میرا اور کلیسا کے سہانے نغمے اور گیت تیرے۔ دنیا کے نخلستان، کھیت اور درخت میرے۔ لیکن باغِ بہشت، اس کی نہریں اور حوریں تیری۔ شراب جس سے دردِ سر پیدا ہوا ہے، میری مگر پاک و صاف پانی جو آدم و حوا کا مرغوب مشروب ہے، تیرا۔ مرغابیاں، تیتر اور کبوتر میرے۔ لیکن ہما کا سایہ اور عنقا کے پر تیرے۔ بس یہ زمین اور اس کے پیٹ میں جو کچھ بھی ہے، میرا۔ مگر زمین سے لے کر عرشِ معلا تک، سب تیرا۔

نظم "نوائے مزدور" میں مزدور کہتا ہے کہ میں خود تو ٹاٹ پہنتا ہوں لیکن میری محنت و مشقت کی بدولت آقا جو مطلق ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا، ریشم و حریر کا لباس زیب تن کرتا ہے۔ میں اپنے زورِ بازو سے کان کھودتا ہوں مگر اس کان سے نکلے ہوئے لعل مالک کی انگوٹھی کی زینت بنتے ہیں۔ میرے بچوں کے آنسو امیر کے گھوڑے کے ساز کے موتی ہیں اور کلیسا کی جونکیں میرا ہی خون چوس چوس کر فربہ ہوئی ہیں۔ ملوکیت کو ہمہ گیر تقویت میری مشقت ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ میری آہ و زاری کے سبب ویران اور بنجر زمین رشکِ گلستاں ہے اور میری ہی جفاکشی کے باعث امراء و روساء کے چہرے پر رونق ہیں۔ مگر سنو، اے مزدورو! سازِ کائنات سے نیا نغمہ بلند ہو رہا ہے۔ نظامِ ملوکیت نزع کے عالم میں ہے۔ آؤ، وہ شراب شیشے میں ڈالیں جو اسے پگھلا دے۔ آؤ، رہزنانِ چمن سے انتقام لیں اور ان کا قلع قمع کر کے نئی بزمِ غنچہ و گل کی بنیاد رکھیں۔ تم کب تک پروانوں کی طرح شمع کا طواف کرتے رہو گے اور کب تک اپنی حقیقت سے بیگانہ رہو گے؟

چونکہ یہ نظمیں "خضرِ راہ" کی طرح ۱۹۲۲ء میں تحریر کی گئیں، اس لئے ان سب میں اندازِ بیان تقریباً یکساں ہے۔ مثلاً "خضرِ راہ" کے باب سرمایہ و محنت میں ارشاد کرتے ہیں ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحر الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور، مات
اٹھ! کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

علامہ کی ان نظموں سے اشتراکیت کے حامیوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اقبال اشتراکیت کے مبلغ ہیں۔ اس زمانے میں اشتراکی خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک ہفتہ وار اخبار 'انقلاب' شائع ہوا کرتا تھا جس کے مالک اور ایڈیٹر شمس الدین حسن صاحب تھے۔ اس اخبار کے ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے شمارے میں شمس الدین حسن کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں تحریر کیا گیا کہ اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر اقبال قانون کی زد سے کیوں اور کیسے بچ سکتے ہیں؟ کیونکہ بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لب لباب ہے' اور کارل مارکس کے فلسفے کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی اقبال کی "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کو دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں' اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔

علامہ اقبال نے اس مضمون کی تردید میں ایک خط تحریر کیا جو اگلے روز یعنی ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے "زمیندار" اخبار میں شائع ہوا۔ چونکہ یہ خط علامہ کے معاشی تصورات کو سمجھنے کے لئے کلیدی حیثیت کا حامل ہے اس لئے اس کا متن پیش خدمت ہے۔ فرماتے ہیں:

"کسی صاحب نے ..... کسی اخبار میں ..... میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے' اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے' اور

یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، یہی طریقہ قابل عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی عاقبت نااندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لئے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے: فاصبحتم بنعمتہ اخوانا: میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن

نہیں جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو' اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو' ان کے طریق عمل سے مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں' ان کے لئے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔"

اس خط سے ظاہر ہے کہ علامہ نے "پیام مشرق" اور "خضر راہ" میں اشتراکی خیالات کی جو عکاسی کی' اس کا مقصد دراصل یہ واضح کرنا تھا کہ اشتراکی تحریک ملوکیت یا یورپ کی خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ وہ محکوم مسلمانوں کو اشتراکی خیالات قبول کرنے کی تلقین نہیں کر رہے تھے بلکہ چشم مسلم کو دنیائے مغرب میں اشتراکیت و ملوکیت کی کشمکش کا نظارہ دکھا رہے تھے۔ مثلاً "بانگ درا" میں ارشاد کرتے ہیں۔

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے | دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنہ ء آشوب خیز | ٹل نہیں سکتا "وقد کنتم بہ تستعجلون"

"کھل گئے" یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشم مسلم دیکھ لے تفسیر حرف ینسلون!

یہ بتایا جا چکا ہے کہ علامہ سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی بے دین مغربی جمہوریت' ملوکیت یا نو آبادیاتی استعمار کے مخالف تھے۔ اس لئے مغرب میں ان کے رد عمل کے طور پر جو بھی تحریکیں سوشلزم یا فاشزم کی ہیئت میں اٹھیں' علامہ نے ان کے نقطہ ہائے نگاہ کی عکاسی کی۔

ممکن ہے انہوں نے روس میں اشتراکیت کے تجربے کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا ہو کیونکہ ان کے نزدیک بظاہر اسلام کی طرح اشتراکیت کا مقصد ملوکیت کا قلع قمع کرنا' مذہبی پیشوائیت کو ختم کرنا اور مساوات کے نصب العین کو حاصل کرنا تھا۔ لیکن چونکہ یہ نصب العین احکام الٰہی کے تابع ہونے کے بجائے مادہ پرستی پر مبنی تھا اس لئے علامہ کو کسی صورت میں بھی قبول نہ تھا۔ پس اس موضوع پر وہ جب بھی مسلمانوں سے مخاطب ہوئے' انہوں نے مسلمانوں کی توجہ قرآنی تعلیمات کی طرف مبذول کرائی' مثلاً "ضرب کلیم" کی نظم "اشتراکیت" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی گفتار
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرف 'قل العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

اسی خیال کا اظہار ایک اور انداز میں علامہ نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے لاہور کے اجلاس منعقدہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں اپنے صدارتی خطبے میں بھی کیا۔ آپ نے فرمایا:

"اقوام ایشیا یقیناً اس قابوچیانہ اقتصاد کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی جو مغرب نے ترقی دے کر ایشیا کی قوموں پر عائد کر رکھا ہے۔ ایشیا اپنی غیر منضبط انفرادیت کے ساتھ زمانہ حال کی مغربی سرمایہ داری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جس دین کے تم علمبردار ہو' وہ فرد کی قدر و قیمت تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندے کی خدمت میں صرف کر دے۔ اس دین قیم کی ممکنات مضمر ابھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں انسان کا شرف اس کی قوم' اس کے رنگ اور اس کے مالی منافع سے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور اس کی طرز زندگی سے متعین کیا جائے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول

کو، جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو، جس میں ایک اچھوت ایک شہزادی سے شادی کر سکے، جس میں ذاتی ملکیت محض ایک وقف ہو اور جس میں سرمایہ کو اس طرح المضاعف ہونے کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ اصلی دولت آفرین طبقہ پر غلبہ پا جائے"۔

زمین سے متعلق علامہ کا مسلک شروع ہی سے یہی رہا کہ وہ خدا کی ملکیت ہے۔ "بانگ درا" میں ارشاد کرتے ہیں۔

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز ۔۔۔ دونوں یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اسی کا کھیت ۔۔۔ کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو ۔۔۔ بولی، مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیر آسماں ہے، وہ دھرتی کا مال ہے

علامہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اس زمانے میں جو تقریریں انہوں نے کونسل میں کیں، ان کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ کے نزدیک 'کراؤن' یا 'سٹیٹ' زمین کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح آپ مخابرہ (زمین سے بٹائی وصول کرنا) کے خلاف تھے۔ اس دور میں انہوں نے زرعی اصلاحات کے سلسلے میں جو تجاویز پیش کیں، وہ یہ تھیں کہ جو اراضی 'کراؤن' کی ملکیت ہے، اس میں سے نصف کسانوں کو اقساط کی صورت میں فروخت کرنے کے لئے محفوظ رکھی جائے۔ نیز زرعی آمدنی پر اسی تناسب سے ٹیکس نافذ کیا جائے جس طرح انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور جس طرح کم آمدنی والے (تب جن کی آمدنی دو ہزار روپیہ سالانہ تھی) انکم ٹیکس کی ادائگی سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح چھوٹے زمینداروں (علامہ کی رائے میں جن کی ملکیت اراضی پانچ بیگھہ تھی) کو مالیہ یا لگان معاف کر دیا جائے۔ مگر علامہ کی تجاویز قبول نہ کی گئیں۔

۱۹۳۲ء میں 'جاوید نامہ' شائع ہوا۔ علامہ کے معاشی تصورات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ اس میں ایک تو علامہ نے زمین کی ملکیت کے متعلق، قرآنی تعلیمات کی روشنی میں، اپنے مسلک کی وضاحت کی ہے اور دوسرے، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ملوکیت پر تنقید کی ہے۔

"جاوید نامہ" کے باب "فلک عطارد" میں علامہ، جمال الدین افغانی کو مسلمانان عالم کی

حالتِ زار بیان کرتے ہوئے ارشاد کرتے ہیں کہ ملت اسلامیہ وطنیت کی لعنت میں گرفتار ہے اس لئے اسے اسلام کی صداقت پر یقین نہیں رہا۔ مسلمان ایک طرف تو ملوکیت کے غلام ہیں اور دوسری طرف اشتراکیت ان کے دین و ملت کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہے۔

اس کے بعد جمال الدین افغانی اشتراکیت اور ملوکیت پر تنقید کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کتاب "سرمایہ" کا مصنف کارل مارکس جو یہودی النسل تھا، دراصل پیغامبرِ بے جبریل تھا۔ اس کی باطل تعلیمات میں حق کا عنصر شامل ہے۔ گویا اس کا قلب تو مومن تھا لیکن دماغ کافر تھا۔ ع "قلب او مومن دماغش کافر است" کی اصطلاح علامہ نے نطشے کے بارے میں بھی استعمال کی ہے۔ مغربی قومیں چونکہ روحانیت سے محروم ہیں، اس لئے شکم میں روح کی تلاش کر رہی ہیں حالانکہ روح، شکم سے کبھی رنگ و بو نہیں پکڑ سکتی۔ اشتراکی تعلیمات میں تن کے سوا کچھ نہیں رکھا کیونکہ اس پیغامبر حق شناس نے اپنے عقیدے کی اساس مساوات شکم پر رکھی ہے۔ مساوات صرف اخوت پر قائم ہو سکتی ہے، اور اخوت کا مقام دل ہے نہ کہ شکم۔ یوں ہی ملوکیت بھی اشتراکیت کی طرح بدن کو موٹا کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کا سینہ بے نور بھی دل سے خالی ہے۔ وہ شہد کی مکھی کی طرح پھولوں کا رس چوس لیتی ہے اور پتے چھوڑ دیتی ہے۔ پس بظاہر پھول، پتے اور شاخیں زندہ رہتی ہیں اور بلبل بھی رنگ و بو پر فریفتہ ہو کر نغمہ سرائی کرتی ہے، مگر درحقیقت ان سب کا جوہر کشید کر لیا جاتا ہے۔ پس اشتراکیت و ملوکیت دونوں روح کی دشمن، خدا کی منکر اور انسان کو فریب میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔ اشتراکیت کا مقصد خروج، یعنی طبقاتی منافرت پھیلا کر انسانوں کو تشدد اور قتل و غارت پر آمادہ کرنا ہے اور ملوکیت کا مقصد خراج، یعنی محکوموں کی گاڑھے پسینے کی کمائی بزور کر اپنی عیش و عشرت کا سامان مہیا کرنا ہے۔ یہ دونوں پتھر کی سلوں کی طرح ہیں جن کے درمیان انسان شیشے کی مانند پس رہا ہے۔ اشتراکیت علم، دین اور فن کی قاتل ہے اور ملوکیت جسم سے روح نکال لینے کے علاوہ ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا بھی چھین لیتی ہے۔ دونوں نظام مادہ پرستی پر مبنی ہیں۔ تن کو روشن اور دل کو تاریک کرنے کے درپے ہیں۔ مگر حیات انسانی کا منتہائے نظر حیوانوں کی طرح محض کھانا پینا اور مر جانا نہیں بلکہ سوختن باساختن ہے، یعنی عشق الٰہی اختیار کرنا اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔

بعد ازاں سعید حلیم پاشا کے منہ سے کہلواتے ہیں کہ اے مسلمان! یاد رکھ، اغیار کی تقلید سے تیری زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔ کائنات کی فطرت ہی یہ ہے کہ انسان صرف ذاتی تحقیق و تخلیق کی بدولت ترقی کر سکتا ہے یعنی جو قوم کسی دوسری قوم کی تقلید کرتی ہے، وہ

رفتہ رفتہ اسی قوم کی غلام ہو جاتی ہے۔ زندہ قوم اپنی تحقیق کے ذریعے نئے جہان تخلیق کرنے کی اہل ہے۔ پس، اگر تجھ میں مسلمانوں کا حوصلہ ہے تو اپنے ضمیر کو سمجھ اور قرآن کا مطالعہ کر۔ تجھے معلوم ہو گا کہ اس اس کی آیات میں سینکڑوں نئے جہان پوشیدہ ہیں اور اس کے لمحات سے ہزاروں عہد لپٹے ہوئے ہیں۔ عصر حاضر کے مسائل کے حل کے لئے اس کا صرف ایک ہی نکتہ کافی ہے۔ لیکن یہ نکتہ تیری سمجھ میں تبھی آ سکتا ہے جب تیرے سینے میں معنی رس دل موجود ہو۔ بندہ، مسلمان تو خداوند تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اس لئے وہ ہر زمانے میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب ایک جہان اس کے لئے پرانا ہو جاتا ہے تو وہ قرآنی تعلیمات کے ذریعے دوسرا جہان تعمیر کر لیتا ہے۔

پھر نظم ''ارض ملک خداست'' میں علامہ زمین کے متعلق اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس مسلک کا ذکر ''بال جبریل'' کی نظم ''الارض للہ'' اور ''ارمغان حجاز'' کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں بھی آتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ زمین کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ زمین اس کی متاع ہے۔ اور یہ متاع بے بہا تمام انسانوں کے لئے اسی طرح مفت ہے جیسے روشنی، ہوا، پانی یا آگ۔ انسان زمین کو اپنے فائدے کے لئے استعمال تو کر سکتا ہے لیکن اس پر ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پس، زمیندار زمین سے صرف رزق اور اپنی قبر کے لئے ٹکڑا حاصل کر سکتا ہے، یعنی زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی خاطر جس قدر اراضی پر خود کاشت کر سکتا ہے، وہ بحیثیت ایک امین اس کی ملکیت میں رہ سکتی ہے۔

اس کے بعد جمال الدین افغانی سے کہلواتے ہیں کہ جو صاحب جستجو ہے، اس کے لئے اسلام عجیب عجیب معنی رکھتا ہے کیونکہ قرآن کی آیات میں ندرت ہے۔ پس ہر دور میں اسلام کی نئی نئی خصوصیات واضح ہوتی رہتی ہیں۔ اگر انسان اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرے تو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتا ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ روسیوں نے ایک نیا نظام حیات نافذ کیا ہے جو روٹی فراہم کرنے کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن دین چھین لیتا ہے۔ چونکہ مسلمان کا مسلک حق قبول کرنا اور دوسروں کو حق کی تلقین کرنا ہے، اس لئے ملت روسیہ کو یہ پیغام پہنچا دو۔

''پیغام افغانی بالمت روسیہ'' میں ارشاد کرتے ہیں کہ مسلمان تو قرآنی تعلیمات فراموش کر کے ملوکیت کے سامنے سرنگوں ہو گئے، لیکن تم روسیوں نے ان کے اسلاف کی طرح ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ کر کے اپنے ملک میں نئے نظام کی بنیاد رکھی ہے۔ تم نے لا سلاطین اور لا کلیسا کے نعرے کے ذریعے باطل خداؤں کا کام تمام کر کے لا الٰہ کے تقاضے

تو پورے کر دیے' اب ہمت کر کے الا اللہ کی طرف قدم اٹھاؤ۔ انسانی فطرت اثبات مطلق کی طالب ہے اس لئے وہ نفی مطلق سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ پس اگر تم ایک عالم گیر نظام کے نفاذ کے متمنی ہو تو اس نظام کے قیام کے لئے کوئی محکم اساس تلاش کرو۔ قرآن کے مطالعے سے تم پر یہ حقیقت آشکار ہو جائے گی کہ قرآنی نظام حکومت کے سوا ہر طریق حکومت عیاری و مکاری ہے اور فقر قرآنی ہی اصل شہنشاہی ہے۔ قرآن سرمایہ دار کے لئے موت کا پیغام ہے اور ناداروں کے لئے ضامن حیات ہے۔ قرآن "اکتناز" احتکار ربا اور قمار کو ممنوع قرار دیتا ہے' جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ کرتا ہے کیونکہ اس کے اصول کے مطابق زمین کا مالک خدا ہے اور انسان کی حیثیت محض امین کی ہے۔ پس ہر انسان زمین سے اپنا رزق حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن ملوکیت' مذہبی پیشوائیت اور ہر قسم کی اجارہ داری کا قلع قمع کر کے وحدت نسل انسانی کی بنیادوں پر تمام انسانوں میں مساوات و اخوت کے فروغ کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن محض کتاب نہیں بلکہ پیغام انقلاب ہے۔ اگر انسان اس کی تعلیمات کو سمجھے تو اس کے اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے اور وہ ان تعلیمات پر عمل کر کے ایک نیا جہان تعمیر کر سکتا ہے۔ قرآن کے دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ظاہری پہلو تو اوامر و نواہی یعنی احکام الٰہی نافذ کرتا ہے اور باطنی پہلو روح قرآنی کا حصول یعنی اللہ کو اپنا معبود سمجھ کر اس سے محبت کرتا ہے۔ قرآن ایک زندہ معجزہ ہے کیونکہ اس کی تعلیمات ہر دور میں انسان کی رہبری کرتی ہیں۔ پس تم قرآن کی بدولت حیات انسانی کے نشیب و فراز ہی سے نہیں بلکہ اس کی تقدیر سے بھی آگاہ ہو سکتے ہو۔

"جاوید نامہ" کی اشاعت کے بعد سوشلزم یا اشتراکی خیالات کے حامیوں نے علامہ کے معاشی تصورات کو نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کی اساس کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" کی بجائے قرآن پر استوار تھی۔ البتہ علامہ کی وفات کے بعد جب تحریک پاکستان شروع ہوئی تو ابتدائی مراحل میں' اس تحریک کی مخالفت کے دوران' انہوں نے اقبال کو "ابہام کا شکار متضاد خیالات کا مرقع" "فاشزم کا حامی" "رجعت پسند" وغیرہ کے القاب دیے' مگر جب سے پاکستان میں نئے "اسلامی سوشلزم" کا نعرہ بلند ہوا ہے' ان حضرات نے اقبال کے معاشی تصورات کی طرف ایک بار پھر اپنی توجہ مبذول کر لی ہے اور از سرنو یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اقبال' کارل مارکس کے نظریات سے متاثر تھے اور سوشلزم کے حامی تھے۔

ان کی پہلی دلیل تو وہی پرانی دلیل ہے کہ "پیام مشرق" کی نظموں اور "خضر راہ" میں

علامہ نے سوشلزم کی حمایت کی ہے، لیکن چونکہ اس کی تردید علامہ نے خود ہی اپنے خط محررہ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء میں کر دی تھی، اس لئے یہاں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ "جاوید نامہ" میں علامہ نے روس میں سوشلزم کے نظام کو لا الٰہ کی بنیادوں پر قائم پایا، لیکن ان کے نزدیک اگر اس میں الا اللہ کا اضافہ ہو جائے تو یہ نظام انہیں قبول تھا۔ علامہ کے افکار سے عیاں ہے کہ روسیوں کو الا اللہ کی دعوت دینے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن کی معاشی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں جو سوشلزم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ علامہ نے انسانی معاشرے میں الا اللہ کی اہمیت کا ذکر صرف "جاوید نامہ" ہی میں نہیں کیا بلکہ اس کا ذکر "پس چہ باید کرد" اور "ضرب کلیم" میں بھی کیا ہے۔ "پس چہ باید کرد" میں ارشاد ہوتا ہے۔

روس را قلب و جگر گردیده خوں　　از ضمیرش حرف "لا" آمد بروں
کرده ام اندر مقاماتش نگہ　　لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکر او در تندباد "لا" بماند　　مرکب خود را سوے الا نراند

در مقام "لا" نیا ساید حیات
سوے "الا" می خرامد کائنات

پھر "ضرب کلیم" میں فرماتے ہیں۔

نہاد زندگی میں ابتدا "لا" انتہا "الا"
پیام موت ہے جب "لا" ہوا "الا" سے بیگانہ!
وہ ملت، روح جس کی "لا" سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو، ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ!

ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ علامہ نے ۳۰ جون ۱۹۳۱ء کو ایک خط بنام سر فرانس ینگ ہسبنڈ تحریر کیا جس میں فرمایا "چونکہ بالشوزم جمع خدا بہت حد تک اسلام کے مشابہ ہے، اس لئے مجھے تعجب نہ ہو گا کہ کچھ وقت گزرنے تک یا اسلام روس کو نگل لے گا یا روس اسلام کو۔"

علامہ کے اس خط میں سے چونکہ سوشلسٹ حضرات ہمیشہ یہ فقرہ متن سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ متن پیش نظر ہو۔ علامہ نے سر فرانس ینگ ہسبنڈ کو تحریر کیا:

"اگلی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حکومت برطانیہ کی کوئی بھی ایسی کوشش جس کا مقصد ہندوستان میں فرقہ وار کشیدگی سے ناجائز فایدہ اٹھانا ہو، دونوں ملکوں کے لئے تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر آپ نے برطانیہ کے کسی مادی مفاد کی خاطر سیاسی اقتدار ہندو کو منتقل کر دیا اور اسے اقتدار میں قائم رکھنے کا منصوبہ بنایا، تو آپ ہندی مسلمانوں کو سوراج یا اینگلو سوراج حکومت کا خلاف وہی حربے اختیار کرنے پر مجبور کر دیں گے جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف استعمال کیے تھے۔ علاوہ ازیں ممکن ہے ایسا منصوبہ سارے کے سارے مسلم ایشیا کو روسی کمیونزم کی آغوش میں دھکیل دے جو مشرق میں برطانوی برتری کے لئے ضرب کاری کے مترادف ہو گا۔ میں خود یہ تسلیم نہیں کرتا کہ روسی فطرتاً" لامذہب ہیں بلکہ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی مرد اور عورتیں شدید مذہبی رجحانات کے حامل ہیں اور روسی ذہن کی حالیہ منفی کیفیت غیر متعین عرصہ تک قائم نہ رہ سکے گی کیونکہ انسانی معاشرے کا کوئی بھی نظام الحاد کی بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ جب روس کے حالات بہتر ہوں گے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملے گا تو وہ اپنے نظام کی بنیادیں کسی مثبت اصول پر قائم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چونکہ بالشوزم جمع خدا بہت حد تک اسلام کے مشابہ ہے، اس لئے مجھے تعجب نہ ہو گا کہ کچھ وقت گزرنے تک یا اسلام روس کو نگل لے گا یا روس اسلام کو۔ بہرحال، میرے خیال میں نتیجہ بہت حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ ہندی مسلمانوں کو نئے دستور میں کیا پوزیشن دی جاتی ہے۔"

اس تحریر سے ظاہر کہ علامہ انگریز حاکموں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ اگر انہوں نے سیاسی اقتدار صرف ہندو اکثریت کو منتقل کر دیا اور ہندی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے اصول کو نئے دستور یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں تسلیم نہ کیا تو ممکن ہے سارے کا سارا مسلم ایشیا روسی کمیونزم کی آغوش میں چلے جانے پر مجبور ہو جائے۔ علامہ جانتے تھے کہ انگریز روس کے توسیعی ارادوں سے خائف ہیں اس لئے انہوں نے انگریزوں کو خبردار کیا کہ روسی لوگ مسلمانوں کی طرح مذہب پرست ہیں، ان کے الحاد کی نوعیت محض وقتی ہے اور

ایسے امکانات موجود ہیں کہ اگر برطانیہ نے ہندی مسلمانوں کے مطالبات تسلیم نہ کیے تو وہ روسی مسلم اتحاد کے انداز میں سوچنے لگیں۔

ویسے بھی علامہ کی اس اصطلاح "بالشوزم جمع خدا" کا تجزیہ اگر ان کے افکار کی روشنی میں کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ علامہ کے نزدیک یہ اصطلاح کوئی الجبرے، ریاضی یا طبیعیات کا فارمولا نہ تھی بلکہ اس اصطلاح سے ان کی مراد دہریت روس کو دائرۂ اسلام میں لانا یا "بالشوزم کو احکام الٰہی کے تابع کرنا" تھی۔ مگر اس اصطلاح سے کسی کھوجی کا یہ سراغ نکالنا کہ علامہ نے سوشلزم کی حمایت میں استعمال کی، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

سوشلسٹ حضرات کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ علامہ نے "بال جبریل" کی نظم "لینن (خدا کے حضور میں)" میں لینن کے خیالات کی حمایت کی۔ اس نظم میں لینن کے خیالات کی حمایت تو نہیں البتہ اس کے خیالات کی عکاسی ضرور کی گئی ہے۔ اسی طرح مغربی نو آبادیاتی طاقتوں کی ملوکیت کے مخالف فاشی تحریک کے بانی "مسولینی" پر بھی علامہ نے نظم تحریر کی اور اس کے خیالات کی عکاسی کی۔ مگر اس سے یہ تاثر لینا کہ علامہ فاشزم کے حامی تھے، غلط ہو گا۔

ان کی پانچویں دلیل یہ ہے کہ علامہ نے "بال جبریل" کی نظم خداہ کا فرمان (فرشتوں سے) میں کسانوں کو ترغیب دی کہ۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ ء گندم کو جلا دو

اس نظم کے عنوان سے واضح ہے کہ خدا فرشتوں کو قہر کے نزول کا حکم دے رہا ہے۔ گویا اگر آئین قرآنی نافذ نہیں اور ظلم و استبداد کا دور دورہ ہے تو اسے نیست و نابود کر دیا جائے۔ علامہ نے کسانوں کو اپنے عمل کے ذریعے ہمیشہ خاشاک غیر اللہ کو پھونک دینے کی تلقین کی اور توحید کو بے حجاب کرنے کا پیغام دیا۔ "بانگ درا" میں دہقان سے کہتے ہیں۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں! ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو!

پھر بال جبریل کی نظم "پنجاب کے دہقاں سے" میں ارشاد فرماتے ہیں

بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دین محکم، یہی فتح باب کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب!

اسی طرح علامہ مزدور کو اس کی محنت کا حق دلانے کے درپے تھے، جیسا کہ "بانگ درا" میں ارشاد ہوتا ہے۔

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے، لیس للانسان الا ماسعیٰ
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار!

مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے مزدوروں کو ہمیشہ یہ تلقین کی کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔

اسی طرح طالب علموں اور نوجوانوں کو بھی علامہ نے ہمیشہ یہی نصیحت کی کہ خواہ ان کی تعلیم فرنگیانہ ہو، وہ اپنا نشیمن اپنی خودی ہی میں بنائیں۔ اپنے دلوں کو اللہ کی محبت سے لبریز کرلیں اور رسولؐ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر ثابت قدمی سے گامزن رہیں۔ نوجوانوں میں الحاد کے انداز کے ظہور سے علامہ بڑے متفکر تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت جمال الدین افغانی کا ایک معروف قول رہتا تھا، جو ان کی تصنیف "رد نیچریہ" میں درج ہے۔ جمال الدین افغانی تحریر کرتے ہیں کہ دنیائے مغرب میں اگر کوئی ملحد بھی ہو جائے تو کم از کم اپنی قوم و وطن کی بہبود کی خاطر اپنی جدت فکر و عمل کے ذریعے کوئی نئی راہ تلاش کر لیتا ہے، لیکن دنیائے اسلام کی بدقسمتی ہے کہ یہاں الحاد سے مراد ہمیشہ اپنی تمدنی اقدار سے انحراف اور اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی لی جاتی ہے۔ علامہ نئی نسل میں رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی اور الحاد کے فروغ سے کس قدر شرمندہ تھے، اس کا سراغ نظم "حالی کا مکالمہ سعدی شیراز سے (فردوس میں)" میں ملتا ہے۔ سعدی، مولانا حالی سے ہند کے مسلم نوجوانوں کا حال پوچھتے ہیں۔ اس پر مولانا حالی انہیں جواب دیتے ہیں۔

دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضور شہ یثربؐ میں نہ کرنا! سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

علامہ نے خطاب بہ جاوید (خطاب بہ نژادِنو) میں نوجوانانِ ملت پر سردین مصطفےٰ واضح کیا ہے اور اپنی دیگر نظموں میں نوجوانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی نہ کریں بلکہ اپنی رات کو اپنے داغ جگر سے روشن کریں۔ ضرب کلیم کی نظم "جدت" میں ارشاد ہوتا ہے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نور سحر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی!
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟

علامہ کا ایمان تھا کہ مسلمانوں کی معاشی جنت ان کے دینی و تمدنی فکر کے تاریخی تسلسل میں پنہاں ہے۔ اگر اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر نوجوان تحقیق کریں تو اپنی جدت فکر و عمل کے ذریعے انقلاب بپا کر کے ایک نیا جہان وجود میں لا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل، کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

پھر "ضرب کلیم" میں ارشاد ہوتا ہے۔

حریم تیرا، خودی غیر کی؟ معاذ اللہ! دوبارہ زندہ نہ کر کاروبار لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے رہا نہ 'تو' تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات!

نظم "فوارہ" میں فرماتے ہیں۔

یہ آبجو کی روانی، یہ ہمکناری خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
ادھر نہ دیکھ، ادھر دیکھ اے جوان عزیز!
بلند زور دروں سے ہوا ہے فوارہ

ظاہر ہے علامہ نے کسانوں، مزدوروں اور طالبعلموں کو ہمیشہ یہ تلقین کی کہ اسلام بجائے خود پیغام انقلاب ہے اس لئے اگر وہ اسلامی تعلیمات پر اپنے ملک کی تعمیر کے درپے ہوں تو اس معاشی جنت کا حصول ممکن ہے جو ان کے خوابوں میں بستا ہے۔

سوشلسٹ حضرات کی چھٹی دلیل یہ ہے کہ علامہ نے اپنے خط محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں خواجہ غلام السیدین کو تحریر کیا: "باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود بھی ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

اس فقرے کو بھی عموماً اس کے متن سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ متن یہ ہے:

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا! میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں، مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے، یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود بھی ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلم سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے"۔

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ علامہ، کارل مارکس کی تاریخ انسانی کی مادی تعبیر کو سراسر غلط سمجھتے تھے۔ نیز اس خط میں انہوں نے دوبارہ ارشاد فرمایا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان کی حیثیت سے مروں گا۔ پس اگر اس خط کے آخری فقرے کو متن میں رکھ کر پڑھا جائے تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ اسلام کا اپنا تصور معاشی مساوات و اخوت ہے جس سے مسلمانوں نے آج تک فائدہ نہیں اٹھایا۔

علامہ کے افکار سے ثابت ہے کہ ان کے نزدیک معیشت کے دونوں مروجہ نظام یعنی کیپٹل ازم اور سوشلزم ناقص اور باطل ہیں۔ وہ انسانیت کی معاشی فلاح و بہبود کے لئے صرف قرآن کی معاشی تعلیمات پر مبنی نظام کے حامی تھے۔ اسی خیال کا اظہار انہوں نے نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ اس نظم کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ شیطان نے یورپ کو ملوکیت کا خواب دکھایا اور محکوموں کو تقدیر کا سبق دیا۔ اس کے رد عمل کے طور پر الحاد کی بنیادوں پر نظام اشتراکیت وجود میں آیا اور جس کے قلع قمع کے لئے شیطان نے فاشی آمریت قائم کی۔ شیطان جب چاہے اقوام یورپ کا لہو گرما کر انہیں جنگ کی آگ میں دھکیل سکتا ہے اور وہ اس کے اشارے پر ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ چونکہ شیطان خود سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی بے دین مغربی جمہوریت کا خالق اور محافظ ہے، اس لئے اسے آئندہ کے اشتراکی انقلاب سے قطعاً خوف نہیں۔ اگر اسے کوئی

خدشہ ہے تو صرف مسلمانوں سے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار' آشفتہ مغز' آشفتہ مو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
جانتا ہے' جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ ء فردا نہیں' اسلام ہے

وہ آئین پیغمبر یا اسلامی نظام معیشت کے نفاذ سے خائف ہے۔

الحذر' آئین پیغمبر سے سوبار الحذر!
حافظ ناموس زن' مرد آزما' مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں!

اس لئے اپنے مشیروں کو حکم دیتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اپنی یہ متاع دریافت کرنے سے باز رکھیں۔

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات!
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

اسی فکر کے پس منظر کے ساتھ علامہ نے قائد اعظم کو اپنی وفات سے تقریباً گیارہ ماہ قبل ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو تحریر کیا:

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کرنے لگے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی غربت اور افلاس کا باعث ہندو ساہوکاری اور سرمایہ داری ہیں .... جواہر لعل کا بے دین سوشلزم ان کو متاثر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا مسئلہ کیونکر حل کیا جائے .... خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے اور جدید تجربات کی روشنی میں اسلامی فقہ کا ارتقاء ممکن ہے۔ شریعت اسلامیہ کے عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اسلامی قانون صحیح طور پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر فرد کی بنیادی ضروریات و حاجات پوری کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ایسا تبھی ممکن ہے جب اس ملک میں آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کو معرض وجود میں لایا جا سکے۔ سال ہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسے ہی مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں .... اسلام کے لئے معاشی جمہوریت کی کسی قابل قبول ہیئت میں ترویج' جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو' حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہو گا .... لیکن جیسے میں اوپر ذکر کر چکا ہوں' اسلامی ہند میں ان مسائل کا حل باسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم اشد لازمی ہے .... کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت آن نہیں پہنچا؟ میرے خیال میں جواہر لعل کے بے دین سوشلزم کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے"۔

بہرحال' بعض مستشرقین نے جس طرح اتحاد اسلام کی تحریک کو پین اسلام ازم اور اسلامی ممالک میں سیاسی آزادی کی تحریکوں کو مسلم نیشنلزم کا نام دیا' اسی طرح علامہ کے

معاشی تصورات کو "وحدانی یا مسلم سوشلزم" کا نام دیا ہے۔ مگر علامہ کے معاشی تصورات کو خواہ وحدانی یا مسلم یا اسلامی سوشلزم کا نام دیا جائے' اس حقیقت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا کہ ان کے معاشی تصورات کی اساس قرآن ہے۔ اور اس اساس کے سبب ان کے تمام دینی' سیاسی' معاشی' اخلاقی اور تمدنی تصورات میں وحدت فکر پائی جاتی ہے۔ پاکستان کے نئے اسلامی سوشلسٹ بد قسمتی سے اس وحدت فکر سے محروم ہیں کیونکہ ان کا مسلک ہے: "اسلام ہمارا دین ہے' سوشلزم ہماری معیشت ہے۔" یعنی وہ مذہبی معاملات میں تو اپنے آپ کو محمد مصطفیٰؐ کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن معاشی معاملات میں کارل مارکس کے پیرو ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ الا اللہ اور لا الٰہ کو علیحدہ علیحدہ بریکٹوں میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی دوئی کا جواز اقبال کے ہاں ملنا محال ہے لہٰذا جب بھی وہ علامہ کو سوشلزم کا حامی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں' انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ حقیقی سوشلسٹوں نے کبھی اقبال کو سوشلزم کا حامی تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے علامہ کے معاشی تصورات کے متعلق جو کچھ تحریر کیا' اس کی دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔ ڈبلیو۔ سی۔ سمتھ (مغربی بلاک کے ایک سوشلسٹ) اپنی تصنیف "ہند میں جدید اسلام" میں تحریر کرتے ہیں: "اقبال کی تحریریں سوشل رنگ تو رکھتی ہیں .... لیکن درحقیقت انہیں یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ سوشلزم کیا ہے .... انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ سوشلزم کا تعلق تن سے ہے' اور اسی غلطی کی بنا پر وہ کسی اور طرف مڑ گئے ..... اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ان کے بعض احباب نے انہیں قائل کر لیا کہ وہ سوشلزم کو نہیں سمجھے اور وہ شاید اپنی اس لاعلمی کے ازالے کی فکر میں تھے جب موت نے انہیں آلیا"۔

پروفیسر مارک (مشرقی بلاک کے ایک سوشلسٹ) اپنی تصنیف "جاوید نامہ کے چند سوشل تصورات" پر تبصرہ (طبع کردہ چیکو سلواک اکاڈمی آف سائنسز۔ پراگ ۱۹۶۷ء) میں تحریر کرتے ہیں: "اقبال سوشلزم سے قطعاً نابلد تھے اور انہوں نے کبھی بھی اسے پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی ..... ان کی دلچسپی کا مرکز قرآن کے معاشی اصول تھے جو ان کی رائے میں عملی طور پر نافذ کیے جا سکتے تھے"۔

اس تفصیل کے بعد اقبال کے معاشی تصورات جو ان کی متذکرہ تحریروں میں جابجا بکھرے پڑے ہیں' نکات کی صورت میں پیش کیے جا سکتے ہیں:۔

اقبال' کارل مارکس کی تاریخ انسانی کی مادی تعبیر کو سراسر غلط سمجھتے تھے۔

۲- اقبال کے نزدیک بالشویک (اس اصطلاح کو انہوں نے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے، یعنی سوشلزم یا کمیونزم) خیالات رکھنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف تھا۔

۳- اقبال ملوکیت، مذہبی پیشوائی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مخالف تھے کیونکہ ایسی اجارہ داریاں قرآن کی تعلیمات کے برعکس ہیں۔

۴- اقبال قرآن کو پیغام انقلاب سمجھتے تھے۔ ان کی رائے میں انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا جو علاج قرآن نے تجویز کیا ہے، وہ بہترین ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کے الفاظ دائمی ہونے کے باوجود لاتعداد تعبیروں کے متحمل ہیں۔ آیات قرآنی کی کئی تعبیروں کا ہمیں علم ہے کیونکہ وہ مختلف زمانوں اور مختلف ادوار میں مسلمانوں کی مختلف نسلوں نے پیش کیں۔ لیکن کئی ایسی تعبیریں بھی ہو سکتی ہیں جو ہمارے علم سے باہر پردۂ غیب میں ہیں کیونکہ وہ مستقبل میں آنے والے مختلف زمانوں اور مختلف ادوار کے ساتھ لپٹی ہوئی ہیں اور ان تعبیروں کو منکشف کرنے والی مسلمانوں کی مختلف نسلوں کو ابھی وجود میں آنا ہے۔ لہٰذا آیات قرآنی کی تعبیر ہر زمانے، ہر دور اور ہر نسل کی ضروریات اور حاجات کے مطابق کی جا سکتی ہے۔

۵- اقبال اسلامی نظام جمہوریت کے قائل تھے جس کا اساسی اصول یہ ہے کہ اللہ حاکم مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے ریاست کو اختیارات حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر نیابتاً" عطا کیے ہیں۔ پس ان کے نزدیک کسی ایک مخصوص طبقے کی حکمرانی خواہ وہ جاگیرداروں یا سرمایہ داروں پر مشتمل ہو خواہ کسانوں یا مزدوروں پر، اس اصول کے منافی ہے۔

۶- اقبال کی رائے میں قرآن کا مقصود انسان کے بنیادی حقوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسے متوازن معاشی نظام کا نفاذ ہے جس میں کوئی ایک دوسرے کے لیے استحصال کا باعث نہ بن سکے۔ اسی بنا پر اسلام کیپٹل ازم اور سوشل ازم دونوں کو انسانی فکر کی انتہا پسندی کے مظاہرے سمجھتے ہوئے انہیں انسانی زندگی کے لیے ناقص وفاسد قرار دیتا ہے اور انسانی مساوات و اخوت کے نصب العین کے حصول کی خاطر اپنا معاشی نظام 'اقتصاد' کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے جس سے مراد ہے: بذریعہ اعتدال محنت و سرمایہ کا صحیح توازن برقرار رکھنا۔

۷- علامہ کی رائے میں اسلام 'ذاتی ملکیت' کے بنیادی انسانی حق کو وقف کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے کسی فرد کو اس قدر سرمایہ اکٹھا کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ حقیقی پیداکاروں کو مغلوب کرے۔ پس علامہ اگرچہ سرمایہ داری کے مخالف تھے لیکن وہ معاشی نظام سے

سرمائے کی قوت کو قطعی طور پر خارج کرنے کے حق میں نہ تھے' بلکہ ان کے نزدیک اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قرآنی احکام پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۸۔ علامہ کی رائے میں سرمائے کی قوت کو متعین حدود میں رکھنے کے لئے ایسے قوانین کا نفاذ لازمی ہے جن سے اکتناز (اجتماعی حقوق نظرانداز کر کے دولت کو خزانہ کرنا) احتکار (ناجائز وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا)' ربا' (سود) اور قمار (سٹہ) سب حرام و ممنوع قرار دیئے جا سکیں۔ نیز ان کے خیال میں مصلحت عامہ کے تحت یا اجتماعی معیشت کی بہتری کے لئے انفاق کے سلسلے میں ریاست پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کی بنیادی حاجات مثلاً روٹی' کپڑا' مکان' تعلیم' طبی امداد اور ملازمت پوری کرنے کی خاطر وسائل فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہے۔ پس اس مقصد کے حصول کے لیے ریاست جو قدم بھی اٹھائے گی' وہ قرآن و سنت کے عین مطابق تصور ہوں گے بشرطیکہ وہ قرآن کے بنیادی احکام کی روح کے منافی نہ ہوں۔

۹۔ علامہ کے نزدیک قانون وراثت کا نفاذ اور زکوٰۃ' صدقے اور عشر کی وصولی کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

۱۰۔ علامہ کی رائے میں زمین کا مالک خدا ہے اور انسان ایک امین کی حیثیت میں اس سے رزق حاصل کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اراضی کی ذاتی ملکیت کی اجازت صرف اس حد تک دی جا سکتی ہے جو زمیندار بذات خود زیر کاشت لا سکے۔ پس علامہ' مخابرہ (زمین سے بٹائی وصول کرنا) کی حرمت میں قانون کے نفاذ کے حق میں تھے اور ایسی زرعی اصلاحات کے نفاذ کے خواہشمند تھے جن کے ذریعے ان کے وضع کردہ اصول کے مطابق اراضی کی حد ملکیت مقرر کی جا سکے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جو اراضی حکومت کی تحویل میں آئے' اس میں سے نصف کاشتکاروں میں اقساط کی صورت میں فروخت کی جائے۔ مزید براں وہ زرعی آمدنی پر اسی تناسب سے ٹیکس کی وصولی کے حامی تھے' جس طرح انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور جس طرح ایک متعین حد تک کی آمدنی والے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے ہیں۔ اسی تناسب سے وہ چاہتے تھے کہ چھوٹے زمینداروں کو مالیہ یا لگان معاف کر دیا جائے۔

۱۱۔ علامہ کو مزدوروں' کسانوں اور طالبعلموں کی مشکلات کا احساس تھا اور ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے' لیکن آپ نے انہیں ہمیشہ یہ تلقین کی کہ بحیثیت مسلمان اپنی حقیقت اور مقام کو پہچانیں۔ قرآن کی اقتصادی تعلیمات پر نظر غائر ڈالیں اور کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔ علامہ مسلمانوں کی

دینی، سیاسی، معاشی، فکری اور تمدنی آزادی کے علمبردار تھے۔ اسی سبب وہ کیپٹلسٹ اور سوشلسٹ دونوں قسم کے استعمارات سے خائف تھے۔ انہوں نے خصوصاً نوجوانانِ ملت کو تلقین کی کہ اغیار کے افکار و تخیل یا ان سے کسی قسم کی امداد کی گدائی ہمیشہ محکومی اور استحصال کے رستے کھولتی ہے اس لئے وہ اپنے آپ میں تحقیق کا جذبہ پیدا کریں اور اپنی جدت فکر و عمل کے ذریعے اسلامی تمدن کے تاریخی تسلسل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے، قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں ملک و ملت کے تحفظ اور مادی و روحانی فلاح و بہبود کی خاطر نئی راہیں تخلیق کریں۔ علامہ انسانی زندگی میں تخلیقی عمل کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ ان کی نگاہ میں تخلیقی گناہ بھی ثواب کی حیثیت رکھتا تھا۔

علامہ کے معاشی تصورات سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ان کا منتہائے نظر اسلام کے صالح اور متوازن معاشی نظام کے نفاذ کے ذریعے دراصل درمیانہ طبقے کی فلاحی ریاست کا قیام ہے۔ اسلامی ضابطہء اخلاق میں کسی فرد کی عزت و تکریم کا انحصار اس کی امارت یا غربت پر نہیں بلکہ اس کی شرافت پر ہے۔ پس علامہ کا مقصد ایک ایسا معاشرہ وجود میں لانا ہے جس میں غریب کا معیار زندگی بلند کر کے اسے درمیانہ طبقے تک پہنچنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور امیر کے ذرائع آمدنی کو محدود کر کے اسے درمیانہ طبقے سے تجاوز کرنے سے روکا جائے۔ اسی طرز عمل کو "اقتصاد" کہا جاتا ہے اور علامہ کے نزدیک اسلامی اخوت کے حصول کے لئے یہی اعتدال کا رستہ ہے، جو آسان بھی ہے اور قابل عمل بھی۔

اب رہا سوال کہ اقبال کے معاشی تصورات کے نفاذ کا طریقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے علامہ اسلامی معاشی جمہوریت کے قیام کے خواہشمند تھے۔ ان کے اصول کی وضاحت اگر اقتصادیات کی مروجہ اصطلاحوں کی روشنی میں کی جائے تو وہ مخلوط معیشت کے حامی تھے، یعنی ایسی معیشت جو نجی کوششوں کو ایک متعین حد تک قبول کرے۔ اراضی کی حد ملکیت مقرر کرے اور ساتھ ہی ساتھ ریاستی تحویل کا اصول بھی نافذ کرے۔ ان کے ہاں "اقتصاد" یا دولت کی مساویانہ تقسیم خروج یا خراج کے ذریعے نہیں بلکہ اخوت اور برضائے عوام یعنی جمہوری طرز عمل ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بالفاظ دیگر علامہ سیاسی جماعتوں کے ذریعے عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل مرکزی یا صوبائی اسمبلیوں کو یہ اختیار دینا چاہتے تھے کہ ان کے معاشی تصورات کو آئینی شکل دے کر نافذ کریں۔ لیکن پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک، اقبال کے معاشی تصورات کا آئینی شکل میں نفاذ کیوں نہیں ہوا، اس سوال کا جواب علامہ کے اپنے اشعار میں پنہاں ہے۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدت گفتار ہے، نے جدت کردار
ہیں اہل سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاس تخیل میں گرفتار!

○

اقبال اور امید بہار☆

یوم اقبال کی تقریب پر میرے مقالات کا یہ سلسلہ گزشتہ سولہ سال سے جاری ہے۔ چند سال ہوئے جب ان مقالات کا ایک مجموعہ بعنوان "مے ء لالہ فام" شائع ہوا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے مجھے تحریر کیا: "ایک امر برابر کھٹکتا رہا اور وہ یہ کہ آپ نے تقریباً ہر مقالے میں گردوپیش سے جو توقعات وابستہ کیں، وہ آئندہ مقالے تک خون ہو کر بہ گئیں۔" اس حقیقت کا مجھے شدت سے احساس ہے۔ علامہ کے کلام میں بھی بسااوقات ایسا تاثر ملتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے مرض کورنگاہی کے سامنے بے بس ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کورنگاہی!

لیکن مایوسی کے باوجود انہوں نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ان کی حیات جسدی جوانی کی دوپہر سے بڑھاپے کی شام میں ڈھلتی چلی گئی، مگر فکر عالم شباب ہی میں رہا، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
نہ ستارے میں ہے، نے گردش افلاک میں ہے
تیری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے

☆ ۲۱۔ اپریل ۱۹۷۲ء یوم اقبال کے موقع پر میڈیکل کالج لاہور میں پڑھا گیا۔

یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے
کیا عجب میری نواہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسم شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے!

ملت کے شب و روز محکومی انجم کے باعث ناامیدی جاوید کی کیفیت میں گزرتے لیکن علامہ کا روزگار یاس کے عنصر سے آزاد تھا' اس لئے کہ انہیں اپنے ایمان کی بدولت اپنی ملت کے مقدر پر بھروسا تھا۔

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

جن حالات سے یہ ملک گزرا ہے' اگرچہ وہ ہم سب کے لیے کربناکی کا باعث ہیں' لیکن میں آج اسی توقع' اسی امید' اسی بھروسے اور اسی ایمان کا سہارا لئے آپ کے روبرو کھڑا ہوں۔

نہ چھین لذت آہ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز!
دل غمیں کے موافق نہیں ہے موسم گل
صدائے مرغ چمن ہے بہت نشاط انگیز

خلفائے راشدین کے مختصر عہد کے خاتمے پر جب سیاسی اقتدار بنو امیہ کے ہاتھ میں آیا تو بالخصوص حادثۂ کربلا کے بعد اُمت مسلمہ کے ایک طبقۂ اکابر نے جس کا دائرۂ اثر خاصا وسیع تھا' مایوسی کے عالم میں دنیوی امور سے کنارہ کشی اختیار کر کے "تصوف" میں پناہ ڈھونڈی۔ اس دور میں اسلام کے بنیادی تصورات اور اقدار کا خون ہوتا رہا۔ مگر جو آوازیں ایسے رجحانات کی مخالفت میں بلند ہو سکتی تھیں یا تو خاموش کر دی گئیں یا انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اسی عہد میں مرجئی فلسفے نے جنم لیا۔ اس فکر کے علمبرداروں کا موقف یہ تھا کہ جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے' تابع تقدیر ہے' اس لئے حالات پر نکتہ چینی کرنا یا انہیں

بدلنے کے لیے عملی طور پر سعی و کوشش کرنا' رضائے الٰہی کی مخالفت کرنے کے مترادف ہے۔ پس حالات چاہے کیسی بھی صورت اختیار کریں' مسلمانوں کا فرض ہے کہ انہیں رضائے الٰہی سمجھتے ہوئے بسروچشم قبول کرلیں۔ بنوامیہ کے حاکموں نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر نہ صرف مرجئی فلسفہ ء حیات کی سرپرستی کی بلکہ اس کی تشہیر کے لیے ہر ممکن امداد بھی دی۔ بنوامیہ خود تو صفحہ ء ہستی سے مٹ گئے لیکن ان کی میراث میں دیگر بدعتوں کے ساتھ مرجئی فکر بھی مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو ملا جس کے تحت قضا کو رضائے الٰہی تصور کیا جانے لگا اور مسلمان 'تن بہ تقدیر' ہو کر رہ گئے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

'تن بہ تقدیر' ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو 'ناخوب' بتدریج وہی 'خوب' ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

علامہ نے اپنی تحریروں میں ہمارے ان اسلاف کے عمل پر تبصرہ کیا ہے جنہوں نے حالات سے مایوس ہو کر تصوف میں پناہ ڈھونڈی۔ آپ کی رائے میں زوال فکر کے اس دور میں اگر وہ عملی دنیا سے علیحدگی اختیار کرنے کی بجائے ملت کی رہبری کی کوشش جاری رکھتے تو عین ممکن تھا مسلمان بہت سی گمراہیوں سے محفوظ رہتے اور تاریخ اسلام تابع تقدیر ہونے کی بجائے رضائے الٰہی کی مظہر ہوتی۔

علامہ کے ہاں 'قضا' اور 'رضا' کا امتیاز واضح ہے۔ قضا یا تقدیر ایک ایسا عمل فطرت ہے جس کے پابند طبیعیات' نباتات اور جمادات ہیں۔ تقدیر کا مقلد کٹھ پتلی کی طرح بجائے خود حرکت کی اہلیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی حیات و موت یا مسرت و غم قضا کے تغیر و تبدل کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ علامہ ارشاد کرتے ہیں۔

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام؟
یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند!
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش' ابھی خورسند
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

پس علامہ کے نزدیک جب مسلمان احکام الٰہی کا پابند ہو تو جوں جوں اس کی خودی مستحکم

ہوتی ہے، وہ اپنے تدبر اور تخلیقی عمل کے ذریعے قضا کی قید سے آزاد ہو کر خدا کا ہمکار بن جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ اللہ کے ہاتھ کی طرح غالب، کار آفریں، کار کشا اور کار ساز ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا اس کی رضا کو ملحوظ خاطر رکھنے لگتا ہے۔ گویا مومن کا عمل اور رضائے الٰہی ایک ہو جاتے ہیں اور تقدیریں مومن کی منشا کے مطابق بدلنے لگتی ہیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا؟
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

علامہ کی رائے میں تقدیر تابع منطق نہیں لیکن وہ فطری طور پر اپنی پابندی کو قائم اور جاری رکھنے کی خاطر تیغ دو پیکر کی طرح قوموں کے عمل پر مسلسل نگاہ رکھتی ہے۔

شاید کوئی منطق ہو نہاں اس کے عمل میں
تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی!
ہاں، ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو
تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
بُراں صفت تیغ دو پیکر نظر اس کی!

تقدیر کا راز مومن کی فراست ہی کھولتی ہے کیونکہ اس میں نظام قضا کو رضائے الٰہی کی قوت کے ذریعے بدل سکنے کی اہلیت ہے۔

تقدیر امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

علامہ کی نظر میں ہر قوم کا عمل اس کی اس کیفیت کا غماز ہے کہ وہ اپنی تاریخ کے کسی مخصوص دور میں مرکب تقدیر ہے یا راکب تقدیر۔ اگر راکب تقدیر ہے تو ایک موج بیباک کی طرح دریائے حیات کے ہر موڑ پر اپنے منشا کے مطابق موتی تخلیق کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کا تدبر اور عمل میکانکی نہیں رہتا بلکہ اس تخلیقی سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں فطرت اس کی ہر تقصیر معاف کرنے لگتی ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

لیکن اگر مرکب تقدیر ہے تو اسے عبرت کا تازیانہ لگتا ہے اور اس کے نصیب میں خار و خس و خاک کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ جس کسی زمانے کو بظاہر اپنی کوشش سے وجود میں لاتی ہے، تابع مقتضا ہوتا ہے، تاثیر رضائے الٰہی نہیں ہوتا۔ علامہ فرماتے ہیں۔

دریا میں موتی! اے موج بیباک!
ساحل کی سوغات؟ خاروخس و خاک!
تیرا زمانہ، تاثیر تیری!
ناداں! نہیں یہ تاثیر افلاک!
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے!
جس نے سیے ہیں تقدیر کے چاک!

پس وہی قوم تقدیر کے چیچاک سے نکل سکتی ہے جو یقین، عزم بلند اور جوش کردار کی خصوصیتوں سے مالا مال ہو۔ ایسی قوم کی زندگی مثل آفتاب ہے۔ وہ ڈوب کر بھی ابھرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے
یقیں افراد کا سرمایہ ء تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے!

علامہ اپنی تمام عمر مسلمانوں کو یقین، پیدا کرنے کی اہمیت پر زور دیتے رہے کیونکہ ان کے تجربے کے مطابق پیران کلیسا و حرم کی کدوکاوش کا صلہ سینوں کی بے نوری تھا۔

یہ پیران کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری!
صلہ ان کی کدو کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری!
یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!
کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا درد مہجوری!

یقین تبھی پیدا ہوتا ہے جب کسی قوم کو اپنے عقائد سے عشق ہو۔ اور جذبہ ء عشق محکم

فروغ کافر میں بھی اہل ایمان کی خصوصیات کی نمود کا باعث بن سکتا ہے۔ اسی بنا پر بعض اوقات کعبہ کو صنم خانے سے پاسبان ملتے رہے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

اسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں اب تک بتان عہد عتیق!
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق!

ہر ملت کے اپنے عقائد ہیں۔ ان عقائد کی پختگی اور ان سے کسی ملت کی وابستگی اس کے فکر، کردار اور عمل کے رخ کا تعین کرتی ہے اور اس کی وحدت کی ضامن ہوتی ہے۔

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد!

اگر کوئی قوم اپنے عقائد سے ہٹنے لگے تو اس کا فکر بے سوز اور عمل زار و زبوں ہو جاتا ہے۔

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر!

اور اگر انہیں خیرباد کہہ دے تو اپنے آپ کے ساتھ خود ظلم کی مرتکب ہوتی ہے جس گناہ کی سزا اسے لازماً بھگتنا پڑتی ہے۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف!
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!

تقدیر کا تاریخ ملل سے خاص تعلق ہے۔ تاریخ انسانی کی تشریح کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ کارلائل کی نگاہ میں تاریخ ان عظیم شخصیتوں کے کارناموں کی تفصیل ہے جو قضا کو و بالا کر سکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میکالے کی رائے میں تاریخ عظیم شخصیتوں کا نہیں بلکہ ان تحریکوں کا دفتر ہے جو عوام کی پشت پناہی سے وجود میں آتی ہیں اور قضا کا رخ بدل دیتی ہیں۔ مارکس کے نزدیک تاریخ انسانوں میں طبقاتی کشمکش کی آئینہ دار ہے اور اس کشمکش کا منتہا محروم طبقات کی فتح اور دولت مندوں کی شکست کے ذریعے لاطبقاتی معاشرے کا قیام ہے۔ ابن خلدون کی نظر میں تاریخ متفرق انسانی گروہوں کی عصبیت کے عروج و زوال

کی داستان ہے۔ جب تک کسی قوم کی عصبیت پر شباب ہوتی ہے، وہ اپنی رہبری کے لیے صحیح قیادت وجود میں لا کر عروج کی کیفیت میں رہتی ہے لیکن جب یہ عصبیت ضعیف ہو جاتی ہے، وہ صحیح قیادت پیدا کر سکنے کی اہل نہیں رہتی اور زوال کے عالم میں صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس تاریخ یہ حقیقت افشا کرتی ہے کہ اقوام تقدیر پر اتنے عرصے تک قادر ہوتی ہیں جب تک ان کی عصبیت پر شباب رہتی ہے۔ علامہ کے نزدیک تاریخ کا ایک مخصوص سبق ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی قوم اپنی خودی سے شناسا ہو اور اپنے تخلیقی فکر و عمل کے ذریعے اس کی نشوونما کرتی رہے تو وہ قضا کی پابندی سے نجات حاصل کر کے رضا کے عالم میں ہر لحظہ اپنے منشا اور ضرورت کے مطابق خود اپنی تقدیر کا تعین کر سکتی ہے۔

قیام پاکستان اور اس کے بعد کی تاریخ پر ان نظریات میں سے کون سے نظریے کا اطلاق ہوتا ہے، اس کا فیصلہ آپ کی فراست پر چھوڑتا ہوں۔ مگر پاکستان کے وجود میں آنے سے پیشتر مسلمانان برصغیر جس انتشار، بے یقینی، پست ہمتی اور مایوسی کا شکار تھے، وہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ مسلمان لاتعداد جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے، وہ اتحاد سے محروم تھے۔ ان پر اپنے سفر زندگی کا راز نہ کھلتا تھا بلکہ انہیں یہ علم بھی نہ تھا کہ اپنے وطن میں ہیں یا غریب الدیار ہیں۔

اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں
ڈرتا ہوں دیکھ کے اس دشت و در کو میں!
کھلتا نہیں مرے سفر زندگی کا راز
لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں!
"جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں!"

علامہ نے خودی کا تصور دے کر ان منتشر افراد کو آگاہ کیا۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!
حدیث دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!
برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر
یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!

آپ نے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح کی کہ ان کی دعا سے قضا نہیں بدل سکتی۔ قضا صرف تخلیقی عمل ہی سے تبدیل ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے آپ کو بدلنے کی دُعا کریں تاکہ انہیں اتحاد کی نعمت میسر ہو اور وہ اپنے اجتماعی تخلیقی عمل کے ذریعے اپنا چار ‌سو بدل سکیں۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے!
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے!
وہی شراب' وہی ہائے و ہو رہے باقی
طریق ساقی و رسم کدو بدل جائے!
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے!

مختلف زبانیں بولنے والے' مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے اور برصغیر کے مختلف خطوں میں آباد مسلمان توحید ہی کی بنیاد پر متحد ہو سکتے تھے۔ پس علامہ نے انہیں احساس دلایا۔

حقیقت ازلی ہے رقابت اقوام
نگاہ پیر فلک میں نہ میں عزیز نہ تو!
خودی میں ڈوب' زمانے سے ناامید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے در پردہ اہتمام رفو!
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہ!

آپ نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ وہ اتحاد کی قوت سے قضا کو درہم برہم کر سکتے ہیں۔ اپنے لئے ایک آزاد مملکت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اسے بہشت بریں بنانے کی خاطر ہر قدم پر اپنی تقدیر آپ متعین کر سکتے ہیں۔ آپ نے ارشاد کیا۔

خودی میں ڈوبتے ہیں' پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلہ ء مرد ہیچ کارہ نہیں!
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں!

یہیں بہشت بھی ہے، حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں!
غضب ہے عین کرم میں بخیل ہے فطرت
کہ لعلِ ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں!

علامہ کا ایمان تھا کہ اگر مسلمان متحد ہو کر صحیح قیادت وجود میں لا سکیں تو رضائے الٰہی انہیں ایک بار پھر نصرت و شوکت عطا کر سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت
نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی
عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ

علامہ کی کوشش پھل لائی۔ مسلمانانِ برصغیر نے اپنے اتحاد کی بنیاد توحید پر رکھی اور قائداعظم کی قیادت میں نہ صرف گردشِ ایام کو درہم برہم کر دیا بلکہ پاکستان حاصل کر کے اپنی تقدیر آپ متعین کرنے کا عزم کیا۔ پس یوں ۱۹۴۷ء میں انہیں ایک نئی شناخت میسر آئی۔ ان کا سیاسی عقیدہ کن اصولوں پر استوار تھا؟ مسلم قومیت، جمہوریت، قانون کی بالادستی اور معاشی انصاف۔ انہی اصولوں کو "قرارداد مقاصد" میں ایک واضح شکل دی گئی۔ اگر مسلمانوں کے قائدین عقیدۂ پاکستان پر قائم رہتے تو یہ قوم نہ اپنی شناخت کھوتی، نہ تقدیر کے پیچاک میں پھنستی۔ لیکن اس مرغک بے چارہ کو گمراہ کرنے کے لئے ایسے شکاری بھی موجود تھے جو اپنی ہوس کی خاطر اسے یا تو مقید رکھنا چاہتے تھے یا ہر بند سے آزاد کر دینے کے درپے تھے۔

چیکوسلواکی مصنف کافکا کے نزدیک حقوق اور فرائض کے مابین خیر اور شر کی طرح کشمکش ہے۔ ہر انسان فطری طور پر اپنی ہوس کا غلام ہونے کے سبب اپنے وضع کردہ حقوق کے حصول میں اپنی انفرادی آزادی اور معاشرے کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی پابندی میں اپنی محکومی تصور کرتا ہے۔ پس وہ ہر بند سے آزاد ہونے کی خاطر فرائض کی پابندی سے نجات کا طالب ہے۔ لیکن زندگی میں ہر قدم پر جب اسے مصائب سے واسطہ پڑتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ صعوبتیں خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ خدا کے تصور کو قتل کر کے زمین میں دفن کر دیتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ آزاد ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد، آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا، کے مصداق وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دوسرے انسانوں کے

استحصال کا شکار ہو گیا ہے۔ اس لئے وہ ایک بار پھر خدا کے دفن شدہ تصور کو زمین سے کھود کر نکالتا ہے اور از سرنو زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ دوسرے انسانوں کے استحصال سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ مگر جب خدا کا تصور دوبارہ زندہ نہیں کر پاتا تو وہ اس اُمید اور انتظار میں صعوبتیں برداشت کرتا چلا جاتا ہے کہ خدا ایک بار پھر اس کی مدد کو آئے گا اور اسے مصائب و آلام سے نجات دلائے گا۔ علامہ نے درست کہا ہے کہ۔

جو دونی فطرت سے نہیں لائق پرواز
اس مرغک بیچارہ کا انجام ہے افتاد!
اس قوم میں ہے شوخی اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد!

اگر پاکستانی افراد اپنی ہوس حقوق و مطالبات کو عقیدۂ پاکستان کی طرف سے عائد کردہ فرائض پر مقدم نہ سمجھتے تو ظاہر ہے یہ قوم اپنی چوبیس برس (یہ مقالہ ۱۹۷۲ء میں لکھا گیا تھا) پیشتر دریافت شدہ شناخت کو نہ گنواتی۔ مگر قوموں کی اجتماعی زندگی میں دیگر معاملات کی طرح عقائد، نظریات اور تخلیات میں بھی خیر و شر کی کشمکش جاری ہے۔

ستارگان فضاہائے نیلگوں کی طرح
تخیلات بھی ہیں تابع طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحب فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب!

علامہ کی نگاہ میں ہمارا قومی وجود ہمارے جوہر خودی کی نمود پر منحصر ہے۔ اگر یہ جوہر بے نمود ہو جائے تو ہمیں اپنی بقا کی فکر کرنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ ہر جہان تازہ کی تعمیر کے لئے افکار تازہ کی ضرورت ہے کیونکہ محض سنگ و خشت سے جہان پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اگر ہم اپنی اصلیت پہچانے بغیر یا اپنے جوہر خودی سے عاری ہو کر علوم تازہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ تجربہ ہمارے لیے مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

کھلے ہیں سب کے لئے غریبوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوز لا الٰہ نہیں!

چند ہفتے ہوئے ایک مصری صحافی نے جو پاکستان کے دورے کے سلسلے میں لاہور آئے

ہوئے تھے، مجھ سے ملاقات کے دوران سوال کیا:

"اس دور انقلاب میں جب کہ پاکستانی قوم دو حصوں میں بٹ چکی ہے، فکر اقبال کا مستقبل کیا ہے؟"

میں نے انہیں جواب دیا:

"فکر کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل۔ فکر تو مستقل حال کی کیفیت میں زندہ رہتا ہے، اس لئے آپ اپنے سوال کو از سرِ نو وضع کر کے مجھ سے پوچھئے، یعنی اس دور انحطاط میں اگر پاکستانی قوم فکر اقبال سے ہٹ چکی ہے، تو اس کا مستقبل کیا ہے؟"

کسی بھی عقیدۂ حیات کا متحمل ہونے کے لئے ہر قوم میں جوہر خودی کی موجودگی لازمی ہے کیونکہ یہی جوہر اسے اپنے بنیادی عقیدے سے منسلک رکھتا ہے اور اس کی غیرت، بقا اور آزادی کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے بنیادی تصور کو دھتکار کر کسی دوسرے تصور حیات کو اپناتی ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جوہر خودی سے محروم ہے۔ اور جوہر خودی سے بے نصیب قوم جو ایک نظریۂ حیات کی متحمل نہ ہو سکے، یقیناً دوسرے نظریۂ حیات سے بھی مطمئن نہیں ہو گی۔ ایسی قوم کا مستقبل انتشار، محتاجی، غلامی اور محکومی ہے۔ علامہ نے ہمیں برصغیر میں آزاد مسلم ریاست کے قیام کے لیے صرف ایک واضح جغرافیائی خاکہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ انہوں نے پاکستانی قوم کو ایک مخصوص شناخت بھی دی۔ پس فکر اقبال ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم من حیث القوم اگر چاہیں تو اپنی صورت دیکھ کر اسے پہچان سکتے ہیں۔ لیکن اگر پاکستانی قوم خود اپنا چہرہ مسخ کرنے کے درپے ہو اور اپنے آج کے پیچھے یوں ہاتھ دھو کر پڑ جائے کہ اسے اپنے کل کی پروا نہ رہے، تو پھر نہ وہ اپنے سفر زندگی کا راز جانتی ہے نہ اقبال اسے اس کی تقدیر سے آگاہ کر سکتا ہے۔ علامہ کا ارشاد ہے۔

مری شاخ امل کا ہے ثمر کیا\
تری تقدیر کی مجھ کو خبر کیا\
کلی گل کی ہے محتاج کشود آج\
نسیم صبح فردا پر نظر کیا!

ہماری حالت تو اس آدمی جیسی ہے جو کسی ناگہانی حادثے کا شکار ہو کر وقتی طور پر اپنی یادداشت کھو بیٹھا ہے اور ہذیان میں چلاتا ہے: "میں بنگالی ہوں۔ نہیں، پاکستانی ہوں۔ نہیں، سندھی ہوں۔ بلوچ ہوں۔ پختون ہوں۔ بلکہ پنجابی ہوں"۔

اسے سکون اور آرام پہنچانے کی خاطر معالجوں نے اپنی دانست کے مطابق بلاشبہ ٹیکے لگائے ہیں، لیکن اس کی کھوئی ہوئی یادداشت کی واپسی یا گمشدہ شناخت کی دوبارہ دریافت کے لئے اقبال کے نسخے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بیرنگ نہ ہو ادراک!
اک شرع مسلمانی، اک جذب مسلمانی
ہے جذب مسلمانی سر فلک الافلاک!
اے رہرو فرزانہ! بے جذب مسلمانی
نے راہ عمل پیدا، نے شاخ یقیں نمناک!

پس جب تک ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی، فصل خزاں کا مریض نزع کے عالم میں بھی امید بہار پر زندہ ہے۔ فطرت کا اصول ہے کہ خزاں کے موسم میں اگر کوئی ٹہنی کسی درخت سے ٹوٹ جائے تو وہ کبھی ہری نہیں ہوتی۔ اس ٹوٹی ہوئی ڈالی کے انجام میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ جو شاخیں دور خزاں میں شجر کے ساتھ پیوست رہیں، وہی امید بہار رکھ سکتی ہیں۔

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصل خزاں کا دور
خالی ہے جیب گل زر کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوت اوراق میں طیور
رخصت ہوئے ترے شجر سایہ دار سے
شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ!

اقبال اور قومی کردار☆

طلسم "نظام نو" کے اسیر کہتے ہیں کہ حضرت علامہ نے مسلمانوں کو مایوسی کے عالم میں حوصلہ و امید کا پیغام دیا۔ گویا وہ عہد عتیق کا ایک حادثہ تھے جو گزر گیا اور جس کا مطالعہ اب فقط تاریخ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں اب مایوسی کا عالم طاری نہیں' اب رات کی تاریکی چھٹ چکی ہے۔ ممکن ہے رات کی تاریکی ان چند مسافروں کے لئے چھٹ چکی ہو بظاہر مقیم نظر آتے ہیں لیکن جب تک قافلہ ء پاکستان اندھیرے کی زد میں ہے' اقبال کا شعلہ ء نواقندیل کی صورت میں اس کی رہبری کرتا رہے گا۔

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی

جب کبھی شخصی آزادی کا آفتاب غروب ہوتا ہے' رات کے شہبازوں' کی حتی الوسع کوشش یہ ہوتی ہے کہ زندہ اقبال کو عامتہ الناس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے موضوع پر جو کچھ بھی آجکل کہا جاتا ہے' اس میں اندیشہ ء برہمی خداوندان اقتدار زیادہ ہوتا ہے اور اقبال کم۔ یہ انداز مشق کچھ ایسا کہنہ ہو چکا ہے کہ اس میں جدت تاویل کی گنجائش تک نہیں رہی۔ بلاشبہ پیری سے تو شیطان بھی کہنہ اندیش ہو جاتا ہے' اس لیے اس سے گناہ تازہ تر لانے کی توقع رکھنا بیکار ہے۔

حضرت علامہ کے فکری کرب و اضطراب کا اصل باعث کیا تھا؟ ان کی شخصیت کس قسم کے سیاسی و معاشری ماحول کا رد عمل تھی؟ انہوں نے مسلمانوں کو غلام و محکوم پایا اور یہ بھی

☆ ۲۱۔ اپریل ۱۹۶۵ء لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

محسوس کیا کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے متاع کردار جا چکی ہے۔

تھا جو ناخوب' بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

لہٰذا ان کی ساری زندگی اسی مقصد کے لیے وقف ہو گئی کہ غلاموں اور محکوموں کے دلوں میں کیونکر احساس زیاں پیدا کیا جائے۔ ان کا کلام' فکر اور فلسفہ اسی جذبے کو منعکس کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی تنزل کا یہ عالم تھا کہ حضرت علامہ کے سامنے مردہ قوم ہی نہیں بلکہ ایک قبرستان تھا جس میں انسانوں کی ہیئت میں قبریں منتشر تھیں۔ مگر اس کے باوجود وہ مایوس نہ ہوئے کیونکہ انہیں یقین واثق تھا کہ۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اسی یقین کی بنا پر انہوں نے اپنے فکر میں اسلام کے مثالی معاشرے کی از سر نو تشکیل کی۔ یہ مثالی معاشرہ مثالی افراد کے اجتماع ہی سے وجود میں لایا جا سکتا تھا کیونکہ۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک مثالی فرد سے کیا مراد ہے؟ مثالی فرد وہی ہے جسے اپنی انفرادیت کا احساس ہو اور جو اس کا تحفظ کر سکے۔ پس علامہ کی نگاہ میں ہر وہ شخص جو عشق حریت' فقر اور جرأت کی صفات کا حامل ہے' مرد آزاد ہے۔ مرد آزاد کا عمل انہی صفات کے باعث سراپا تخلیقی ہے۔ وہ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے۔ وہ اپنے آپ کو زمانے کے مطابق نہیں ڈھالتا بلکہ زمانے کو اپنے تخیلات اور نظریات کے مطابق ڈھالتا

ہے۔

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز'
زمانہ با تو نسازد' تو با زمانہ ستیز!

مرد حر چونکہ جذبۂ عشق سے سرشار ہے' اس لیے اس کا دل بیدار ہے' آنکھ بینا ہے اور وہ ذاتی منفعت سے بے نیاز ہے۔

محبت خویشتن بینی' محبت خویشتن داری
محبت آستان قیصر و کسریٰ سے بے پروا

محبت ہی کے ذریعے مرد حر کو فقر کا مقام حاصل ہوتا ہے اور حریت دراصل فقر کا سرمایہ ہے۔

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم!

حریت جرأت سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کا تحفظ خطرپسندی سے ہوتا ہے۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد!

یہ تو تھی اس مرد حر کی تعریف جو معاشرۂ اسلامیان ہند سے ناپید ہو چکا تھا۔ فطری امر ہے کہ حضرت علامہ نے اپنی تمام تر توجہ اس دیمک زدہ مال خام کی طرف مبذول کی جو ان کے روبرو تھا۔ سو وہ ان عناصر کی دریافت میں مشغول ہو گئے جن کے باعث امت محمدیہؐ غلامی میں مبتلا تھی۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب جمود ہے۔ جمود نے انھیں کاہل بنا رکھا ہے۔ جمود نے خوف' بزدلی' بدعنوانی اور گدائی ایسی لعنتوں کو ان کی فطرت کا حصہ بنا رکھا ہے۔ مسلمان چونکہ جامد ہے اس لیے کاہل ہے' خوفزدہ ہے' بزدل ہے' بدعنوان ہے' سوالی ہے۔ اور ظاہر ہے جو ملت ان امراض کا شکار ہو وہ غلامی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ علامہ نے محسوس کیا کہ چونکہ مسلمان فقر کی نگہبانی نہیں کر سکا' اس لیے غلامی میں مبتلا ہو گیا ہے۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

قدرت نے اسے نگاہ دور رس عطا کی تھی لیکن غلامی نے اسے کوربین بنا دیا۔

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

غلامی نے اسے ایسے اندیشوں میں جکڑ دیا جن کا حقیقت سے دور کا واسطہ تک نہ تھا۔

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات!

یہی وجہ ہے کہ جو نظام بھی اس پر نافذ کیا گیا، اس کے حسن و قبح کو جانچے بغیر، اس نے اسے بسرو چشم قبول کیا۔

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا
رہے ہیں، اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا!

غلام کو اگر جاہل کہا گیا تو اس نے قبول کیا، اور اگر اس میں کوئی جوہر تھا تو اس جوہر کی قیمت ادا کر کے اسے خرید لیا گیا۔ لیکن اسے شریک حکم کرنا حاکم کی مصلحت کے خلاف تھا کیونکہ غلام، حکومت کا اہل نہیں ہو سکتا تھا۔

مگر یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی
سمجھ گئی ہے اسے ہر طبیعت چالاک
"شریک حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے
خریدتے ہیں فقط ان کا جوہر ادراک"!

علامہ کو ان تمام باتوں کا احساس تھا۔ اسی لیے انہوں نے اس جمود کو توڑا جو غلاموں اور محکوموں پر طاری تھا۔ انہوں نے فرمایا۔

دل مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ
ترا بحر پر سکوں ہے! یہ سکوں ہے یا فسوں ہے؟
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں' نہ خرابیٔ کنارہ!

غلاموں اور محکوموں کے لیے ان کا پیغام حوصلہ افزا تھا۔ علامہ نے انہیں احساس زیاں دلانے کی کوشش کی تھی' انہیں اپنی ذات پر اعتماد کرنا کی تلقین کی تھی' انہیں محسوس کرایا کہ تم ہو' لیکن جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے وہ نہیں ہے۔

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے' تجھے جو کچھ نظر آتا ہے' نہیں ہے!

علامہ کو یقین تھا کہ جونہی غلاموں اور محکوموں کا لہو گرم ہو گیا' حاکمیت کا بت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش'
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو!

اسی بنا پر علامہ نے انہیں امید دلائی کہ جس نظام نے انہیں زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے' جو نظام ان کی آزادی کا غاصب ہے' اس کی موت کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔

الٹ جائیں گی تدبیریں' بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے' نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

لیکن اس نظام کی موت کو قریب تر لانے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے تلقین کی کہ مسلمان اپنی گردن سے ایازی کا طوق اتار پھینکیں اور اپنے دلوں میں جرأت و دلیری پیدا کریں کیونکہ وہی منزل مقصود کا سراغ پاتا ہے جس کی نگاہ خوف آلودہ نہیں ہے۔

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ!

علامہ نے آگاہ کیا کہ اگر مسلمان اپنے آج کا فکر نہیں کریں گے' اگر ان کا آج تاریک رہے گا تو وہ آنے والے کل کے ہنگامے میں حصہ نہیں لے سکتے۔

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

کیا یہ کہنا درست ہے کہ علامہ کے پیغام کی اہمیت اسی وقت تک محدود تھی جب تک مسلمان سیاسی طور پر محکوم تھا' لیکن جب سے اس نے آزادی حاصل کی ہے یا جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے' اس کی غلامی اور محکومی کی داستان محض ایک داستان پارینہ بن کے رہ گئی ہے؟ اگر ہم علامہ کے افکار کی روشنی میں ملت پاکستان کے سیاسی و معاشری ماحول کا جائزہ لیں، تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ گو ہم نے بظاہر آزادی حاصل کر رکھی ہے مگر حقیقت میں ہماری فطرت سے غلامی اور محکومی کی لعنتیں دور نہیں ہوئیں- یہی وجہ ہے کہ سیاسی اور معاشری اعتبار سے ہم پر مسلسل جمود طاری ہے اور نتیجتہ" خوف' بزدلی' بدعنوانی اور گداگری ایسی علتیں من حیث القوم ہماری فطرت کا حصہ بن چکی ہیں- ہمارے جسم آزاد سہی' ہمارے ذہن محبوس ہیں' اور جب تک ہمارے ذہن محبوس رہیں گے' اقبال ہم سے مخاطب ہوتے رہیں گے- ۔

جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہؒ نے ملت اسلامیہ کو احساس زیاں دلایا' ان کے خوابیدہ دلوں کو بیدار کیا' انہیں آگاہ کیا کہ ان کے ہاتھ سے متاع کردار جا چکی ہے- لیکن اس کے ساتھ ہی علامہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ کسی قوم کے کردار کی تعمیر کے لیے حکومت پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں- آپ فرماتے ہیں:

> "الگزینڈر پوپ کا قول ہے کہ نظام حکومت کی طرزوں پر جھگڑنا بیوقوفوں کا کام ہے- لیکن میں اس فلسفہ سے اتفاق نہیں کرتا- میری نگاہ میں' نظام حکومت چاہے کسی طرز کا ہو' اس کی اہمیت اس اصول سے پرکھنی چاہیے کہ آیا وہ کسی قوم کے کردار کی تعمیر کرتا ہے یا تخریب-"

ان خیالات سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ کی نگاہ میں صحیح اور پختہ عقائد پر مبنی نظام حکومت کا نفاذ کسی قوم کی اخلاقی اصلاح یا تعمیر کردار کے لیے اشد ضروری ہے-

دین ہو' فلسفہ ہو' فقر ہو' سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر!
حرف اس قوم کا بے سوز' عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر!

اب اس سوال پر غور کیجئے کہ قیام پاکستان کے بعد دھوپ چھاؤں کی طرح جو حکومتیں ہم پر مسلط اور غیر مسلط ہوتی چلی آ رہی ہیں' کیا وہ ہمارا ملی کردار تعمیر کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں؟ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مناسب سیاسی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں آج تک جو تجربے بھی پاکستان میں کیئے گئے ہیں' ایسی لاپروائی اور ایسی بے دردی سے کیئے گئے ہیں کہ وہ ہمارے ملی کردار کی مسلسل تخریب کا باعث بنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملت پاکستان مثالی سیاسی قیادت پیدا کرنے سے قطعی طور پر محروم رہی ہے۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا' کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

ہمیں اقبال نے اپنی کشت ویراں کہا تھا۔ لیکن وہ ہم سے ناامید نہیں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے۔ جب اس مٹی کو' قائداعظم جیسی شخصیت نے نم دیا تو اس مٹی سے پاکستان کا بیج پھوٹ نکلا۔ آج ہم سنتے ہیں کہ یہ مٹی تو نری بنجر ہے۔ اس مٹی میں پھل پھول اگا سکنے کی اہلیت نہیں۔ اس مٹی کو پاؤں تلے ہی روندا جا سکتا ہے۔ اس مٹی پر محل تو تعمیر ہو سکتے ہیں لیکن اس مٹی کو سیراب نہیں کیا جا سکتا۔ خیر' یہ تو مالی کی دانست کا قصور ہے یا ان ساحروں کے فسوں کا نتیجہ ہے جنہوں نے ابلیسانی سیاست کے حریف ہونے کا دعویٰ کر رکھا ہے۔

تری حریف ہے' یا رب! سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس!

غور طلب مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارے ملی کردار کا دیوالیہ پن اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ہم سب بظاہر خداوند تعالیٰ کی ذات پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن درحقیقت ہمارے گردوپیش نے ہمیں یہ گمان کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر اس قدر دور ہے کہ اسے نعوذ باللہ ہماری مشکلات اور زبوں حالی کی خبر تک نہیں پہنچتی لہٰذا وہ ضرورت کے وقت ہماری مدد کو نہیں آ سکتا' نہ ہی زندگی میں آرام کی معروف مادی آسائشیں مہیا کر سکتا اس کے بس کی بات ہے' اس لیے ان خود ساختہ ادنیٰ خداؤں پر ایمان رکھنا جو ہمارے درمیان انسانی روپ میں بستے ہیں' از بس ضروری ہے۔ ان خداوندان اقتدار کی خوشنودی ہم اپنے ضمیر کی عصمت کی قربانی دے کر حاصل کرتے ہیں اور ہم کسی قیمت پر بھی ان کا قہر مول لینے کو تیار

نہیں کیونکہ ہمیں احساس ہے کہ جب تک یہ چھوٹے خدا ہم سے خوش ہیں، زندگی بامعنی ہے۔ سو ہم پر من حیث القوم خدا کے خوف کی جگہ خداوندان اقتدار کے خوف نے لے لی ہے۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے!
بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!
اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآل سکندری کیا ہے!

بلاشبہ خداوند تعالیٰ خالق ارض و سموات ہے لیکن ہمارے گردوپیش نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ 'گداؤں' اور 'سوالیوں' کے مادی آرام کے لیے آسائشیں مہیا کرنے کی قوت خداوندان اقتدار کو تفویض کر دی گئی ہے، سو اگر ہمیں اپنی اپنی زندگیوں کو آرام دہ بنانا مقصود ہے تو ان خداوندان اقتدار کو خوش رکھیے، ان کے قہر چنگیزی سے ڈریے کیونکہ اگر وہ ناراض ہو گئے تو پلک جھپکنے میں ہمیں تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کی گرفت ہمارے پیٹ پر اس مضبوطی سے پڑتی ہے کہ "آناً فاناً" ہمارا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ پس ہماری تمام تر دعائیں، مناجاتیں، قصیدے انہی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہیں۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے، تری آرزو بدل جائے!

جس قوم کے کردار کی تخریب کی یہ حالت ہو، اس کا فلسفہ ء حیات کیا ہوگا؟ یہی کہ ہمیں بہ عالم مجبوری اس وقت تک زندہ رہنا ہے، جب تک موت نہیں آتی۔ پس، کسی اصول کی خاطر زندہ رہنا بالکل بے مقصد ہے۔ ہم تو موت کے انتظار میں زندہ ہیں۔ موت اصل حقیقت ہے۔ اس لئے زندگی کا بوجھ، اس انتظار کی کیفیت میں، جس قدر بھی کم ہو جائے، غنیمت ہے۔ خداوندان اقتدار کی خوشنودی اس بوجھ کو ہلکا کر سکتی ہے۔ مادی آسائشوں

کے ذریعے زندگی آرام دہ بنائی جا سکتی ہے تاکہ جب موت کا وقت آئے تو یہ محسوس کر کے تسکین ہو کہ کم از کم میت تو آسودگی سے اٹھے گی۔

ظاہر ہے یہ فلسفہء حیات ہمارے یہاں کس قسم کی 'اخلاقی قدروں' کو جنم دے رہا ہے۔ خوف، بدعنوانی، بزدلی، گدائی، بے ضمیری، خوشامد، موقع پرستی، یہ فلسفہء حیات غلاموں اور محکوموں ہی کا ہو سکتا ہے، مرد آزاد کا نہیں ہو سکتا۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟
اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم؟

ایازی فطرت اور غلامانہ ذہنیت کے باعث ہی ہمارے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کا حل ہمیں نہیں ملتا۔ جس کسی کے ہاتھ میں کرسی اقتدار آ جاتی ہے اور جو بے ضمیر موقع پرست اس کی خوشامد کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں، وہ تو آزاد کہلاتے ہیں، محبان وطن سمجھے جاتے ہیں اور دولت و ثروت ان کے قدم چومتی ہے۔ لیکن جو حلقہء اقتدار سے باہر ہوتے ہیں، جو موقع پرستی یا خوشامد کی اہلیت نہیں رکھتے، جو دست سوال دراز نہیں کرتے، وہ تخریب پسندوں یا وطن دشمنوں کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں، اور غالباً انہی سے حضرت علامہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

○

شریعت اسلامیہ اور علامہ اقبالؒ ☆

۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کے دن یوم اقبال کی منعقدہ تقریب پر قائداعظمؒ نے ارشاد فرمایا کہ "اقبال ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے ابتدا ہی سے برصغیر کے شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے امکان کے بارے میں سوچا"۔

اپنی تقریر کا اختتام انہوں نے اس طرح کیا کہ

"میں دعا کرتا ہوں کہ ہم سب اپنے قومی شاعر کے ان تخیلات کو حاصل کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش اس وقت کریں گے جب پاکستان کے نام سے ایک آزاد مملکت قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

قائداعظم کی تقریر کے اس اقتباس میں جو بات خاص طور پر غور طلب ہے' وہ یہ ہے کہ انہوں نے علامہ اقبال کے تصورات کے ضمن میں اسلامی مملکت کا ذکر کیا ہے' مسلم مملکت کا نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر وہ مملکت مسلم کہلا سکتی ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو' خواہ وہ مملکت سیکولر ہی کیوں نہ ہو۔ اس بارے میں ترکی اور بعض مسلم ممالک کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ قائداعظمؒ کی مراد یہی تھی کہ علامہ اقبال کا شریعت اسلامیہ کے متعلق ایک مخصوص تصور تھا جس کو وہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں نافذ دیکھنا چاہتے تھے۔

پیشتر اس کے کہ ہم علامہ اقبال کے نزدیک شریعت اسلامیہ کی تعریف کے بارے میں بحث کریں' اپنے سوال کے صحیح جواب کے لئے ہمیں تاریخ اسلامی پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ رسول اکرمؐ کے دور امامت میں ریاست مدینہ کے مسلمان شہری شریعت کے مطابق اپنی زندگی

☆ "نوائے وقت"۔ ۳ مئی ۱۹۹۱ء

گزارتے تھے اور اس کے قانونی طور پر نفاذ کی ضرورت اس لئے محسوس نہ ہوئی کیونکہ ان کے نزدیک شریعت ایک کامل ضابطہ ء حیات تھا اور وہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر پورے طور سے حاوی تھا۔ یہی صورت خلفائے راشدین کے دور میں بھی قائم رہی اور ہونا بھی ایسے ہی چاہئے تھا کیونکہ ضابطہ ء حیات کسی بل یا ایکٹ کی صورت میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں جمہوریت کا دور دورہ تھا اور شہریوں کے بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہر شہری کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا بھی ریاست یا حکومت وقت کے ذمے تھا۔ اسی اعتبار سے شریعت اسلامیہ سے مراد ایک ایسا ضابطہ ء حیات تھی جو مسلمانوں کی اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی زندگی پر حاوی ہو۔ جب حضرت ابوبکرؓ مدینہ کی اسلامی مملکت کے سربراہ منتخب کئے گئے تو انہوں نے اپنی تقریر میں یہ واضح طور پر کہا تھا کہ

"میں آپ سب کی اطاعت کا مستحق تبھی ہوں اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میرا عمل صحیح ہو تو میری حمایت کریں، اگر غلط ہو تو مجھے ٹوکیں۔ میرے لئے امیر اور غریب برابر ہیں اور مسلم معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے میں سب کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کروں گا۔"

اس تقریر کی روشنی میں قرآنی آیت اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اولی الامر یا حاکموں کی اطاعت اسی صورت میں واجب ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی اطاعت کریں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ مسلمانوں کی اطاعت کے مستحق نہیں اور انہیں معزول کیا جا سکتا ہے۔ پس، شریعت اسلامیہ کے متعلق یہی عمومی تصور تھا کہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام میں خوشی یا سعادت کی تحصیل کا دہرا تصور موجود ہے۔ یعنی اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی نظام قائم کرے جس کے ذریعے اس کے شہری مادی آسائشوں کے ذریعے اس دنیا میں بھی خوشی حاصل کر سکیں اور انہیں آخرت میں بھی خوشی حاصل کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔

خوشی کی تحصیل کے متعلق یونانی تصور یہ تھا کہ انسان صرف اسی دنیا میں خوشی حاصل کر سکتا ہے، اور کہیں نہیں۔ عیسائیت نے یہ تعلیم دی کہ یہ دنیا ناپاک ہے اس لئے یہاں خوشی حاصل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا خوشی صرف اگلے جہان میں حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن جس طرح میں نے عرض کیا ہے، اگر شریعت اسلامیہ کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو

اس سے خوشی کا دہرا تصور ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ اسلام سے ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین کے دور کے خاتمے کے بعد جو ۶۶۱ء میں ہوا' ملوکیت کا دور قائم رہا جس کا خاتمہ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں کیا۔ اس تیرہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے سبب وہ شہری نہ رہے بلکہ رعایا بن گئے۔ خداخوفی کا جو تصور رسول اکرمؐ یا خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں تھا' وہ یہ تھا کہ اللہ کے احکام اس لئے مانے جائیں کہ محبوب ناراض نہ ہو' یعنی اطاعت شریعت سے مراد عشق الٰہی تھا۔ لیکن ملوکیت کے دور میں سلطان ظل الٰہی بن گیا' یعنی خدا کا سایہ بن گیا۔ اور چونکہ سلطان اپنی مطلق العنانی کے سبب ظالم اور جابر تھا تو ظاہر ہے کہ جب اللہ کے "سائے" کی یہ حالت ہو تو اللہ کس قدر جابر و ظالم ہوتا۔ گویا ملوکیت کے دور میں خداخوفی کا تصور بدل گیا۔ خدا محبوب نہ رہا' وہ جبار اور قہار بن گیا۔ ملوکیت ہی کے دور میں سربراہ مملکت مجتہد نہ رہا جس طرح خلفائے راشدین مجتہدین تھے۔ اس دور میں امام غزالی' امام ابو حنیفہ' الماوردی اور ابن جابر جیسے علماء اور فقہاء نے ایسے فتوے دیے جن میں سربراہ مملکت کے لئے اجتہاد کرنے کی شرط کالعدم قرار دے دی گئی اور اس کا اختیار انفرادی علماء کے ہاتھ میں سونپ دیا گیا۔ ان علماء و فقہا کے ذریعے یہ بھی قرار دیا گیا کہ اگر کوئی غاصب بھی اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور وہ رعایا کو مسجدوں میں نماز پڑھنے یا روزے رکھنے سے نہیں روکتا اور خود بھی اللہ کے قائم کردہ حدود میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گزارتا ہے تو اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ یہ علماء و فقہاء اس حد تک چلے گئے کہ اوپر درج کردہ قرآنی آیت کی تفسیر اس طرح کی جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اولی الامر یا حاکم کی اطاعت اپنی اور رسولؐ اللہ کی اطاعت کے برابر کر رکھی ہے' لہٰذا جو مسلمان بھی حاکم وقت کی (خواہ وہ غاصب ہی کیوں نہ ہو) اطاعت نہ کرے گا تو یہ صورت اسی طرح ہو گی جیسے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے منکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنی فقہ میں انقلاب کا کوئی تصور موجود نہیں جبکہ ایسی صورت شیعہ فقہ میں نہیں ہے۔ ملوکیت ہی کے دور میں علماء نے شریعت اسلامیہ کو اوامر و نواہی کے قوانین کا مجموعہ قرار دیتے ہوئے انہیں حدود و تعزیرات تک محدود کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت اسلامیہ صرف عدلیہ تک محدود ہو گئی۔ سیاست پر غاصب مقتدر ہو گئے۔ اقتصادیات کے میدان میں یہ امراء کے لئے تو بہشت لیکن غریب مسلمانوں کے لئے ایک طرح سے قید خانہ بن گئی حالانکہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں آنحضورؐ کی حدیث کے مطابق مومنوں کے لئے وہ بجن تھی اور کافروں کے لئے بہشت۔ بہرحال' شریعت

کا تصور بطور کامل ضابطہء حیات جو اخلاقی' سیاسی اور اقتصادی زندگی پر حاوی ہو' مسلم فلاسفہ کے ہاں موجود رہا۔ اگر آپ الفارابی' ابن سینا یا ابن رشد کی کتب پڑھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان کے ہاں شریعت اسلامیہ کے معنی اسلامی ریاست میں ایک ایسے نظام کا قیام ہے جو مسلمانوں کی اخلاقی' سیاسی اور اقتصادی فلاح کا باعث بن سکے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو ان فلاسفہ کے نزدیک ریاست اسلامی نہیں کہلا سکتی بلکہ ناقص ریاستوں میں اس کا شمار ہو گا۔

علامہ اقبالؒ کی تحریروں میں بھی شریعت اسلامیہ کے بارے میں وہی تصور موجود ہے جو مسلم فلاسفہ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ جس طرح قرون وسطیٰ میں علماء حضرات نے فلاسفہ کی مخالفت کی اور انہیں کافر قرار دیا' اسی طرح علمائے ہند کی اکثریت نے اقبالؒ کے تصورات کی بھی مخالفت کی اور انہیں کافر قرار دیا گیا۔ "رموز بے خودی" میں شریعت بطور کامل ضابطہء حیات کی تعریف میں علامہ اقبال فرماتے ہیں:

در شریعت معنی دیگر مجو   غیر ضو در باطن گوہر مجو
ایں گہر را خود خدا گوہر گر است   ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علم حق غیر از شریعت ہیچ نیست   اصل سنت جز محبت ہیچ نیست

(یعنی شریعت کے ایک ہی معنی ہیں کوئی اور نہیں' کیونکہ موتی میں روشنی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس موتی کو بنانے والا چونکہ خدا خود ہے' اس لئے اس کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ شریعت دراصل علم حق ہے اور اصل سنت محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔)

اقبال کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ وہ ایک نیا مسلم معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس معاشرے کے قیام کے لئے انہوں نے سب سے زیادہ زور تعلیم پر دیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر' بقول اقبال اسلامی اخلاق تعلیم ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے نزدیک ضروری ہے کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کی تعلیم عام کی طرف خاص توجہ دے تاکہ ان کا اخلاق صحیح طور پر اسلامی ہو سکے۔

جہاں تک مسلم سیاست کا تعلق ہے' اقبال سمجھتے تھے کہ جمہوری نظام کا قیام کسی بھی اسلامی ریاست میں اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؒ بھی مسلم فلاسفہ کی طرح شریعت اسلامیہ کی اخلاقی اور سیاسی اہمیت کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر انہوں نے سب سے زیادہ زور اس دور میں شریعت کے اقتصادی پہلو پر دیا ہے۔

اقبال کو یقین تھا کہ شریعت اسلامیہ کو اگر معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شہری کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ ان بنیادی ضروریات کی تعداد چھ ہے۔ یعنی کھانے کو روٹی، تن ڈھانپنے کو کپڑا، سر چھپانے کو مکان، تعلیم، روزگار، اور طبی سہولت۔

آپ نے اپنے خط بنام قائداعظم مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں لکھا:

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جا سکتی ہے؟ لیگ کا تمام مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ مسلمانوں کو افلاس سے چھٹکارا دلانے کا وعدہ نہیں کرتی تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اب بھی اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی شریعت کے نفاذ اور وقت کے جدید تقاضوں کی روشنی میں اس کے ارتقاء کے ذریعے ایسے تمام مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ کے طویل اور عمیق مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اسے معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر شہری کی بنیادی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور ارتقاء اس ملک میں کبھی ممکن نہیں جب تک کہ ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔"

اسی طرح ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے "زمیندار" اخبار میں اقبال کا ایک خط شائع ہوا جس میں آپ نے فرمایا:

"میرا عقیدہ ہے، اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے ..... مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اور روسی اشتراکیت، دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن ہمیں بتاتا ہے ..... شریعت اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے، اور اس مدعا کے حصول کے لئے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے ..... مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے شریعت کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔"

"جاوید نامہ" میں جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، جمال الدین افغانی کے منہ سے کہلواتے ہیں۔

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

(قرآن کیا ہے؟ امیروں، سرمایہ داروں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ وہ بے کسوں اور ناداروں کا دستگیر ہے) پھر "ضرب کلیم" کی نظم "اشتراکیت" میں فرماتے ہیں ۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں!
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرف 'قل العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

حرف "قل العفو" سے مراد وہ دولت ہے جو ضرورت سے زائد ہے یا فالتو ہے اور جس کو ملت کی فلاح و بہبود کے لئے دیا جانا چاہیے، اور جدت کردار سے مراد علامہ کے نزدیک اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق ایک ایسا اجتہاد کرنے سے ہے جو روح کے اعتبار سے انقلابی ہو۔ یہی تصور "ارمغان حجاز" کی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں بھی موجود ہے۔ ابلیس کے منہ سے کہلواتے ہیں۔

جانتا ہوں میں، یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر، آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

"پس' اقبال کے ہاں شریعت سے مراد پاکستان میں ایک ایسے اقتصادی نظام کا قیام ہے جو کہ مسلمانوں کی روٹی کا مسئلہ حل کر سکے اور بنیادی طور پر انقلابی ہو۔ لیکن کیا ہمارے علماء و فضلا نے کبھی اس طرف توجہ دی ہے کہ آجکل انسان اسی دنیا میں اور اسی وقت آسودہ زندگی اور خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے اور آخرت میں اس خوشی کے حصول کا انتظار نہیں کرنا چاہتا۔ اسے دور ملوکیت میں پروان چڑھتے ہوئے خدا خوفی کے تصور کی کوئی پروا نہیں کیونکہ جس کی زندگی یہیں دوزخ ہو' اسے آپ کس دوزخ سے خوف زدہ کر سکتے ہیں! اب تو خدا خوفی کا صرف وہی تصور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جو عشق الٰہی پر قائم ہو اور یہاں احکام الٰہی کی اطاعت اس لئے کی جائے کہ کہیں محبوب ناراض نہ ہو جائے نہ کہ اس لئے کہ مجھے جابر کے قہر کا خوف ہے' کیونکہ وہ قہر تو غریب پر اب بھی گزر رہا ہے!

○

اقبال اور شیطان☆

(۱)

فکر اقبال کی شیطانی تعبیروں میں سے ایک، جو استبداد کے چیلے بڑے انہماک سے پیش کرتے ہیں، یہ ہے کہ علامہ اقبال جمہوری نظام کے خلاف تھے۔ اس سلسلے میں وہ علامہ کے اشعار کچھ اس انداز سے ہمارے سامنے رکھتے ہیں جس طرح شیطان مسلمانوں کو راہ مستقیم سے بھٹکانے کے لئے آیات قرآنی کی اپنی تاویل پیش کرتا ہے۔ ان لوگوں کا منتہائے نظر محض یہ ہے کہ مسلمانان پاکستان اقبال اور قائداعظم کے متعین کردہ رستے سے ہٹ کر اس نئے رستے پر گامزن ہو جائیں جو شیطان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ کیا وہ ہمیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ یہ فکر اقبال کی تہ تک پہنچنے کے لئے ہماری طلب کے صدق پر منحصر ہے۔

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی!
وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے
طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی!

ہمیں باربار یہ تو بتایا جاتا ہے کہ علامہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے معمار تھے، لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ ہمارے 'آج' کے لئے ان کا پیغام کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر 'زندہ اقبال' ہماری نگاہوں سے اوجھل رکھا جاتا ہے تاکہ ملت پاکستان کا تن رہے روح مر جائے۔ روح کی

☆ ۲۱۔ اپریل ۱۹۶۶ء کو لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

موت وقوع پذیر ہوتے ہم دیکھ تو رہے ہیں لیکن بے بس اور پریشان ہیں کہ خدا بھی ہماری مدد کو نہیں آتا۔

ترا تن روح سے نا آشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تن بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ' زندوں کا خدا ہے!

ان مایوس کن حالات کے باجود فکر اقبال کی صحیح تعبیر کے لیے جستجو کرنا ہمارے اپنے بس میں ہے کیونکہ بقول اقبال۔

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب!

جب کسی قوم کی غلامانہ ذہنیت کو بدلنے کے ذرائع مسدود کر دیئے جائیں اور ان میں آزادی کا شعور پیدا ہونے سے روک دیا جائے تو ظاہر ہے علم و عرفان کے میدان میں ایسے 'معمول' ہی پیش پیش ہوں گے جو خود حرکت میں نہیں آتے بلکہ لائے جاتے ہیں۔ ایسے 'خدایان خانقاہی' فکر اقبال کی تعبیر 'شرع آمرانہ' کے مطابق ہی کر سکتے ہیں خواہ انہیں جدت معانی کی خاطر فضائے گردوں کی خاک کیوں نہ چھاننی پڑے۔

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں مجھے خدایان خانقاہی
انہیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگ آستانہ
غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے' فضائے گردوں ہے بے کرانہ

بات اس شیطانی تشریح سے چلی تھی کہ اقبال جمہوری نظام کے خلاف تھے۔ میرا مقصد اس موقع پر علامہ کے نظریہ ء جمہوریت کی وضاحت کرنا نہیں' وہ تو ہم پر واضح ہے۔ مگر میں اس تشریح میں مضمر شیطان کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ کس طرز کے جمہوری نظام کے خلاف تھے۔ دراصل میں آپ کے مطلب کی نہیں کہہ رہا بلکہ انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں جیسا کہ مولانا اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں' زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں' چراغ میرا ہے رات ان کی

انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کا سب سے بڑا اور پرانا حریف شیطان ہے۔ مگر

ہماری زندگیوں میں اس کے عمل دخل کے متعلق زیادہ تحریر نہیں کیا گیا حالانکہ اپنے مدمقابل کا مقابلہ کرنے سے پیشتر ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم کس سے نبرد آزما ہیں۔ علامہ اقبال کے تصور شیطان کے بارے میں، چند برس ہوئے، ایک نہایت ہی دلچسپ مقالہ اطالوی مستشرق بوسانی نے تحریر کیا، لیکن چونکہ یہ مضمون اطالوی زبان میں لکھا گیا تھا، اس لئے پاکستان میں مقبول نہ ہو سکا۔

بوسانی کی نگاہ میں اقبال کے 'شیطان' کے پانچ اہم پہلو ہیں :۔

پہلا یہ کہ شیطان حسن تدبیر اور عمل پیہم کے معاملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ دوسرا یہ کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ضد ہے یعنی خدا خیر کا سرچشمہ ہے، شیطان شر کا منبع ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود عاشق توحید ہے۔ اس نے ابدی فراق اور عذاب قبول کیا لیکن خدا کے سوا کسی اور کے سامنے سربسجود ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ چوتھا یہ کہ وہ خدا کی تخلیقات میں سے ایک ہے۔ اس نے حسد اور تکبر کی بنا پر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ خدا نے آدم میں اپنی روح پھونک رکھی تھی اور اسے اشرف المخلوقات قرار دے کر اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا۔ مگر شیطان نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اسے 'دوں نظر و کم سواد' یعنی کوتاہ بین، بے شعور اور جاہل کے القاب سے پکارا اور اپنی نسلی برتری کی متکبرانہ دلیل دے کر اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا اس کے انکار کی وجہ نہیں تھی کہ وہ بلحاظ عبادت گزاری یا اعمال صالح آدم سے افضل تھا بلکہ نسلی امتیاز کے منطق استدلال کی بنیاد پر اپنے آپ کو آدم سے اعلیٰ قرار دیا۔ اس اعتبار سے شیطان عشق کے مقابلے میں عقل کے منفی اور گمراہ کن استدلال پر ہمیں اعتماد کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ شیطان کو بطور سانپ اسی لئے تصور کیا جاتا ہے کہ سانپ اپنے مدمقابل پر ہمیشہ سر (یعنی عقل) سے حملہ آور ہوتا ہے لیکن مرد کامل اس کا وار اپنے قلب (یعنی عشق) کی ڈھال سے روکتا ہے۔

پانچواں اہم پہلو شیطان کی سیاسی شخصیت ہے۔ بوسانی اور دوسرے مستشرقین کے نزدیک یہ پہلو شیطان سے متعلق ادب میں علامہ کا اچھوتا تخلیقی اضافہ ہے۔ اقبال کا 'شیطان' اگرچہ مندکرہ بالا پانچ مختلف نوع کے تصورات کے امتزاج سے تخلیق کیا گیا، لیکن اس کے باوجود علامہ کے ہاں اس کا تصور بنیادی طور پر خالصتاً اسلامی ہے۔

بحیثیت ایک سیاسی شخصیت شیطان کے مشاغل کیا ہیں؟ تاریخ اسلام میں اس کا کردار کیا رہا ہے؟ وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر عملی طور پر کیا کچھ کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہے؟ یہ شیطان کی

شخصیت کا ایک ایسا اہم پہلو ہے جس کے متعلق اندریں حالات مسلمانان پاکستان کے لئے علامہ کے ارشادات سے باخبر ہونا ازبس ضروری ہے۔

انکار شیطان کے پس پشت دو منفی جذبات کارفرما تھے' ایک حسد اور دوسرا تکبر۔ شیطان' آدم سے حسد اس لئے کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ عطا کر کے اپنا خلیفہ یا نائب مقرر کر رکھا ہے۔ ساتھ ہی تکبر کی شیطانی کیفیت عشق اور محبت کی بجائے نسب کی برتری کے منطقی استدلال پر قائم ہے۔ اب اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی اعتبار سے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں کیفیت انکار شیطان کی تکرار کیونکر وقوع پذیر ہوتی رہی ہے۔ چونکہ شیطان' آدم کے خلیفتہ اللہ کی منزل تک پہنچنے کے رستے میں حائل ہے' اس لئے وہ آزادی جمہور کا مخالف ہے۔ پس تاریخ اسلام میں اس کی کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ جمہوریت کا خاتمہ کر کے آمریت یا ملوکیت نافذ کی جائے۔ وجہ ظاہر ہے' شیطان فرد واحد کو باسانی مغلوب کر سکتا ہے لیکن جماعت کے قریب خوف کے مارے نہیں پھٹکتا' جیسا کہ علامہ "رموز بیخودی" میں حدیث نبوی کے حوالے سے واضح کرتے ہیں سہ

حرز جاں کن گفتۂ خیر البشرؐ
ہست شیطاں از جماعت دور تر

اس کے ساتھ ہی شیطان کی تمنا ہے کہ مسلمانوں میں نسلی' قبائلی' فرقہ وارانہ اور دیگر قسم کے امتیازات و تعصبات دائمی طور پر قائم رکھے جائیں تاکہ وہ کسی بھی صورت میں متحد نہ ہو سکیں۔ کیونکہ اگر وہ متحد ہو گئے تو آئین پیغمبرؐ کے نفاذ پر اصرار کریں گے' اور اگر آئین پیغمبرؐ نافذ ہو گیا تو جمہوریت اور معاشری انصاف کا دور دورہ ہو گا۔ آدم کے بحیثیت خلیفتہ اللہ جو حقوق اور ذمہ داریاں ہیں' ان کا احساس اس کے دل میں پیدا ہو گا اور شیطان کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

پس' تاریخ اسلام کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ کس طرح شیطان' اسلام کے ابتدائی دور میں ہی جمہوریت کا خاتمہ کر کے مسلمانوں پر اموی آمریت نافذ کرنے میں کامیاب ہوا' کیونکر مسلمانوں کے ذہنوں میں نسلی' قبائلی' فرقہ وارانہ اور دیگر قسم کے تعصبات اجاگر ہوئے' کس طرح دنیائے اسلام کی وحدت پارہ پارہ ہوئی اور ایک کی بجائے ممالک اسلامیہ میں بیک وقت تین مختلف خلافتیں وجود میں آئیں' خلاف عباسیہ کے آخری دور یعنی بارہویں صدی عیسوی میں کیونکر امت محمدیؐ سلاطین و ملوک کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی۔ نوبت یہاں تک

پہنچ گئی کہ عامتہ المسلمین کے سامنے دو رستے تھے --- استبداد یا ابتری --- اس دور میں امام غزالیؒ نے مشورہ دیا کہ استبداد قبول کرو لیکن ابتری کی راہ کسی صورت میں بھی اختیار نہ کرو۔ مسلمانوں نے امام غزالیؒ کی رائے پر عمل کیا اور استبداد کو بسروچشم قبول کیا۔ لیکن چند سو سالوں کے بعد یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں بغداد پر منگولوں کے حملے کے باعث دنیائے اسلام میں ایسی ابتری پھیلی کہ تاریخ اقوام میں اس کی مثال تک نہیں ملتی۔ تاریخ اسلام ہمیں یہ عبرت ناک سبق سکھاتی ہے کہ ابتری دراصل استبداد کی علت یا نتیجہ ہے۔ جب کسی قوم کی تباہی قریب ہو تو پہلے دور استبداد آتا ہے اور پھر ابتری ایک وبا کی طرح پھوٹتی ہے۔

آج بھی شیطان دنیائے اسلام میں برسر عمل ہے اور اس نے یہ کیفیت طاری کر رکھی ہے کہ عامتہ المسلمین کو ہر اسلامی ملک میں ابتری سے بچنے کی خاطر استبداد کی راہ قبول کرنا پڑ رہی ہے۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ملکوں میں جمہوریت کی بجائے آمرانہ یا ملوکانہ نظام نافذ ہے اور قوم پرستی کا شیطانی استدلال ان کے متحد ہونے کے رستے میں حائل ہے۔

شیطان اپنا مقصد حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب ہوتا ہے' اس کے لئے بقول اقبال اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ وہ اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر خاک سے شیاطین تعمیر کرتا ہے۔ خاکی شیاطین اپنے آقا کا ہر حکم بجا لانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ چونکہ وہ نہیں چاہتے کہ آدم بحیثیت خلیفتہ اللہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہو' اس لئے وہ بھی شیطان کی طرح آزادی جمہور کے مخالف ہوتے ہیں۔ پس' وہ انکار شیطان کی پرانی دلیل اپنے نئے پہلودار الفاظ میں دہراتے ہیں کہ عوام کوتاہ بین' بے شعور اور جاہل ہیں اس لئے اپنے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے اہل نہیں۔ ان کے معاملات کی دیکھ بھال تو صرف خواص ہی کر سکتے ہیں---- حالانکہ خواص کے ذریعے کبھی کسی قوم کا مستقبل نہیں سنورا کیونکہ خواص کسی قوم کے نیک و بد سے لاتعلق ہوتے ہیں۔ اگر صدق و صفا کی قدروں کو تلاش کرنا مقصود ہو تو وہ عوام ہی میں پائی جاتی ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں۔

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام
دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

صدق و صفا کی قدروں کو نیست و نابود کرنا خاکی شیاطین کا فرض اولیں ہوتا ہے۔ عوام کے حقوق سلب کر لینے کے بعد وہ ایک ایسا نظام نافذ کرتے ہیں جس کی بہت سی سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ ان سیڑھیوں کے مطابق وہ تعین مراتب کرتے ہیں تاکہ پیادہ اور فرزیں میں امتیاز قائم رکھا جا سکے۔ پھر شاطر کے لئے کھیل کا سامان مہیا کیا جاتا ہے اور شاطر' شیطان کے

اشاروں پر کھیل کھیلتا ہے۔

اس کھیل میں تعیین مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں، میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ!

جب شاطر سمجھتا ہے کہ عوام بند غلامی کی سختی کو محسوس کرنے لگے ہیں تو "نفسیات حاکمی" کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے وہ آپ ہی آپ اپنے نظام میں تبدیلیوں کا اعلان کرتا ہے اور اصلاحات نافذ کی جاتی ہیں تاکہ اسیروں کو اسیری گوارا ہو سکے۔

یہ مہر ہے بے مہری صیاد کا پردہ
آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری
رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری!

وہ اپنی جدت احکام پر پھولے نہیں سماتا اور باربار اس کا ڈھنڈورا پٹواتا ہے، لیکن ان اصلاحات میں بھی اس کا مکر یا فریب پنہاں ہوتا ہے جسے بے بس عوام سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

موت ہے اک سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکروفن خواجگی کاش سمجھتا غلام!
شرع ملوکانہ میں جدت احکام دیکھ
صور کا غوغا حلال، حشر کی لذت حرام!

مگر کچھ عرصے کے بعد صور کا غوغا بھی حرام قرار دے دیا جاتا ہے اور ایک بار پھر معاشرہ بندگی آدم کی تاریک رات میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے اندھے پن میں انسان کے سامنے جھکنے لگتا ہے۔ اگرچہ وہ اشرف المخلوقات ہے اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے اسے ضمیر کا گوہر عطا ہوا ہے، لیکن وہ اسے فرمانرواؤں کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے اور خوئے غلامی میں اس قدر ذلیل ہوتا ہے کہ کتوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ آج تک کسی نے ایک کتے کو دوسرے کتے کے سامنے سر جھکاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد

یعنی از خوے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

شیاطین خاکی یا "ارباب کیں" ایسی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ عوام کے منتخب کرنے کے لئے صرف دو رستے رہ جائیں۔ استبداد یا ابتری۔ ابتری سے بچنے کی خاطر عوام بعالم مجبوری استبداد قبول کرتے ہیں۔ یوں' قوموں کی تاریخ میں دور فرعونی شروع ہوتا ہے۔ اور "حکمت فرعونی" کیا ہے؟ علامہ فرماتے ہیں ؎

حکمت ارباب کیں مکر است و فن
مکر و فن؟ تخریب جاں' تعمیر تن!

("ارباب کیں" کی حکمت کی بنیاد مکروفریب پر قائم ہے اور مکروفریب کا مطلب ہے روح کی موت اور تن کی زندگی)

حکمتے از بند دیں آزادہ
از مقام شوق دور افتادہ

(ان کی حکمت دین کی قید سے آزادی حاصل کرنا ہے اور مقام شوق سے بہت دور لے جاتا ہے)

ملتے خاکستر او بے شرر
صبح او از شام او تاریک تر

(اس حکمت سے ملت کی روح کا شعلہ بے نور ہو گیا ہے اور اس کی صبح اس کی شام سے بھی زیادہ تاریک ہو گئی ہے)

ہر زماں اندر تلاش ساز و برگ
کار او فکر معاش و ترس مرگ

(اس حکمت سے ملت ہر وقت اپنی زندگی کو مادی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے مصروف نظر آنے لگی ہے۔ اسے ہر وقت یا تو روزی کا فکر لاحق رہتا ہے یا موت کا خوف)

بے نصیب آمد ز اولاد غیور
جاں بہ تن چو مردۂ در خاک گور

(وہ غیرت مند اولاد تک پیدا کرنے کی اہل نہیں رہی کیونکہ اس کی اولاد بھی قبر کے مردے کی طرح بے حس اور بے پروا ہو گئی ہے)

آہ قومے دل ز حق پرداختہ

مرد و مرگ خویش را نشناختہ

(افسوس ہے ایسی قوم پر جس کا دل خدا کی محبت سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ درحقیقت عرصہ ہوا مر چکی ہے، لیکن اپنی کم علمی کے باعث اس تلخ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے)۔

خاکی شیاطین، جمہوریت کی ہیئت میں استبداد کو فروغ دے کر شیطان ناری کی ایسی خدمت انجام دیتے ہیں کہ اسے بالآخر خداوند تعالیٰ سے استدعا کرنا پڑتی ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست

باقی نہیں اب میری ضرورت تہ افلاک!

یوں شیطان ناری کا کردار بحیثیت ایک سیاسی شخصیت تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ منظر سے خارج ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ خاکی شیاطین لے لیتے ہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ علامہ کی نظم "سیاسیات حاضرہ" ملاحظہ ہو۔

می کند بند غلاماں سخت تر

حریت می خواند او را بے بصر

(اگرچہ مرد آزاد کے نزدیک اس نظام میں اندھے پن کے سوا کچھ بھی نہیں، خاکی شیاطین جمہوریت کی شکل میں استبداد کو یوں نافذ کرتے ہیں کہ غلامی کی زنجیریں مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی ہیں)

گرمی ہنگامۂ جمہور دید

پردہ بر روئے ملوکیت کشید

(جونہی آزادی جمہور کے نعروں کی تپش ان تک پہنچتی ہے، وہ استبداد کے چہرے پر جمہوریت کا پردہ کھینچ دیتے ہیں)

در فضایش بال و پر نتواں کشود

با کلیدش ہیچ در نتواں کشود

(اس نظام کی فضا میں کوئی بال و پر نہیں کھول سکتا۔ دراصل اس کی کنجی سے کوئی دروازہ نہیں کھل سکتا)

گفت با مرغ قفس "اے دردمند

آشیاں در خانۂ صیاد بند

(اس نظام کے خالق، خاکی شیاطین، قفس میں مقید پرندے کو نصیحت کرتے ہیں کہ اے

دردمند، تو اپنا آشیانہ شکاری کے گھر میں بنا)

کیونکہ

ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ
او نباشد ایمن از شاہین و چرغ"

(جو پرندہ بھی اپنا آشیانہ آزادی کے بیابان میں بناتا ہے، اسے ہر وقت بازوں اور چیلوں کا خطرہ درپیش رہتا ہے)

از فسونش مرغ زیرک دانہ مست
نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست

(ان کے فریب میں آکر چالاک پرندہ بھی دانہ مست ہو جاتا ہے اور اس کی چیخ و پکار اس کے اپنے گلے کے اندر ہی ختم ہو جاتی ہے)

چشم ہا از سرمہ اش بے نور تر
بندۂ مجبور ازو مجبور تر

(بالآخر اس نظام کے سرمے سے تمام آنکھیں قطعی بے نور ہو جاتی ہیں اور بندۂ مجبور اور بھی مجبور ہو جاتا ہے)

خاکی شیاطین کی ریاکاری سے چونکہ جمہوری قبا میں دیو استبداد پائے کوب ہے، اس لئے علامہ اپنی زندگی میں مسلمانوں کو باربار تنبیہ کرتے رہے کہ ایسا جمہوری نظام ہرگز قبول نہ کریں جو غلاموں کو غلامی میں اور بھی پختہ بنا دے۔ ظاہر ہے اگر ایوان میں اکثریت باطل پر متفق ہو جائے تو حق بآسانی مغلوب ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

متاع معنی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
ز موراں شوخی طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرز جمہوری، غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اس اعتبار سے استبداد کے 'معمول' غلط نہیں کہتے کہ علامہ جمہوریت کے خلاف تھے۔

لیکن میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں آپ کے مطلب کی نہیں کہہ رہا بلکہ ۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات ان کی

علامہ کے نزدیک مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی اپنے سیاسی حقوق اور ذمہ داریوں کا ہر لحظہ

تحفظ کرنا چاہیے کیونکہ تاریخ اقوام میں انکار شیطان کی تکرار کا وقوع پذیر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم اس معاملے میں غفلت برتے تو قدرت اس کے گناہوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ اور اس پر غیروں کی نہیں تو اپنوں کی ہی محکومی و مظلومی کی لعنت نازل کر دیتی ہے۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف!
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!

دوسری طرف انہوں نے چیرہ دستوں کو بھی خدا کا خوف دلایا اور کہا۔

ولایت' پادشاہی' علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ء ایماں کی تفسیریں!
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہیں تصویریں
تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں' سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اسی طرح انہوں نے بے ضمیر موقع پرستوں کو بھی' جو ہر چڑھتے سورج کی پرستش میں مشغول ہو جاتے ہیں' ان کے مستقبل سے آگاہ کیا۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقہ ء گردن میں ساز دلبری
خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری!

علامہ کی حیات کا صرف ایک مقصد تھا کہ ان کی نوائے سحرگاہی سے ہماری خاک میں وہ آتش زندہ ہو جائے جس کے ذریعے ہم بحیثیت ایک ملت' خاکی شیاطین کو مغلوب کر کے اپنا گم گشتہ مقام آزادی حاصل کر سکیں۔ انہوں نے فرمایا۔

یا مری آہ میں کوئی شرر زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے!
کیا عجب میری نوائے سحرگاہی سے

زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے!
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسم شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے!

انہوں نے ہمیں حاضر و موجود کی گرفتاری پر مایوس ہونے سے روکا اور پیغام دیا کہ استبداد کا دور لامتناہی نہیں بلکہ ایک عارضی کیفیت ہے۔

یہ کافری تو نہیں' کافری سے کم بھی نہیں
کہ مرد حق ہو گرفتار حاضر و موجود!
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود!

انہوں نے ہمارے روبرو خاکی شیاطین کی ریاکاری کا پول کھول کر رکھ دیا اور فرمایا۔

چہ زہرابے کہ در پیمانہ ء اوست
کشد جاں را و تن بیگانہ ء اوست

(ان کے پیمانے کے زہر کے اثر سے تیری روح قبض کر لی گئی ہے اور تیرا تن اس سے بے پروا ہو چکا ہے)

تو بینی حلقہ ء دامے کہ پیدا ست
نہ آں دامے کہ اندر دانہ ء اوست!

(تو تو ابھی صرف جال کا حلقہ دیکھ رہا ہے جو ظاہر ہے' لیکن تو نہیں جانتا کہ اس حلقے کے اندر جو دانہ ء رزق رکھا ہے' اس میں کیا فریب پنہاں ہے)

علامہ کے نزدیک اگر انسان گناہ ہی کی طرف راغب ہو تو اسے اپنے دل میں وقار آدم کا احساس رکھتے ہوئے کم از کم اس شیطان کے فریب میں آنا چاہیے جو آتش نسب اور بلند مقام ہے' لیکن ایک ایسا گناہ جو کسی خاکی شیطان کے ورغلانے پر کیا جائے' وہ تو یقیناً سرد اور بے لذت گناہ ہے۔

بشر تا از مقام خود فتاد است
بقدر تحکمی او را کشاد است
گنہ ہم می شود بے لذت و سرد
اگر ابلیس تو خاکی نہاد است

فرماتے ہیں۔

زفہم دوں نہاداں گرچہ دور است،
ولے ایں نکتہ را گفتن ضرور است
بہ ایں توزادہ ابلیساں نسازد
گنہگارے کہ طبع او غیور است

(اگرچہ یہ نکتہ کوتاہ بین اور بے ضمیر لوگوں کی فہم سے دور ہے لیکن میں اس کی وضاحت ضرور کروں گا۔ ایک ایسا گنہگار جو غیرت مند ہو' بھلا وہ ان خاکی شیاطین کے فریب میں کیونکر آسکتا ہے)

پھر ارشاد کرتے ہیں۔

چہ شیطانے! خرامش واژگونے
کند چشم ترا کور از فسونے
من او را مردہ شیطانے شمارم
کہ گیرد چوں تو نخچیر زبونے!

(اس لڑکھڑاتے ہوئے خاکی شیطان کی آخر کیا حقیقت ہے جس کا ایک قدم ادھر پڑتا ہے اور دوسرا ادھر' لیکن پھر بھی اسی شیطان کے فریب نے تیری نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ میں تو اس شیطان کو مردوں میں شمار کرتا ہوں جس کی ضرب کا تو شکار ہوا ہے)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ خاکی شیاطین کیونکر مغلوب ہو سکتے ہیں اور گم گشتہ منزل آزادی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ ہمیں ذوق نگاہ پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھ پر عصر حاضر کا فساد بخوبی عیاں ہے۔ اس کی زشت روئی سے آسمان تک شرمسار ہے۔ لیکن اگر ہم میں ذوق نگاہ یعنی فقر پیدا ہو جائے تو خاکی شیاطین مغلوب کیے جا سکتے ہیں۔

فساد عصر حاضر آشکار است
سپر از زشتی او شرمسار است
اگر پیدا کنی ذوق نگاہے
دو صد شیطاں ترا خدمت گزار است!

ذوق نگاہ یا فقر کے ساتھ سینے میں قلب سلیم ہونا بھی لازم شرط ہے کیونکہ اس کے بغیر رزمگاہ حق و باطل میں ہماری ضرب کاری نہیں ہوتی۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

ضرب کاری ہے، اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم!
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصہ ء فرعون و کلیم!

اس کے ساتھ اپنی مشہور نظم "سیاسیات حاضرہ" میں علامہ واضح کرتے ہیں کہ خاکی شیاطین کا نافذ کردہ نظام جو جمہوریت کی آڑ میں ہماری گردنوں پر استبداد کا پیر تسمہ پاسوار کراتا ہے، ہم کسی صورت میں بھی قبول نہ کریں۔ فرماتے ہیں۔

حریت خواہی بہ پیچاکش میفت
تشنہ میر و بر نم تاکش میفت

(تو اگر آزادی چاہتا ہے تو اس نظام کے جال میں مت پھنس۔ پیاسا مرجا، لیکن اس کی شاخ تاک سے ایک قطرہ بھی قبول نہ کر)

الحذر از گرمی گفتار او
الحذر از حرف پہلودار او

(اس نظام کو جاری و ساری رکھنے والے خاکی شیاطین کی گرمی گفتار سے دور رہ اور ان کے چاپلوسانہ الفاظ کے ہیر پھیر میں مت آ)

از خودی غافل نہ گردد مرد حر
حفظ خود کن حب افیونش مخور

(مرد حر اپنی خودی سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ تو بھی اپنی حفاظت آپ کر اور ان کی پیش کردہ افیون کی گولی مت کھا)

پیش فرعوناں بگو حرف کلیم
تاکند ضرب تو دریا را دو نیم

(فرعونوں کے سامنے حق کا نعرہ بلند کرتا رہ تاکہ تیری ضرب سے بالاخر باطل کے دریا کے دو ٹکڑے ہو جائیں اور حق کے لئے راہ نکل آئے)

داغم از رسوائی ایں کارواں
در امیر او ندیدم نور جاں

(میں اس کارواں کی ذلت اور رسوائی سے بے حد مغموم ہوں۔ مجھے اس کے امیر میں زندگی کا نور دکھائی نہیں دیتا)

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ

اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

(وہ تن پرست، جاہ مست اور کم نگاہ ہے۔ دراصل اس کا باطن لا الٰہ کی گرمی سے خالی ہے)

اندریں رہ تکیہ برخود کن کہ مرد

صید آہو با سگ کورے نہ کرد

(ان حالات میں تو اپنے آپ پر اعتماد کر کیونکہ کوئی شخص بھی ہرن کا شکار اندھے کتے کے ساتھ نہیں کر سکتا)۔

○

اقبال اور شیطان☆

(۲)

پچھلے سال بھی یوم اقبال کے موقع پر میرے مقالے کا موضوع یہی تھا لیکن بعض "دور اندیش" ابنائے وقت نے اس مقالے کو اپنے معانی کا لبادہ پہنایا' پھر اپنے ہی حلقہ ء دام خیال میں اس لبادے کو تار تار کر کے رکھ کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک "خلق الزماں" نے طویل مضمون شائع کیا جس کے ذریعے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ تعلیمات اقبال کے بارے میں جو کچھ بھی میں کہتا ہوں' اقبال شناسوں کو گمراہ کرنے کی خاطر کہتا ہوں۔

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف
خدا کا شکر! سلامت رہا حرم کا غلاف
یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف!

خیر' اب میں انہیں کیا جواب دوں! موضوع تو اقبال کا تصور شیطان تھا لیکن نجانے کیوں ان کو اس آئینے میں شیطان کی بجائے اپنی یا کسی اور کی صورت دکھائی دی۔ علامہ کے الفاظ میں ان سے یہی عرض ہے۔

بلازمان سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دلگدازے

(بادشاہ کے ملازموں کو میں اس راز سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ان کی نیت میں خلوص ہو' ان کا ضمیر صاف ہو اور ان کی نوا دل گداز ہو تو عوام کے دل جیتے جا سکتے ہیں)

☆ ۲۱- اپریل ۱۹۶۷ء لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

متاعِ خود چہ نازی کہ بہ شہر دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسم ایازے

(تو حرص و ہوس سے اکٹھی کی ہوئی متاع پر کیا ناز کرتا ہے کیونکہ دردمندوں کے شہر میں تو ایاز کے تبسم کے مقابلے میں غزنوی کے دل کی بھی کوئی قدروقیمت نہیں)

ہمہ ناز بے نیازی، ہمہ ساز بے نوائی
دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے

(ہمیں تو اپنی بے نیازی پر ناز ہے اور ہم اپنی بے نوائی ہی کو اپنا سازوسامان سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گدائے بے نیاز کو دیکھ کر بادشاہ تک کے دل پر بھی کپکپی طاری ہو جاتی ہے)

عجیب اتفاق ہے! اگر کوئی منافق یہ ثابت کرے کہ اقبال شاہ پرست تھے کیونکہ انہوں نے افغانستان کے امان اللہ خاں کی شان میں قصیدہ کہا اور اسے امیر کامگار کا خطاب دیا، یا انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ یہ تلقین کی کہ غیروں کی غلامی کی بجائے اپنوں کی غلامی قبول کرو تو نظریات اقبال کی یہ تفسیر درست تصور کی جاتی ہے اور پاکستان کے سرکاری اخبار اس کی تشہیر بھی کرتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ نہیں، اقبال کی زندگی اور اس کے ماحصل سے ثابت ہے کہ وہ شخصی حکومت کے خلاف تھے، جمہوری نظام کے حامی تھے اور مسلمانوں کو ہمیشہ یہی تلقین کرتے رہے کہ غلامی خواہ کسی بھی صورت میں پیش کی جائے، اسے ہرگز قبول نہ کرو---- تو مجھ پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ تعلیمات اقبال کو ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر پیش کر کے میں سادہ لوح پاکستانیوں کو گمراہ کر رہا ہوں---- بلکہ مجھے مشورہ دیا جاتا ہے کہ کیوں بیکار لوہے کی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر اپنے آپ کو ہلکان کر رہے ہو، وقت کا مزاج سمجھو اور اس کے مطابق اقبال کو توڑ مروڑ کر پیش کرو۔ گویا جب تک مطلع ابر آلود ہے "خلق الزماں" بن جاؤ اور منافقت سے کام لو۔ جب بادل چھٹ جائیں تو دیانت داروں کی صف میں جا کھڑے ہونا۔

وقت کا یہ دور کوئی نیا نہیں۔ علامہ بھی ایسے ہی دور سے گزرے تھے۔ تب بھی یار لوگوں کی بقول اقبال، یہی کیفیت تھی۔

دلیل مہر و وفا اس سے بڑھ کے کیا ہو گی
نہ ہو حضور سے الفت، تو یہ ستم نہ سہیں
مصر ہے حلقہ، کمیٹی میں کچھ کہیں ہم بھی

مگر رضائے کلکٹر کو بھانپ لیں تو کہیں
سند تو لیجئے لڑکوں کے کام آئے گی
وہ مہربان ہیں اب، پھر رہیں، رہیں نہ رہیں
مثال کشتی بے حس مطیع فرماں ہیں
کہو تو بستہ ء ساحل رہیں، کہو تو بہیں!

علامہ کو بھی ایسے ہی مشورے دیے گئے جن کے زیر اثر انہوں نے فرمایا۔

پرانے طرز عمل میں ہزار مشکل ہے
نئے اصول سے خالی ہے فکر کی آغوش
مزا تو یہ ہے کہ یوں زیر آسماں رہیے
"ہزار گونہ سخن در دہان و لب خاموش"
یہی اصول ہے سرمایہ ء سکون حیات
"گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش"
مگر خروش پہ مائل ہے تو، تو بسم اللہ
"بگیر بادۂ صافی، بہ بانگ چنگ بنوش"

لیکن جب تک ہر طرف قبرستان ایسی خاموشی مسلط رہی، کوئی بھی ٹس سے مس نہ ہوا، تو ان سے نہ رہا گیا اور مسلمانوں سے یوں مخاطب ہوئے۔

غریب شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد
کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاع عزیز
جہاں میں عام نہیں دولت دل ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کورذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنت فرہاد

یہ حقیقت ہے کہ علامہ کی زندگی میں شیطان کے سیاسی فرزند ان کی محنت کو محنت فرہاد ہی سمجھتے رہے۔ مگر علامہ کا تخاطب ان سے نہ تھا۔ وہ علامہ کے حلقہ ء سخن میں نہ بیٹھ سکتے تھے کیونکہ نظر سے محروم تھے۔ اسی لئے علامہ نے فرمایا۔

نظر نہیں تو مرے حلقہ ء سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملت اسلامیہ کی بے حسی کے باعث وہ تنہائی کے ایک نہایت ہی اندوہناک دور سے گزرے۔ وطن کی گردن پر جمہوری قبا میں غیر ملکی دیو استبداد سوار تھا اور وہ لوگ جو اصلا "جسد ملت سے پھوٹے ہوئے ناسور تھے" رہزنان چشم و گوش کی ہیئت میں، غذائے نفس کے حصول کی خاطر، اس دیو کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ مسلمان کشتۂ تدبیر غیر تھے اور نمک پروردۂ نمرود ان کی تخریب کے ذریعے غیر کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اقبال کی نگاہ میں کیفیت یہ تھی۔

نہ بادہ ہے نہ صراحی، نہ دور پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ!
کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیم سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ
کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور
سب آشنا ہیں یہاں، ایک میں ہوں بیگانہ!

لیکن اس ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں بھی انہوں نے اس خوف سے مبادا بادشاہ سے کوئی شکایت کر دے، صاف گوئی سے توبہ نہ کی۔ نہ ان کے تصرف میں صنعت و حرفت کی ملیں تھیں، نہ رشوت سے کمائی ہوئی دولت کے انبار۔ وہ تو فقیروں کی طرح اپنی محبوب ملت کے لئے دعا ہی کر سکتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے برملا کہا۔

منم کہ توبہ نہ کردم ز فاش گوئی ہا
ز بیم ایں کہ بسلطاں کنند غمازی
بدست ما نہ سمرقند و نے بخارا ایست
دعا بگو ز فقیراں بہ ترک شیرازی

ان کی نگاہ عشق کی دولت سے مالامال تھی اور ان کی نوا صور اسرافیل کی بانگ کی مانند تھی۔ اس لئے صرف زندہ دل ہی ان کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی

کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

بہر حال، اقبال کی محنت محض محنت فرہاد تو نہ رہی، اس کے ذریعے بالاخر کچھ تو حاصل ہوا۔ مگر عہد حاضر میں دشمنان اقبال بھیس بدل کر پھر آ گئے ہیں۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

اور اس ملک میں جب کبھی بھی کوئی جرأت اور بیباکی سے حق بات کہتا ہے تو اس کے خلاف باطل کا طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا یوں گوہر افشاں ہوتا ہے گویا اس سرزمین پر حق گوئی نہ صرف گستاخی ہے بلکہ ایک جرم عظیم ہے۔

زاغ کہتا ہے، نہایت بدنما ہیں تیرے پر
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز، یہ مرغان صحرا کے اچھوت
ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام
روح ہے جس کی دم پرواز سرتاپا نظر!

میں نے دو وجہ سے اقبال اور شیطان کا موضوع ایک بار پھر منتخب کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ جب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری روزمرہ کی اجتماعی زندگی میں آجکل خدا کے مقابلے میں شیطان کا دخل کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے تو لازم ہو جاتا ہے کہ ہم شیطان کو مغلوب کرنے کے لئے اس کی شخصیت اور طریقۂ واردات کو پوری طرح سمجھ لیں کیونکہ ظاہر ہے اپنے سے برتر دشمن کی برتری کے راز کو پائے بغیر اسے پچھاڑنا محال ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چند احباب نے تقاضا کیا کہ اس موضوع پر پہلا مقالہ کچھ تشنہ سا ہے اور شیطان کی شخصیت کے سارے پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتا۔ اسی دوران میں مولانا جلال الدین رومیؒ کی "مثنوی معنوی" میری نظروں سے گزری اور میں نے ان کی مشہور و معروف منظوم حکایت "امیر معاویہ اور ابلیس" پڑھ کر اندازہ کیا کہ علامہ نے اپنے تصور شیطان کی تشکیل کرتے وقت کس حد تک مولانا سے اثر قبول کیا ہے۔

میں نے پچھلی مرتبہ عرض کیا تھا کہ اطالوی مستشرق بوسانی کے نزدیک اقبال کے 'شیطان' کے پانچ اہم پہلو ہیں۔ پہلا یہ کہ حسن تدبیر اور عمل پیہم کے معاملے میں وہ اپنے

اندر پرومیتھیسی خوبیاں رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے بوسانی کی رائے میں' اقبال اپنے تصور شیطان کی تشکیل کے سلسلے میں فکر یونان قدیم سے متاثر ہوئے۔

قدیم یونانیوں کے مذہب میں شیطان کی ہستی کا کوئی وجود نہیں' بلکہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان خداؤں کے ہاتھ میں محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خدا کوہ اولمپس کی چوٹیوں پر بیکار بیٹھے عیش و عشرت میں اپنی ابدی زندگی گزارتے ہیں یا تفریح کی خاطر انسانوں کو مختلف قسم کی آزمائشوں میں ڈالتے ہیں جو بالآخر ان کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ مثلاً جب ان خداؤں کو انسانی زندگیوں سے کھیلنا مقصود ہوتا ہے تو کسی قوم کے سربراہ سے کوئی فاش اخلاقی' معاشرتی یا سیاسی غلطی کا ارتکاب کراتے ہیں۔ اس مخصوص غلطی کو یونانی زبان میں "ہمارطیہ" کہا جاتا ہے۔ اس ایک فاش غلطی کے بعد سربراہ گویا غلطیوں کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور اس سے یکے بعد دیگرے غلطیاں سرزد ہونے لگتی ہیں جو انجام کار اس کی اپنی اور اس کی قوم کی تباہی کا موجب بنتی ہیں۔ تباہی اور ابتری کا یہ عالم ان خداؤں کو محظوظ کرتا ہے اور یہ لامتناہی سلسلہء تعمیر و تخریب جاری و ساری رہتا ہے۔ اسی سلسلے کو تقدیر کہا جاتا ہے۔ تقدیر کے مقابلے میں انسانی زندگی کی اس مسلسل کشمکش کی فنی یا ادبی ہیئت کا نام المیہ یا ٹریجڈی ہے اور ارسطو کے خیال کے مطابق ہمیں المیہ اس لئے متاثر کرتا ہے کہ ہم اس کے مرکزی کردار سے خوف کھاتے ہیں اور ہمیں اس کی حالت پر رحم بھی آتا ہے۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک پرومیتھیس ایک ایسی شخصیت تھی جس نے انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر خداؤں کی آماجگاہ سے آگ چرانے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ اپنے مکروفریب یا حسن تدبیر کے باعث چھپتا چھپاتا اولمپس کی چوٹیوں تک پہنچا پھر عمل پیہم کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کیا' یعنی آسمانوں سے آگ چرا لایا۔ بہرکیف' مغربی فلسفہ و ادب میں جہاں کہیں بھی حسن تدبیر کے ساتھ عمل پیہم کا ذکر آتا ہے' پرومیتھیس کی مثال دی جاتی ہے۔ بس علامہ کی نگاہ میں شیطان بھی پرومیتھیسی مکروفریب' حسن تدبیر اور عمل پیہم کے باعث اپنا مقصد حاصل کرنے میں عموماً کامیاب ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے علامہ مرحوم' شیطان کی عظمت کے معترف ہیں اور فرماتے ہیں۔

مشو نخچیر ابلیسان ایں عصر
خساں را غمزۂ شاں سازگار است
اصیلاں را ہماں ابلیس خوشتر
کہ یزداں دیدہ و کامل عیار است!

(اس دور کے شیطانوں کا شکار بننے سے گریز کر کیونکہ ان سے صرف کمینہ فطرت اور بے ضمیر لوگ اثر قبول کرتے ہیں۔ مگر جو اصیل ہیں، انہیں تو اسی شیطان کا مقابلہ کرنے میں لطف آتا ہے جس نے خدا کو دیکھ رکھا ہے اور اپنے فن میں ہر لحاظ سے کامل ہے)

حریف ضرب او مرد تمام است
کہ آں آتش نسب والا مقام است
نہ ہر خاکی سزاوار نخ اوست
کہ صید لاغرے بر وے حرام است

(وہ شیطان چونکہ آتش نسب اور بلند مقام ہے، اس لئے اس کا مقابلہ تو صرف مرد کامل ہی کر سکتا ہے۔ ہر شخص اس کی چوٹ نہیں کھاتا کیونکہ دبلا پتلا شکار اس پر حرام ہے)

اقبال کے شیطان کا دوسرا اہم پہلو خدا کے مقابلے میں شیطان کی آزاد انفرادی شخصیت ہے۔ یعنی شیطان خدا کی ضد ہے۔ شیطان کی شخصیت کا تصور بحیثیت حریف خدا، ایران قدیم کا نتیجہ ء فکر ہے، اور شیطان کے اس پہلو کی تشکیل کرتے وقت علامہ ایران قدیم کے نظریہ ء یزدان واہرمن سے متاثر ہوئے۔ خیر و شر کی کشمکش کے سلسلے میں اقبال کا شیطان، خدا سے گویا ہوتا ہے۔

پیکر انجم ز تو، گردش انجم ز من
جاں بجہاں اندرم، زندگی مضمرم

(تو ستارے وجود میں لاتا ہے لیکن انہیں گردش میں عطا کرتا ہوں۔ دراصل میں ہی تیرے جامد جہان کی جان ہوں کیونکہ اس میں زندگی کی روح میں نے پھونک رکھی ہے)

تو بہ بدن جاں دہی، شور بجاں من دہم
تو بہ سکوں رہ زنی، من بہ تپش رہبرم

(تو فقط جسم میں جان ڈالتا ہے لیکن زندگی میں عمل کی گرمی مجھ سے پیدا ہوتی ہے۔ تو تو صرف ابدی راحت اور سکون کا رستہ دکھاتا ہے مگر میں جستجو اور تگ و دو کی طرف رہبری کرتا ہوں)

آدم خاکی نہاد، دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو، پیر شود در برم

(خاکی فطرت انسان جو کوتاہ بیں، بے شعور اور جاہل ہے، اگرچہ تیری آغوش میں پیدا ہوتا ہے، لیکن وہ بوڑھا میری بغل میں ہوتا ہے، یعنی اسے بلوغت میرے دامن میں نصیب ہوتی

ہے)

لیکن اسی سلسلے میں علامہ ایک اور باریکی بھی پیدا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے، جب آدم کی تخلیق کے متعلق خدا نے اپنا ارادہ فرشتوں پر ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کہ وہ دنیا میں فساد پیدا کرے گا۔ خدا نے جواب دیا کہ انہیں اس کا علم نہیں جو وہ جانتا ہے۔ اس اعتبار سے علامہ انسان ہی کو شیطان کی تخلیق کا سبب ثابت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند
ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جان ما سوزے کجا بود
ترا از آتش ما آفریدند

(جب خداوند تعالیٰ نے یہ جہان پیدا کیا تو بالکل خاموش، ویران اور بے رونق تھا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ اگر اس میں سوز آیا تو انسان کی وجہ سے آیا۔ گویا وہ انسان ہی کے سوز کی آگ تھی جس سے شیطان پیدا ہوا)

مولانا رومؒ کی مشہور و معروف حکایت میں شیطان، انسان سے کہتا ہے۔

تو ز من باحق چہ نالی، اے سلیم
تو بنال از شر آں نفس لئیم
تو خوری حلوا، ترا دمل شود
تپ بگیرد طبع تو مختل شود
بے گنہ لعنت کنی ابلیس را
چوں نہ بینی از خود آں تلبیس را

(اے سادہ لوح! تو میرے خلاف خدا سے شکایت کیوں کرتا ہے؟ اگر تجھے شکایت ہی کرنی ہے تو اپنے نفس لئیم کی شکایت کر۔ تو اپنے مزے کی خاطر حلوا تو کھا لیتا ہے لیکن جب اس کے باعث تیرے جسم میں پھوڑے نکلتے ہیں، بخار چڑھتا ہے اور تیری طبیعت ناساز ہو جاتی ہے تو بغیر کسی وجہ کے شیطان کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اسے برا بھلا کہتا ہے حالانکہ تو نہیں دیکھتا کہ تیرے اپنے ہی اندر شر موجود ہے جو پھوٹ کر باہر نکلتا ہے)

اقبال کے "شیطان" کا تیسرا اہم پہلو، شیطان کا تصور بحیثیت عاشقِ خدا ہے۔ یہ نظریہ صوفیائے اسلام کا ہے۔ اس نظریے کے مطابق شیطان موحد اور عاشقِ حقیقی ہے، یعنی توحید کے لئے اس کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انکار کی کیفیت میں بھی خدا کی باطنی رضا کو پورا کیا۔

آخر خدا ہی نے تو یہ حکم دے رکھا ہے کہ میرے سوا کسی کو سجدہ نہ کیا جائے۔ شیطان کی شخصیت کے اس پہلو کی تشکیل کرتے وقت علامہ منصور حلاج، امام غزالی اور مولانا رومؒ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ اس اعتبار سے علامہ کی نگاہ میں مسلمان، شیطان سے بھی توحید کا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ جاوید نامہ میں منصور حلاج، شیطان کا تعارف یوں کراتے ہیں۔

زانکہ او در عشق و خدمت اقدم است
آدم از اسرار او نامحرم است

(چونکہ شیطان عشق اور خدمت میں پیش از آدم تھا، اس لئے آدم اس کے اسرار سے آگاہ نہیں)

چاک کن پیراہن تقلید را
تابیا موزی ازو توحید را

(پس تو تقلید کا پیراہن چاک کرتا کہ شیطان سے توحید کا سبق سیکھ سکے)

چوتھا پہلو شیطان کا خالصتہ" اسلامی تصور ہے، یعنی یہ کہ شیطان، خدا کی تخلیقات میں سے ہے۔ اس نے حسد، تکبر اور عقلی حجتوں کی بنا پر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور خدا کا حکم نہ ماننے کے باعث معتوب ہوا۔ چونکہ شیطان کے حسد اور بغض کا ہدف دراصل انسان ہے، اس لئے وہ انسان کا رقیب، حریف اور مدمقابل ہے اور اس کا مقصد اپنے مکروفریب کو عقلی دلائل کی صورت میں پیش کر کے انسان کو راہ راست سے بھٹکانا اور گمراہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا رومؒ کی مشہور و معروف حکایت میں شیطان اپنے حسد اور تکبر کی حمایت میں عقلی دلائل پر مبنی جو معذرت پیش کرتا ہے، قابل ذکر ہے۔ شیطان، انسان سے کہتا ہے:

"میں نے دل و جان سے خالق حقیقی کی اطاعت کی۔ میں سالکان راہ کا محرم تھا۔ ساکنان عرش کا ہمدم تھا۔ تخلیق کے روز ہی سے مجھے اس کی محبت میں گرفتار کیا گیا۔ میرے دل میں اسی کے عشق کا بیج بویا گیا۔ میں اپنی بہار کے عہد میں رحمت ایزدی سے سیراب ہوا ہوں۔ اس کی رضا کے گلستان میں کھلا ہوں۔ اسی کے دست کرم نے مجھے کاشت کیا اور وہی مجھے عدم سے وجود میں لایا۔ میں اس کی درگاہ کے عاشقوں میں سے ہوں۔ پس اگر اس کا عتاب مجھ پر نازل ہوا تو اس سے مراد یہ کیوں لی جاتی ہے کہ اس کی رحمت

ہے)

لیکن اسی سلسلے میں علامہ ایک اور باریکی بھی پیدا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے' جب آدم کی تخلیق کے متعلق خدا نے اپنا ارادہ فرشتوں پر ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا کہ وہ دنیا میں فساد پیدا کرے گا۔ خدا نے جواب دیا کہ انہیں اس کا علم نہیں جو وہ جانتا ہے۔ اس اقتباس سے علامہ انسان ہی کو شیطان کی تخلیق کا سبب ثابت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند
ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جان ما سوزے کجا بود
ترا از آتش ما آفریدند

(جب خداوند تعالیٰ نے یہ جہان پیدا کیا تو بالکل خاموش' ویران اور بے رونق تھا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ اگر اس میں سوز آیا تو انسان کی وجہ سے آیا۔ گویا وہ انسان ہی کے سوز کی آگ تھی جس سے شیطان پیدا ہوا)

مولانا رومؒ کی مشہور و معروف حکایت میں شیطان' انسان سے کہتا ہے۔

تو ز من باحق چہ نالی' اے سلیم
تو بنال از شر آں نفس لئیم
تو خوری حلوا' ترا دمل شود
تپ بگیرد طبع تو مختل شود
بے گنہ لعنت کنی ابلیس را
چوں نہ بینی از خود آں تلبیس را

(اے سادہ لوح! تو میرے خلاف خدا سے شکایت کیوں کرتا ہے؟ اگر تجھے شکایت ہی کرنی ہے تو اپنے نفس لئیم کی شکایت کر۔ تو اپنے مزے کی خاطر حلوا تو کھا لیتا ہے لیکن جب اس کے باعث تیرے جسم میں پھوڑے نکلتے ہیں' بخار چڑھتا ہے اور تیری طبیعت ناساز ہو جاتی ہے تو بغیر کسی وجہ کے شیطان کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اسے برا بھلا کہتا ہے حالانکہ تو نہیں دیکھتا کہ تیرے اپنے ہی اندر شر موجود ہے جو پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلتا ہے)

اقبال کے "شیطان" کا تیسرا اہم پہلو' شیطان کا تصور بحیثیت عاشق خدا ہے۔ یہ نظریہ صوفیائے اسلام کا ہے۔ اس نظریے کے مطابق شیطان موحد اور عاشق حقیقی ہے' یعنی توحید کے لئے اس کے عشق کا یہ عالم تھا کہ انکار کی کیفیت میں بھی خدا کی باطنی رضا کو پورا کیا۔

آخر خدا ہی نے تو یہ حکم دے رکھا ہے کہ میرے سوا کسی کو سجدہ نہ کیا جائے۔ شیطان کی شخصیت کے اس پہلو کی تشکیل کرتے وقت علامہ منصور حلاج، امام غزالی اور مولانا رومؒ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ اس اعتبار سے علامہ کی نگاہ میں مسلمان، شیطان سے بھی توحید کا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ جاوید نامہ میں منصور حلاج، شیطان کا تعارف یوں کراتے ہیں۔

زانکہ او در عشق و خدمت اقدم است
آدم از اسرار او نامحرم است

(چونکہ شیطان عشق اور خدمت میں پیش از آدم تھا، اس لئے آدم اس کے اسرار سے آگاہ نہیں)

چاک کن پیراہن تقلید را
تابیا موزی ازو توحید را

(پس تو تقلید کا پیراہن چاک کرتا کہ شیطان سے توحید کا سبق سیکھ سکے)

چوتھا پہلو شیطان کا خالصتہ" اسلامی تصور ہے، یعنی یہ کہ شیطان، خدا کی تخلیقات میں سے ہے۔ اس نے حسد، تکبر اور عقلی حجتوں کی بنا پر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور خدا کا حکم نہ ماننے کے باعث معتوب ہوا۔ چونکہ شیطان کے حسد اور بغض کا ہدف دراصل انسان ہے، اس لئے وہ انسان کا رقیب، حریف اور مدمقابل ہے اور اس کا مقصد اپنے مکروفریب کو عقلی دلائل کی صورت میں پیش کر کے انسان کو راہ راست سے بھٹکانا اور گمراہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا رومؒ کی مشہور و معروف حکایت میں شیطان اپنے حسد اور تکبر کی حمایت میں عقلی دلائل پر مبنی جو معذرت پیش کرتا ہے، قابل ذکر ہے۔ شیطان، انسان سے کہتا ہے:

"میں نے دل و جان سے خالق حقیقی کی اطاعت کی۔ میں سالکان راہ کا محرم تھا۔ ساکنان عرش کا ہمدم تھا۔ تخلیق کے روز ہی سے مجھے اس کی محبت میں گرفتار کیا گیا۔ میرے دل میں اسی کے عشق کا بیج بویا گیا۔ میں اپنی بہار کے عہد میں رحمت ایزدی سے سیراب ہوا ہوں۔ اس کی رضا کے گلستان میں کھیلا ہوں۔ اسی کے دست کرم نے مجھے کاشت کیا اور وہی مجھے عدم سے وجود میں لایا۔ میں اس کی درگاہ کے عاشقوں میں سے ہوں۔ پس اگر اس کا عتاب مجھ پر نازل ہوا تو اس سے مراد یہ کیوں لی جاتی ہے کہ اس کی رحمت

کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے۔ وہ تو غفور و رحیم ہے۔ اس کا سکہ تو دراصل داد' لطف اور بخشش کی آمیزش سے بنا ہے اور اس کا قہر اس سکے پر عارضی غبار کی طرح ہے۔ اس نے کائنات کی تخلیق برائے رحمت کی۔ اس کے کرم کا آفتاب تو تاریک ذروں کو بھی منور کرتا ہے۔ اس کی ذات سے دوری اگر اس کے قہر کے مترادف ہے تو اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ ہم اس سے قربت کی قدر پہچانیں۔ میں اس کے عتاب کے سبب کو نہیں دیکھتا کیونکہ اس کی نوعیت عارضی ہے۔ میری نگاہ تو اس کے دائمی لطف و کرم پر ہے۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے حسد کیا بنا پر انکار کیا' تو یہ حسد اس کا حکم ماننے سے انکار کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی ذات سے محبت کی وجہ سے میرے دل میں پیدا ہوا۔ حسد' عشق کا لازمی نتیجہ ہے۔ حسد' عاشق کے دل میں تب جنم لیتا ہے جب اسے کھٹکا لاحق ہو جائے کہ اس کا محبوب کسی اور کو اپنا ہم نشیں اور منظور نظر بنانے والا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ میرے انکار کی بنا تکبر تھی۔ لیکن میرے تکبر کا باعث بھی تو یہی حسد تھا جس سے مغلوب ہو کر میں نے دلیل پیش کی کہ آگ' خاک سے افضل ہے۔ مجھے کافر کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ جس نے باری تعالیٰ کو قریب سے دیکھا ہو اور اس کی باتیں بھی سنی ہوں' وہ کافر کیونکر ہو سکتا ہے۔ بیشک اس نے مجھے عذاب میں ڈالا لیکن وہ مجھے تڑپتے' سسکتے اور پیچ و تاب کھاتے دیکھ تو رہا ہے۔ ادھر میں مسلسل عذاب میں بھی اسی کے لطف و کرم کی لذت سے محظوظ ہوں۔ جہاں کہیں اس کا ذکر ہوتا ہے' میرا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر میں پکار پکار کر کہتا ہوں کہ میں تو اب بھی اسی کا ساتھی ہوں' اسی کا دوست ہوں' اسی کا رفیق ہوں ------ یہ دنیا تو بجائے خود ایک جہنم ہے۔ جو بھی اس میں جھونکا گیا ہے' آگ میں جل رہا ہے۔ ہر کسی پر سراسیمگی کا عالم طاری ہے' ہر ایک کو اپنے تن کی پڑی ہوئی ہے۔ ہر کوئی بھوکا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ جس کے پاس دولت ہے' وہ حصول اقتدار کے لئے دیوانہ ہے اور جس کے

پاس اقتدار ہے' وہ دولت سمیٹنے کی حرص میں اندھا ہو رہا ہے۔ انسان' انسان کا دشمن ہے۔ انسان' انسان سے دست و گریباں ہے۔ انسان' انسان کے لئے موت کا پیغام ہے۔ اس نفسا نفسی کے عالم سے نجات انسان کے اپنے بس میں نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر کوئی خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان' اسی کا آلۂ کار اور اسی کی ملکیت ہے۔ مگر اس کے باوجود دنیا مجھے قصوروار ٹھہراتی ہے حالانکہ میں تو خالص و ناقص کو پرکھنے کے لئے ایک کسوٹی ہوں۔ خدا نے مجھے اس لئے تخلیق کیا کہ شیر اور کتے میں تمیز ممکن ہو سکے۔ اسی وجہ سے میں نیک بندوں کی تو رہنمائی کرتا ہوں' البتہ خشک شاخوں کو کاٹنا میرا کام ہے۔ میں جانداروں کے سامنے مختلف قسم کا رزق رکھتا ہوں تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ حیوان کس نوع کا ہے۔ اگر بھیڑیے اور ہرن کے ملاپ سے کوئی بچہ پیدا ہو اور یہ جاننا مقصود ہو کہ وہ بھیڑیے کی خصلت رکھتا ہے یا ہرن کی' تو میں اس کے سامنے گھاس اور ہڈیاں' دونوں رکھ دیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ کس غذا کی طرف راغب ہوتا ہے۔ اگر وہ ہڈیوں کی طرف مائل ہو تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کتے کی نسل میں سے ہے اور اگر وہ گھاس کی طرف رجوع کرے تو پتا چل جاتا ہے کہ وہ ہرن کی نسل میں سے ہے۔ بس' ساری بات اتنی سی ہے۔ خداوند تعالیٰ کا لطف اور قہر ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ان دونوں کے امتزاج سے دنیائے خیر و شر وجود میں آئی۔ گھاس اور ہڈیاں ------ غذائے روح اور غذائے نفس ------ اگر انسان غذائے نفس کی طرف مائل ہے تو مٹی ہے لیکن اگر غذائے روح کی طرف رجوع کرتا ہے تو سونا ہے۔ اگر وہ تن کی خدمت میں مصروف ہے تو گدھا ہے' لیکن اگر وہ روحانی سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لئے بیتاب ہے تو موتیوں کا طالب ہے۔ اگرچہ خیر و شر ایک دوسرے سے قطعی مختلف اور متضاد ہیں' لیکن مشغلہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ خداوند تعالیٰ کے پیغامبر طاعات کی طرف مخلوق کی رہنمائی کرتے ہیں لیکن اس کے دشمن شہوات کی طرف لے جاتے ہیں۔ میں خیر کو شر

میں تبدیلی نہیں کر سکتا' کسی فطرتاً" نیک بندے کو بد نہیں بنا سکتا۔
یہ کام تو خالق حقیقی کا ہے۔ میری حیثیت تو محض ایک داعی کی ہے۔
میں تو فقط ایک آئینہ ہوں جس میں نیک اور بد اپنی اپنی صورتیں دیکھ
سکتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے مجھے غماز اور راست گو بنایا ہے تاکہ میں
صحیح صحیح مخبری کر سکوں کہ حسن کہاں ہے اور قبح کہاں۔ میری حیثیت
تو ایک گواہ کی سی ہے جسے شہادت دینے کی غرض سے پیدا کیا گیا ہو۔
اس لیے مجھے تو جہاں کہیں بھی کوئی پھل والا پودا دکھائی دیتا ہے' میں
بڑی محنت اور مشقت سے اس کی پرورش کرتا ہوں' البتہ اگر کوئی
خشک یا تلخ درخت مجھے نظر آئے تو اسے جڑ سے کاٹ ڈالتا ہوں۔
میرا کام تو دراصل مشک کو گوبر سے الگ کرنا ہے' لیکن چونکہ انسان
سچ اور جھوٹ میں تمیز نہیں کر سکتا' چونکہ اسے نفس کی محبت نے
اندھا اور بہرا کر رکھا ہے' اس لئے وہ نہیں جانتا کہ اصل مجرم تو اس
کا اپنا نفس لئیم ہے۔ میں تو بدی' طمع' حرص اور ہوس سے فطرتاً
نفرت کرتا ہوں۔ مجھ سے صرف ایک گناہ سرزد ہوا جس کے لئے میں
آج تک پشیمان ہوں اور اسی انتظار میں ہوں کہ کب میری رات'
دن میں تبدیلی ہوتی ہے ----- مگر اس کے باوجود دنیا مجھے شبہے
کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت' اپنے اپنے گناہوں کا
ذمہ دار مجھے ٹھہراتے ہیں۔"

مولانا روم کے نزدیک گویا شیطان کی تلبیس اور مکروفریب اس کی عقلی حجتوں میں پنہاں ہیں اور ان کا جواب عقلی دلائل کے ذریعے دینا انسان کے لئے محال ہے۔ ان کی رائے میں عیاری تو شیطان کی طرف سے ہے لیکن محبت انسان کی طرف سے ہے۔ اسی سبب سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے لئے انسان کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے دل عطا ہوا ہے۔ وہ حدیث نبوی کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ جھوٹ وہ ہے جسے سن کر دل میں بے چینی رہتی ہے اور سچ وہ ہے جو طبیعت کو اطمینان بخشتا ہے۔ پس معذرت شیطانی چونکہ انسان کے دل کے اطمینان کا باعث نہیں بنتی بلکہ اسے بے چین اور بے قرار کرتی ہے' اس لئے عقلی دلائل کے باوجود وہ تمام کی تمام جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے۔ جھوٹے الفاظ کبھی دل کو اطمینان نہیں دے سکتے۔ دلوں کو اطمینان تو سچی بات سے ملتا ہے!

'جاوید نامہ' میں بھی شیطان اپنی طرف سے معذرت پیش کرتا ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں شیطان کی معذرت کے بجائے خدا سے اس کی شکایت قابل ذکر ہے۔ اقبال کا 'شیطان' خدا سے کہتا ہے:

"اے خداوند صواب و ناصواب! مجھے آدم کی صحبت نے ذلیل و خوار کر دیا ہے۔ اس کی تو فطرت ہی انکار سے بیگانہ ہے' لہٰذا میرے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ میں تو ایسے فرماں بردار سے پناہ مانگتا ہوں۔ اے خداوند! میں تجھے اپنی سابقہ اطاعت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے اس کی صحبت سے نجات دے۔ اس کی صحبت میں رہ کر تو میری ہمت بھی پست ہو گئی ہے۔ اس کی فطرت اتنی خام اور عزم اس قدر ضعیف ہے کہ میری ایک ضرب کی تاب بھی نہیں لا سکتی۔ مجھے کوئی پختہ حریف عطا کر جو میرے مرتبے کے لائق ہو۔ مجھے ایسا انسان دے جو میری طاقت کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے' جو میری گردن پکڑ کر مروڑے اور جس کی ایک ہی نگاہ مجھے لرزہ براندام کر دے۔ اے خداوند! مجھے کم از کم ایک مرد حق پرست تو عطا فرما تاکہ میں بھی شکست کی لذت سے محظوظ ہو سکوں۔"

علامہ کے نزدیک انسان' خدا کے قرب میں تھا تو اپنے آپ سے آگاہ نہ تھا۔ خدا سے جدائی کی بدولت اس میں خودی کا احساس پیدا ہوا' لیکن اس جدائی کا شیطان پر کیا اثر ہوا' وہ اس کے کردار سے ظاہر ہے۔ اگر شیطان راندۂ درگاہ ہے تو انسان بھی تو خطاکار ہے۔ اس اعتبار سے دونوں اپنی اپنی جگہ پیچ و تاب میں مبتلا ہیں۔ لہٰذا اقبال کبھی تو شیطان سے کہتے ہیں۔

بگو ابلیس را از من پیامے
تپیدن تاکجا در زیر دامے
مرا ایں خاکدانے خوش نیاید
کہ صبحش نیست جز تمہید شامے

(میری طرف سے شیطان سے کہہ کہ کب تک اس اس دنیا کے جال میں پھنسے تڑپتے رہو گے۔ مجھے تو یہ دنیا بالکل پسند نہیں آئی کیونکہ اس کی ہر صبح' شام کی تمہید کے سوا کچھ نہیں' یعنی ہر صبح کا اختتام شام پر ہوتا ہے)

اور کبھی یوں گویا ہوتے ہیں۔

بیا تا نرد را شاہانہ بازیم
جہان چارسو را در گدازیم
بافسون ہنر از برگ کاہش
بہشتے ایں سوئے گردوں بسازیم

(آ۔ تاکہ ہم دونوں مل کر مردانہ وار زندگی بسر کریں۔ اس جہان چار سو میں حسد اور بغض کے بجائے سوزوگداز کی کیفیت پیدا کر دیں اور ان صلاحیتوں کے ذریعے، جو ہم دونوں کو حاصل ہیں، اس دنیا جیسی بیکار شے کو بہشت بریں کا نمونہ بنا دیں)

مگر شیطان اور انسان کے اکٹھے ہو سکنے کا کوئی امکان نہیں، ادھر مردحق پرست بھیجنے کے متعلق افلاک خاموش ہیں، لہٰذا خیروشر کی کشمکش جاری ہے۔ اس مرحلے پر اقبال کے 'شیطان' کا پانچواں اہم پہلو، یعنی شیطان کی سیاسی شخصیت نگاہوں کے سامنے ابھرتی ہے۔ گو شیطان کا یہ پہلو، بوسانی اور این میری شمل ایسے مستشرقین کے نزدیک شیطان سے متعلق بین الاقوامی ادب میں علامہ کا ایک اچھوتا تخلیقی اضافہ ہے لیکن ان مستشرقین نے اقبال کی مشہور و معروف نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کو مدنظر رکھتے ہوئے، اقبال کے 'شیطان' کی سیاسی شخصیت کے صرف عالمی حصے ہی کا جائزہ لیا ہے، یعنی یہ کہ شیطان بجائے خود سرمایہ دارانہ نظام کا موجد اور محافظ ہے، اس لئے اسے کل کے اشتراکی انقلاب کا ڈر نہیں۔ اگر اسے کوئی خوف ہے تو فقط اسلام کے احیاء سے ہے۔ لہٰذا وہ اپنے مشیروں کو تلقین کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آئین پیغمبر کو چشم عالم سے پوشیدہ رکھیں اور ایسی صورت حالات پیدا کریں جس سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی تخلیقی عمل کے عنصر سے مستقل طور پر غیرمانوس رہ سکے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ اقبال کے 'شیطان' کے وہ تمام پہلو جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس کی شخصیت کے ذاتی، داخلی یا انفرادی پہلو ہیں، لیکن اس کی شخصیت کا سیاسی پہلو اپنی نوعیت میں خارجی اور اجتماعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پہلو کی تکمیل کے لئے شیطان کو خاکی شیاطین تخلیق کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ علامہ نے خاکی شیاطین کو مختلف نام دے رکھے ہیں، مثلاً شیطان کے سیاسی فرزند، شیاطین ملوکیت، ارباب کیں، بتان آزری، بتان تازہ، ساقیان سامری فن، رہزنان چشم و گوش، نمک پروردۂ نمرود، نمرودان ایں دور، مرغان صحرا کے اچھوت، کوے، گدھ، چمگادڑ، مکھیاں وغیرہ۔

خاکی شیاطین چونکہ شیطان کے مظاہر ہیں، اس لئے ان کی شخصیت اور ان کا طریقہ ء

واردات بھی شیطان ہی سے اخذ کردہ ہے۔ دوسرے مذہبوں میں تو آراء کے اختلاف کی وجہ سے فرقے پیدا ہو سکتے ہیں لیکن شیطان کے مذہب میں اختلاف رائے کی گنجائش نہیں' لہٰذا اس کے مذہب میں کوئی فرقہ نہیں۔ اس معاملے میں اقبال کا شیطان صاف صاف کہتا ہے ۔

کیش ما را ایں چنیں تاسیس نیست

فرقہ اندر مذہب ابلیس نیست!

خاکی شیاطین بھی شیطان کی طرح حسد اور تکبر کی حمایت میں عقلی حجتوں پر مبنی معذرت پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی عقل دل کے تابع نہیں بلکہ دل سے آزاد ہے' اس لئے وہ عقل طاغوتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

عقل اندر حکم دل یزدانی است

چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

طاغوتی عقل کے استعمال کا مقصد محض یہ ہے کہ مکروفریب کو اس طرح کی حجتوں کے لبادے میں پیش کیا جائے کہ عام انسانوں کے لئے دلائل کے ذریعے اسے رد کر سکنا محال ہو۔ اس طریقے سے کسی عمارت کا اوپر کا ڈھانچا برقرار رکھتے ہوئے اس کی بنیادیں کھوکھلی کی جا سکتی ہیں' نظریات کے سادہ اور سلیس معانی روزروشن کی طرح عیاں ہونے کے باوجود ان کی روح مسخ کی جا سکتی ہے' تاریخ کا مفہوم بدلا جا سکتا ہے یا سچ کو جھوٹ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ طاغوتی عقل کے استعمال کی بے شمار مثالیں تاریخ اسلام میں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً جب امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تو اس کی تشہیر کے لئے والی مدینہ مروان نے شہر کے سرکردہ لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ امیرالمومنین نے سنت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مطابق تم پر حکومت کرنے کے لئے یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کیا ہے۔ عبدالرحمٰن ابن ابوبکرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تقرر سنت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مطابق نہیں بلکہ سنت قیصر و کسریٰ کے مطابق ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنی اولاد یا اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا ولی عہد نامزد نہیں کیا تھا۔ اس پر مروان نے کہا کہ خلفائے متقدمین کی سنت میں اگر اس کا اثبات نہیں تو امتناع بھی نہیں۔ لہٰذا اگر حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ اپنی اولاد میں سے کسی کو اس قابل سمجھتے تو اسے اپنا ولی عہد مقرر کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد کو اس قابل نہ سمجھا۔ لیکن امیرالمومنین اپنے فرزند کو اس قابل سمجھتے ہیں' اس لئے وہ یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کرنے میں حق بجانب ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس معاملے میں سنت ابوبکرؓ و عمرؓ کا اتباع بھی کیا ہے۔

علامہ کے نزدیک کشمکش عقل کا یہ فریب دیکھنے اور سمجھنے کے لائق ہے کیونکہ ایک طرف تو عقل میر قافلہ ہے اور اندھیرے سے روشنی کی طرف انسان کی رہبری کرتی ہے، دوسری طرف یہی عقل رہزنی کا ذوق بھی رکھتی ہے لہٰذا اس کے ذریعے شیطانی مقاصد کی تکمیل ممکن ہے۔

فریب کشمکش عقل دیدنی دارد
کہ میر قافلہ و ذوق رہزنی دارد

اگرچہ دور ملوکیت ختم ہو چکا لیکن طاغوتی عقل ہی کی بدولت نظام ملوکیت کسی نہ کسی شکل میں اب تک برقرار ہے، یعنی گو شخصی حکومت داستان پارینہ بن چکی ہے مگر جمہوریت کے پردے میں آمریت کا فرسودہ نظام ہنوز قائم ہے۔

چنگ تیموری شکست، آہنگ تیموری بجاست
سربروں می آرد از ساز سمرقندے دگر

طاغوتی عقل کے ذریعے ہی خاکی شیاطین کے پیشوا قوت فرماں روا کو اپنا معبود سمجھتے ہوئے، ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے بے شعورو! اس ملک کے قیام میں جمہوریت کا سرے سے کوئی دخل نہیں کیونکہ قائداعظم تو آمر تھے اور پاکستان عوام کی رضا سے نہیں بلکہ خواص کی رضا سے وجود میں آیا۔

شیخ ملت با حدیث دل نشیں
بر مراد او کند تجدید دیں
قوت فرماں روا معبود او
در زیان دین و ایماں سود او

اسی عقل کے طفیل ان کے امام اور شیوخ تاریخ کو مسخ کرتے ہیں اور اپنی تجدید دین کو کلیم اللّٰہی کا نام دیتے ہیں۔ علامہ واضح کرتے ہیں۔

سخت باریک ہیں امراض امم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی!
دین شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوت فرعون کی درپردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

دوسری طرف ان کے حمایتی جھوٹے، مکار اور خرقہ باز پیر اپنے مریدوں کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ اس دور کے نمرودوں سے آشنائی پیدا کرو تاکہ ان کی طاغوتی طاقت کے فیض سے عوام پر تمہاری گرفت مضبوط ہو سکے۔

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے
ترا ایں نکتہ باید حرزجاں کرد
بہ نمرودان ایں دور آشنا باش
ز فیض شاں براہیمی تواں کرد

دلوں کو تاراج کرنے کے لئے خاکی شیاطین ہر کوچے اور ہر بازار میں بدی، طمع، حرص اور ہوس کی دکانیں سجاتے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر یہ سوداگر اس قدر ارزاں فروشی سے کام لیتے ہیں کہ ان کے ہاں بیش قیمت گناہ بھی کوڑیوں کے دام بکتے ہیں۔

بہ ہر کو رہزنان چشم و گوش اند
کہ در تاراج دل ہا سخت کوش اند
گراں قیمت گناہے با پشیزے
کہ ایں سوداگراں ارزاں فروش اند

وہ پتھر کی طرح سخت دل اور آئینے کی طرح صاف چہرے سے باربار اعلان کرتے ہیں کہ ہم تو اصول کے پابند ہیں، ہمیں فروع سے سروکار نہیں، اس لئے شخصی حکومت کے استبداد کا ذکر نہ کرو، آزادی فکر و تحریر پر زنجیروں کی طرف نہ دیکھو، عوام کے حقوق کی پامالی کی داستان نہ چھیڑو۔ ہم نے اصولی طور پر تو جمہوری نظام نافذ کر رکھا ہے اور ہر کسی کو تنقید کی کھلی اجازت ہے۔ گویا۔

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

ان کے نافذ کردہ نظام کے باعث رشوت ستانی اور بدعنوانی کا دوردورہ ہوتا ہے۔ ہر غرض مند بر سرعام بکنے لگتا ہے۔ عدل و مساوات محض اصطلاحوں کی صورت میں غیر عملی بحثوں کے لئے رہ جاتے ہیں، اور کسی کو بھی خدا کا خوف نہیں رہتا۔

اس دیر کہن میں ہیں غرض مند پجاری
رنجیدہ بتوں سے ہوں تو کرتے ہیں خدا یاد!
پوجا بھی ہے بے سود، نمازیں بھی ہیں بے سود

قسمت ہے غریبوں کی وہی نالہ و فریاد!
ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ ء آباد!
تیشے کی کوئی گردش تقدیر تو دیکھے
سیراب ہے پرویز، جگر تشنہ ہے فرہاد!
یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت
جو کچھ ہے، وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد!

یہاں تک کہ عفت فکر تباہ ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی حریت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور حریت، عفت فکر کا تحفظ نہیں تو اور کیا ہے؟ انجام کار ایسی ملت کا سربراہ اس معبود کی طرح بے بس ہو کر رہ جاتا ہے جس کے حرم کا طواف سینکڑوں شیطان تو کرتے ہیں لیکن ان میں ایک بھی روح الامین نہیں ہوتا۔

خداوندے کہ در طوف حریمش!
صد ابلیس است و یک روح الامیں نیست

اسی لئے علامہ فرماتے ہیں۔

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشہ ء قوت ہے خطرناک!

ان کے نزدیک اگر کسی دستور عمل کے پس پشت عوام کی قوت رضا موجود نہیں تو وہ محض مکروفریب ہے۔ اسی طرح ایسی طاقت جسے عوام کی حمایت نصیب نہیں، محض جہالت و جنوں پر قائم ہے۔

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوت بے رائے جہل است و جنوں

علامہ ارشاد فرماتے ہیں۔

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد
ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
و لیکن الاماں از عصر حاضر
کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

(اسلام کے نظام حکومت میں سب سے اہم خاصیت تو یہ تھی کہ اس نے فقر اور سلطنت کو

آپس میں مدغم کر دیا۔ چنانچہ اس ادغام کے باعث دنیا اور آخرت آپس میں مل گئیں ــــــ لیکن عصر حاضر سے خدا کی پناہ! جس نے ایسا نظام مسلمانوں پر نافذ کر رکھا ہے کہ سلطنت، شیطانیت کے ساتھ خلط ملط کردی گئی ہے)

سلطنت، شیطانیت کے ساتھ اسی وقت خلط ملط ہوتی ہے جب حسد اور تکبر کی حمایت میں خاکی شیاطین طاغوتی عقل کے ذریعے اپنا وہی فرسودہ عذر دہراتے ہیں کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، ملت کی فلاح و بہبود کی خاطر کیا جا رہا ہے۔ وہ کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ تخلیقی عمل ان کے بس کا روگ نہیں۔ ان کا کام تو کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ شخصی حکومت ہی ملت کی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ وہ آزاد پرندوں کو ایک بار پھر قفس میں ڈالتے ہیں اور انہیں پچکار کر کہتے ہیں کہ یہ قید نہیں، حفظ ماتقدم ہے۔ اسی سبب علامہ فرماتے ہیں۔

میں ہوں نومید تیرے ساقیان سامری فن سے
کہ بزم خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی!

علامہ کے نزدیک جس تمدن کی بنیادیں سرمایہ داری پر استوار ہوں، چونکہ اس کا موجد و محافظ شیطان خود ہے، اس لئے اسے انسانی تدبر کے ذریعے محکم نہیں کیا جا سکتا۔ آمریت و استبداد، سرمایہ دارانہ نظام ہی کی پیداوار ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

وہ مرد مسلمان کو مخاطب کر کے سوال کرتے ہیں۔

آتی ہے دم صبح صدا عرش بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک؟

پھر مرد مسلمان سے گلہ کرتے ہیں کہ تجھ سے زیادہ غافل شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگرچہ تیرے سینے میں دل موجود ہے لیکن تو اس سے قطعی بیگانہ ہے۔

غافل ترے ز مرد مسلماں ندیدہ ام!
دل درمیان سینہ و بیگانہ ء دل است

خاکی شیاطین کے طاغوتی دلائل کا رد اسی وقت ممکن ہے کہ انسان پرورش دل کی طرف متوجہ ہو۔ دل چونکہ عشق و فقر کا مسکن ہے' اس لئے وہی انسان کو احساس دلاتا ہے کہ طاغوتی استدلال اس کے اطمینان کا باعث نہیں بن سکتا۔ جھوٹے الفاظ خواہ کتنے ہی قرینے سے ادا کیے جائیں' دل کو اطمینان نہیں دے سکتے۔ دلوں کو اطمینان نہیں تو سچی بات سے ملتا ہے۔ اس معاملے میں شہادت حسینؓ مسلمانوں کے لئے درس بصیرت ہے اور واضح کرتی ہے کہ اگر جابرانہ حکومت کا وجود ہے تو اس کے لئے حق کی قربانی ناگزیر ہے۔ جو ہاتھ یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کی خاطر بڑھے' انہوں نے اسلام کی روح حریت و جمہوریت کو غارت کر کے عامتہ المسلمین پر غلبے' جبر اور سیاسی مکر و فریب کی حکومت مسلط کی۔ یہ نظام محض اغراض نفسانیہ اور مقاصد سیاسیہ کی بنا پر وجود میں لایا گیا۔ لیکن "سرو آزادے زبستان رسول" نے ثابت کر دیا کہ ظلم کا صاحب شوکت و عظمت ہونا اس کے لئے کوئی الہی سند نہیں کہ اس کی اطاعت کر لی جائے۔ پس میدان کربلا میں حق کے ہاتھوں طاغوتی عقل کو شکست ہوئی۔ اسرار و رموز کی مشہور و معروف نظم "در معنی حریت اسلامیہ" اور "سر حادثہ ء کربلا" میں علامہ واضح کرتے ہیں۔

موسیٰ و فرعون و شبیرؓ و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است — باطل آخر داغ حسرت میری است
چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوہ خیر الاممؐ — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
بر زمین کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تاقیامت قطع استبداد کرد — موج خون او چمن ایجاد کرد
بہر حق درخاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لاالہ گردیدہ است
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست
نقش الا اللہ بر صحرا نوشت — سطر عنوان نجات ما نوشت

علامہ فرماتے ہیں۔

عشق طینت میں فرومایہ نہیں مثل ہوس
پر شہباز سے ممکن نہیں پرواز مگس!

یوں بھی دستور گلستاں کو بدل سکتے ہیں
کہ نشیمن ہو عنادل پہ گراں مثلِ قفس!
سفر آمادہ نہیں منتظرِ بانگِ رحیل
ہے کہاں قافلہ ء موج کو پروائے جرس!
پرورشِ دل کی اگر مدِنظر ہے تجھ کو
مردِ مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس!

اس دل ہی کی بدولت انسان کو وسعت نگاہ نصیب ہوتی ہے اور اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ وہ گداگر، سکندر سے ہزار درجہ بہتر ہے جو مالِ سکندری جانتا ہے۔

بچشم اہلِ نظر از سکندر افزون است
گداگرے کہ مالِ سکندری داند

اس لئے علامہ فرماتے ہیں۔

دل بحق بندو کشادے ز سلاطیں مطلب
کہ جبیں بر درِ ایں بت کدہ سودن نتواں

(اپنے دل کا رشتہ خدا سے استوار کر اور بادشاہوں سے کشادگی رزق کی طلب نہ رکھ کیونکہ اس بت خانے کی دہلیز پر ماتھا رگڑا نہیں جا سکتا)

علامہ کے نزدیک جس طرح عشق خاکی شیاطین کے حسد کا خاتمہ کرتا ہے، اسی طرح فقر غیور ان کے تکبر کا قلع قمع کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

فقیرم ساز و سامانم نگاہیست
بچشمم کوہِ یاراں برگِ کاہیست
زمن گیر ایں کہ زاغِ دخمہ بہتر
ازاں بازے کہ دست آموزِ شاہیست!

(میں تو فقیر ہوں۔ میرا ساز و سامان فقط نگاہ ہے۔ میری نظر میں احباب کی دولت کے انبار کی وقعت گھاس کے ایک تنکے سے زیادہ نہیں ------ کیونکہ میرے نزدیک پارسیوں کے مرگھٹ کا ایک کوا جو مردار کھا کر جیتا ہے، اس باز سے بہتر ہے جو بادشاہوں کا سدھایا ہوا اور ان کے ہاتھ کی زینت بنتا ہے)

پس انسان عشق، فقر غیور اور پرورش دل ہی کے ذریعے خاکی شیاطین کے طریقہ ء واردات کو ناکام بناتا ہے۔ ان کی طاغوتی عقل بالآخر دل ہی کے ہاتھوں مار کھاتی ہے لیکن یہ انقلاب کب آتا ہے؟ علامہ فرماتے ہیں۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہان چار سو و رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انساں کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تار رفو
ضربت پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بت سنگیں دل و آئینہ رو

اسی انقلاب کے انتظار میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے عرض کرتے ہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کار بے نظام او چہ گویم
تو می دانی کہ ملت بے امام است

(اے رسولؐ اللہ! ابھی تک چرخ نیلی فام کج خرام ہے۔ ابھی تک کاروان ملت اپنے مقام سے بہت دور ہے۔ میں حضور سے اس کی بے نظمی کے متعلق کیا عرض کروں، آپ جانتے ہیں کہ ملت بے امام ہے)

پھر افلاک کی طرف نگاہ اٹھا کر خداوند تعالیٰ سے شکایت کرتے ہیں۔

نگاہ تو عتاب آلود تا چند
بتان حاضر و موجود تاچند
دریں بت خانہ اولاد براہیم
نمک پروردۂ نمرود تاچند

(اے خداوند! تیری نگاہ ہم پر کب تک عتاب آلود رہے گی۔ بتان حاضر و موجود کب تک ہم پر حاوی رہیں گے۔ اس ملک میں مسلمان کب تک نمرود کے نمک پروردہ اور غلام رہیں گے؟)

○

اقبال کے شذرات ☆

علامہ کے غیر مطبوعہ انگریزی شذرات کا ایک مجموعہ بعنوان "افکار منتشر" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ علامہ کے مسودات میں یہ شذرات ایک ڈائری یا نوٹ بک کی صورت میں محفوظ تھے۔ نوٹ بک کے سرورق پر اس کا عنوان علامہ کے اپنے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے اور نیچے محمد اقبال ۲۷ر اپریل ۱۹۱۰ء ثبت ہے۔

۱۹۱۰ء میں جب علامہ نے ان شذرات کو قلمبند کرنا شروع کیا تو ان کی عمر چونتیس برس تھی اور آپ انارکلی بازار کے ایک مکان میں فروکش تھے۔ اسی سال برصغیر ہند کے نام نہاد آئین میں مورلے منٹو اصلاحات کا نفاذ ہو چکا تھا۔ نئے انڈین کونسلز ایکٹ کے تحت جداگانہ انتخابات کا اصول گو مان لیا گیا تھا لیکن نہ تو ملک کی سیاسی فضا ایسی جاندار تھی نہ سرسید کی پالیسی کے زیر اثر مسلمانان ہند کو ملک کی عملی سیاسیات میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ مسلمان رؤسا سرکار کی خوشامد میں اپنا بیشتر وقت صرف کرتے تھے اور مسلم عوام میں صحت مند سیاسی شعور پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان حالات کے پس منظر میں علامہ اقبال جیسی شخصیت کو کوئی بھی قابل ذکر سیاسی خدمت کرنے کا موقع ملنا محال تھا۔ علاوہ اس کے وہ اپنی افتاد طبع کے سبب بھی کسی سرکاری منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

متذکرہ شذرات بہت حد تک علامہ اقبال کے ان تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں جو ملک کے سیاسی و معاشی حالات اور ان کے مسلمانان ہند سے تعلق کی بنا پر اس وقت ان کے دل و دماغ میں ترتیب پا رہے تھے۔ گو یہ شذرات آج سے نصف صدی پیشتر کے حالات سے

☆ ۲۱ر اپریل ۱۹۶۲ء، لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر جناب جسٹس کیانی کی زیر صدارت پڑھا گیا۔

متعلق ہیں، پھر بھی ان میں سے بعض ایسے جامع اور منفرد ہیں جن سے ہمارے موجودہ مسائل کے حل کے لئے استفادہ کرنا ہماری رہنمائی کا سبب بن سکتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

"الگذنڈر پوپ کا قول ہے کہ نظام حکومت کی طرزوں پر جھگڑنا بیوقوفوں کا کام ہے۔ لیکن میں اس سیاسی فلسفے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میری نگاہ میں نظام حکومت چاہے کسی طرز کا ہو، اس کی اہمیت اس اصول سے پرکھنی چاہئے کہ آیا وہ کسی قوم کے کردار کی تعمیر کرتا ہے یا تخریب۔ سیاسی قوت کا زوال کسی قوم کی سیرت کی تشکیل کے لئے انتہائی مہلک ہے۔ جب سے مسلمانانِ ہند کا سیاسی زوال آیا ہے، وہ بسرعت تمام اخلاقی انحطاط سے دوچار ہو گئے ہیں۔ جہاں تک کردار کا تعلق ہے، وہ دنیائے اسلام کی تمام قوموں سے اغلباً ذلیل ترین ہیں۔ میرا مقصد اس ملک میں ہماری گزشتہ عظمت کی تحقیر نہیں کیونکہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ مختلف قوتیں جو بالآخر قوموں کے مقدر کا فیصلہ کرتی ہیں، میں ان کے بارے میں مشیت ایزدی کا قائل ہوں۔ بحیثیت ایک سیاسی قوت شاید اب ہم مطلوب نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ہمارا وجود اقوام عالم میں اس لئے ازبس ناگزیر ہے کہ فقط ہم ہی توحید باری تعالیٰ کے داعی ہیں۔ اس اعتبار سے اقوام عالم میں ہماری اہمیت خالصتاً شہادتی نوعیت کی ہے۔"

علامہ کے ان ارشادات کے پیش نظر یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت قوم کے کردار کی تشکیل کے لئے ایک نہایت فعال اور موثر قوت ہے۔ پس قوم کی سیرت کی تشکیل و تعمیر کے لئے حکومت کی ہیئت ترکیبی اس نہج پر ہونی چاہیے جس سے اس مقصد کا حصول ممکن ہو۔ ایک اور جگہ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

"جہاں تک دینی نظریات کے ارتقاء کا تعلق ہے، ہر ملت بلوغ تک پہنچنے کے لئے تین اہم منازل سے گزرتی ہے۔ اول، روایتی مذہب کے بارے میں شک و شبہہ کا اظہار اور پھر اس کے احکام کے خلاف بغاوت کا رویہ۔ دوم، مذہب کی اہمیت کا بحیثیت ایک اہم معاشرتی قوت بالآخر محسوس کیا جانا اور یوں دوسری منزل کی ابتدا ہوتا ہے، یعنی کوشش کی جاتی ہے کہ مذہب کی منطق کے ساتھ تطبیق کی جائے۔

سوم، یہ کوشش بالعموم اختلاف رائے کا سبب بنتی ہے جس کے نتائج ایک ملت کی وحدت اور بقا کے لئے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اختلاف رائے، اگر دیانت دارانہ نہ ہو (اور بدقسمتی سے وہ عام طور پر دیانت دارانہ نہیں ہوتا) تو اس کے نتیجے میں ملت کے شیرازے کا بکھر جانا لازمی ہے۔ مسلمانان ہند اس وقت تیسرے مرحلے میں ہیں یا اغلباً کسی حد تک دوسرے اور کسی حد تک تیسرے مرحلے میں ہیں۔ میری نظر میں یہ دور ہماری قوم کی مجموعی زندگی کا نازک ترین دور ہے۔ لیکن مجھے اتنا اطمینان ہے کہ مختلف نوعیت کی بعض ایسی قوتیں بھی برسرِ عمل ہیں جو ملت کی سالمیت اور استحکام کو وجود میں لائیں گی، گو مجھے یہ خدشہ ہے کہ ان کا اثر دیرپا نہ ہو گا۔"

۱۹۱۰ء جس میں یہ شذرات تحریر کئے گئے، وہ دور تھا جب مسلمانان ہند کی دینی زندگی میں نظریاتی تصادم کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانان ہند اسلام کے نام پر آپس میں مختلف گروہوں اور فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ چونکہ ان کے نظریاتی اختلافات دیانت پر مبنی نہ تھے، اس لئے وہ اپنی تمام تر قوتیں ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانے میں صرف کر رہے تھے۔ مسلمانان ہند کی دینی زندگی کا یہ دور نظریاتی انتشار اور ابتری کی وجہ سے بے حد مایوس کن تھا، لیکن اس کے باوجود اقبال کی بصیرت ملاحظہ ہو کہ انہوں نے یہ پیش گوئی کی کہ برصغیر ہند میں ایسے عوامل بھی کارفرما ہیں جو آگے چل کر مسلمانوں کے ملی وجود کے قیام اور بقا کا موجب بنیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اقبال کی دوربین نگاہ یہ دیکھ رہی تھی کہ مستقبل قریب میں مسلمانوں کو اپنے ملی وجود کے قیام اور بقا کے لئے انگریز اور ہندو سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور اس وقت جو قوت ان کی محافظ و مددگار بن کر سامنے آئے گی، وہ فقط اسلام ہو گی۔ اور یہی ہو کر رہا۔ یعنی وہی مسلمان جو اسلام کے نام پر ایک دوسرے کو کافر گردانتے تھے، آخر اسلام ہی کے نام پر اکٹھے ہوئے اور نہ صرف انگریز اور ہندو سے نپٹے، بلکہ اپنے لئے ایک علیحدہ وطن بھی حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ علامہ کی اس پیش گوئی کے ساتھ ساتھ جس احتمال کی نشان دہی کی گئی تھی (یعنی وہ عوامل جو مسلمانوں کو متحد کرنے کا موجب بنیں گے، ان کا اثر دیرپا نہ ہو گا) وہ بھی بعینہٖ درست ثابت ہو رہی ہے۔ پاکستان کے وجود میں آ جانے کے بعد آج ہم پھر متضاد نظریاتی کشمکش کے دوراہے پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔

علامہ کے یہ شذرات اس لئے قابل غور ہیں کہ ان کے نزدیک کسی حکومت کی ہیئت ترکیبی اگر قومی سیرت کی تشکیل و تعمیر کا سبب نہیں بن سکتی تو وہ قابل ستائش نہیں ہے۔ اسی طرح نصب العین کے متعلق اگر کسی ملت میں غیر دیانت دارانہ اختلاف رائے نشوونما پا رہا ہے تو اس کے نتائج بھی تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

پاکستان دینی' سیاسی' معاشرتی' اقتصادی' اخلاقی غرضیکہ ہر اعتبار سے ابھی ارتقائی منازل میں ہے اور حقیقت بیں نظروں سے یہ بات اوجھل نہیں کہ آج پاکستان میں ایسے عوامل برسرپیکار ہیں جو اس کی وحدت اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار کرنا بھی مشکل ہے کہ پاکستان کے موجودہ احوال' مثلاً متکبر روسا' مغرب زدہ دانشور' پیشہ ور پیر' قرون وسطی کی ذہنیت رکھنے والے مذہبی رہنما اور برگشتہ عوام بہت حد تک انقلاب سے پیشتر کے روس سے مشابہت رکھتے ہیں۔ زار کی مطلق العنانیت' روس کا جامد مذہب اور اس کی خالی از اثر وسعت نظر' لینن کی تنظیم' انضباط اور اس کے یسیر الفہم مقصد کے سامنے دھوئیں کی طرح اڑ گئیں۔

اقبال نے مظہر لینن پر بھی غور کیا تھا۔ انہوں نے اپنی نظم "لینن' خدا کے حضور میں" میں یہ واضح کر دیا کہ جو تباہی لینن کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئی' وہ بے ثمر مذہب' سنگدل سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی شہنشاہیت کا ایک قسم کا لازمی نتیجہ تھی۔

پس ہمیں اس پیش پاافتادہ حقیقت کو جلد سمجھ لینا چاہیے کہ آج پہلے سے بھی کہیں زیادہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اس نصب العین کو مخلصانہ طور پر اپنا کر بروئے کار لائیں جس کی اساس پر پاکستان حاصل کیا گیا۔ یعنی معاشرے کی تشکیل و تعمیر صحیح جمہوریت' اخوت' مساوات اور معاشی انصاف کی قدروں پر استوار کی جائے اور ان قدروں کو معاشرے کے سیاسی' اخلاقی اور اقتصادی شعبوں میں پوری سعی اور کوشش کے ساتھ جاری و ساری کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ وقت کے جدید تقاضوں کے پیش نظر از بس اور از حد لازم ہے کہ پاکستان میں اسلامی سوشل ازم کا نفاذ کیا جائے ورنہ مستقبل قریب میں ہم کسی نہ کسی ایسے 'ازم' کی لپیٹ میں آجائیں گے جس سے نجات پانا محال ہو جائے گا۔

○

پاکستانیات

فکر اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کا جائزہ ☆

۱۸۹۵ء میں جب علامہ اقبال نے ہوش سنبھالا اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر سیالکوٹ سے لاہور تشریف لائے تو اپنے دور کے حساس نوجوانوں کی طرح آپ بھی گردو پیش سے اثر قبول کر رہے تھے۔ دنیائے اسلام جس کس مپرسی کی حالت میں تھی، وہ ان سے مخفی نہ تھی۔ سلطنت عثمانیہ محض نام کی اسلامی سلطنت رہ گئی تھی۔ اسلام مشرقی یورپ سے رفتہ رفتہ نکالا جا رہا تھا۔ جنوبی روس کی اسلامی ریاستیں یکے بعد دیگرے سلطنت روس کا حصہ بن چکی تھیں۔ مضطرب چینی مسلمان جنگ آزادی ناکام ہونے کے بعد سیاسی قوت کی حیثیت سے نیست و نابود کیے جا چکے تھے۔ انگریز مصر پر حاوی تھے۔ فرانسیسیوں کی نگاہیں مراکش پر تھیں، ایران نزع کے عالم میں تھا۔ انڈونیشیا پر ولندیزی دباؤ کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت قابل رحم تھی، اور برصغیر ہند میں بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اسلام کے جھنڈے سرنگوں ہو چکے تھے۔

اس بے بسی کے عالم میں ہندی اسلام کے لئے خلافت عثمانیہ کی زیر قیادت، اتحاد اسلامی، (پین اسلام ازم) کی تحریک ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ مسلمانوں کی نگاہیں خلیفہ ء اسلام کی طرف اٹھتی تھیں کیونکہ سلطنت عثمانیہ ہی صرف ایک ایسی سلطنت رہ گئی تھی جس

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۵۸ء لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

کا بین الاقوامی سیاسیات میں کچھ نہ کچھ وقار ابھی قائم تھا۔ لیکن یورپی طاقتوں میں ملک گیری کی ہوس بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ان کی نگاہوں میں تو نام کی سلطنت عثمانیہ میں اسلام کا ٹمٹماتا ہوا آخری چراغ بھی کھٹک رہا تھا۔ انگریز، یونانیوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر اکسا رہے تھے جس کی وجہ سے مسلمانانِ ہند میں انگریز حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا تھا۔ سرسید گو غروب ہوتا ہوا آفتاب تھے مگر ان کی نگاہوں کے سامنے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ابھی تک ایک زندہ حقیقت تھا۔ انہیں خوف تھا مبادا مسلمان اس نئے جذبہء نفرت سے متاثر ہو کر ایک بار پھر اپنے حاکموں سے نبرد آزما ہو جائیں اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے جو عمارت انہوں نے بلند کر رکھی تھی، زمین پر آ رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان سیاسیات سے کنارہ کش رہیں یا انہیں دنیائے اسلام کی سیاسی کشمکش میں دلچسپی لینے سے باز رکھا جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر سرسید نے خلافت عثمانیہ کی تردید میں کچھ مضامین تحریر کیے اور اتحاد اسلامی' کی تحریک کی مخالفت کی۔

۱۸۸۲ء میں جب جمال الدین افغانی کو انگریزوں نے مصر سے جلاوطن کیا اور وہ برصغیر ہند میں کچھ عرصے کے لئے نظر بند کر دیے گئے تو سرسید اور ان کے حامیوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جمال الدین افغانی' اتحاد اسلامی' کے علمبردار تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اسلام کا دفاع اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلمانانِ عالم متحد ہو کر یورپی طاقتوں کا سامنا کریں۔ 'اتحاد اسلامی' کے اس علمبردار نے محض ایک تصور ہی پیش نہ کیا تھا بلکہ یہ اللہ کا بندہ جہاں کہیں بھی گیا' اس نے اپنے پیچھے اپنے ہم خیال چھوڑ کر یا اپنے نظریے کی حمایت میں انجمنیں قائم کر کے اپنے تخیل کو حقیقت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اسلام کی خاطر جس قدر سفر جمال الدین افغانی کو میسر آیا' شاید ہی کسی سالک کو نصیب ہوا ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ مرد درویش کبھی افغانستان میں' کبھی ایران میں' کبھی حجاز میں' کبھی شام میں' کبھی مصر میں' کبھی ہندوستان میں' کبھی ترکیہ میں' کبھی مراکش میں' کبھی فرانس میں' کبھی جرمنی میں' کبھی روس میں' کبھی انگلستان میں اسلام کی خاطر مارا مارا پھرا۔

برصغیر ہند میں قیام کے دوران گو سرسید اور ان کے حامی جمال الدین افغانی سے الگ تھلگ رہے لیکن اس دور کے حساس اور حریت پسند نوجوان جمال الدین افغانی ایسے دردمند کی مقناطیسی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور دل ہی دل میں ان کی عزت کرنے لگے۔ جمال الدین افغانی کے مختصر قیام نے مسلمانانِ ہند کی نئی پود پر اپنا اثر چھوڑا۔ وہ نوجوان جو ملت کی حالت زار پر پریشان و افسردہ خاطر رہتے تھے اور جنہوں نے جمال الدین افغانی

سے اثر قبول کیا' ان میں سے ایک علامہ اقبال بھی تھے۔

۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۴ء تک یعنی بائیس برس سے ستائیس برس کی عمر تک علامہ اقبال نے جو بھی نظمیں ملت اسلامیہ سے متعلق تحریر کیں' ان میں یاس و ناامیدی کی انتہا ہے۔ ان کی نگاہ میں ملت اسلامیہ ایک یتیم ملت تھی جسے کبھی تو وہ "تصویر درد" بنی بیٹھی دیکھتے تھے اور کبھی "نالہ ء یتیم" بلند کرتے یا "فریاد بحضور سرور کائنات" بلند کرتے سنتے تھے۔ زبان پر خاموشی کے قفل پڑے تھے۔ اسلام کی بحیثیت ایک سیاسی قوت موت واقع ہوا چاہتی تھی' لیکن مسلمانان ہند محض تماشائی تھے۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک علامہ اقبال یورپ میں رہے۔ جب واپس آئے تو ان کی نگاہ میں اسلامی ممالک کے اتحاد کے سوا دنیائے اسلام کا اور کوئی مستقبل نہ تھا۔۔۔۔ لیکن سیاسی اعتبار سے دنیائے اسلام بدستور رو بہ تنزل تھی۔ مسلمانان ہند اسی مایوسی اور ناامیدی کے دور سے گزر رہے تھے جس میں علامہ انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ کبھی کبھار جب حوادث مسلمانوں کو جھنجھوڑتے تو سراسیمگی کے عالم میں ان کی نگاہیں خلافت عثمانیہ کی طرف اٹھ جاتیں' مگر اس کے بعد پھر بے حسی طاری ہو جاتی۔ "شکوہ" اور "شمع اور شاعر" یورپ سے واپسی کے بعد تحریر کی گئیں۔ علامہ مسلمانوں کے طرز عمل پر نالاں تھے۔ انہیں مسلمانان ہند کی بے حسی خون کے آنسو رلاتی تھی۔ وہ حسرت سے اسلام کے عظیم الشان ماضی کی طرف دیکھتے اور جب حال کا جائزہ لیتے تو بے بسی کے عالم میں سپر ڈال دیتے۔

مگر علامہ کے قلب کی آواز ناامیدی اور مایوسی کے باوجود انہیں کشاں کشاں تاریکی سے روشنی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ ان دنوں بلقان سے مسلمان نکالے جا چکے تھے' ایران موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھا' طرابلس کے میدان مسلم مجاہدین کے خون سے لالہ زار تھے۔ علامہ نے اس دور میں جو بھی نظمیں تحریر کیں' ان کے اثر سے ہندی مسلمانوں میں جوش و خروش کمال تک پہنچ گیا۔ اسی زمانے میں "طرابلس کے شہیدوں کا لہو" تحریر کی گئی۔ "جواب شکوہ" مجروحین بلقان کی امداد کے لئے چندہ فراہم کرنے کی خاطر لکھی گئی۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ کے بادل امڈ رہے تھے تو علامہ مثنوی "اسرار خودی" لکھنے میں مصروف تھے۔ مثنوی "اسرار خودی" ۱۹۱۵ء میں اور "رموز بیخودی" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئیں۔ علامہ نے فلسفہ ء خودی کی تشکیل اسی دور میں کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ "خودی" کی تعمیر سے وہ ایک بار پھر اپنی کھوئی ہوئی عظمت' شوکت' قوت اور آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک ملت اسلامیہ ایک ایسی بے مثل جماعت ہے جو بے مثل افراد سے مل کر

بنی ہے۔ اس جماعت کی تعمیر نو کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو "مرد مومن" کی اعلیٰ صفات کے قالب میں ڈھال لیں۔ اسی دور میں علامہ نے مسلمانوں کی معاشری اور سیاسی حیات نو کی بنیادیں رکھیں اور اسلامی تعلیمات کو اپنے اچھوتے انداز میں پیش کر کے ہندی مسلمانوں کے دلوں میں "خود نگری" کا احساس پیدا کر دیا۔

لیکن عجیب اتفاق ہے، اِدھر تو علامہ اپنے تعمیری فلسفے کی بنیادیں استوار کر رہے تھے، اُدھر دنیائے اسلام کی حالت دگرگوں تھی۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی اور سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ یورپی طاقتوں نے دنیائے اسلام کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لئے۔ اتحاد اسلامی کا وہ جذبہ جو جنگ عظیم سے پیشتر مسلمانان عالم کو ایک دوسرے کے قریب تر لا رہا تھا، اسے کچل دیا گیا۔ دنیائے اسلام میں ایک بار پھر ناامیدی اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر علامہ پر اس ناامیدی اور مایوسی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں انہوں نے "خضر راہ" تحریر کی اور مسلمانوں کو امید کی روشنی دکھائی۔ وہ اس ناامیدی، مایوسی اور لاچاری کے عالم میں بھی مسلمانوں کو اپنی ذات پر یقین رکھنے اور ربط ملت پر زور دے رہے تھے۔

جنگ عظیم کے اختتام کے ساتھ ہی جمال الدین افغانی کی شروع کی ہوئی اتحاد اسلامی کی تحریک نے اسلامی وطنیت، کی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ ترکی، ایران، شام، فلسطین، مصر، مراکش، افغانستان وغیرہ میں مسلمان اپنے غیر مسلم حاکموں یا ان کے مفادات کے محافظوں کے خلاف جنگ میں مصروف ہو گئے۔ ترکوں نے یونانیوں اور انگریزوں کو اپنے وطن سے باہر نکال دیا اور مصطفیٰ کمال کی زیر قیادت جدید ترکی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح رضا شاہ پہلوی کے ہاتھوں جدید ایران وجود میں آیا۔ افغانستان میں انگریزی اثر کا قلع قمع کیا گیا اور جدید اصلاحات نافذ ہوئیں۔ عراق، شرق اردن اور حجاز کی نئی اسلامی ریاستیں معرض وجود میں آئیں مگر شام، فلسطین، مصر اور مراکش میں اسلام فرانسیسی اور انگریزی استبداد کے خلاف مصروف پیکار رہا۔

احرار اسلام کے جوش و خروش اور فتوحات سے متاثر ہو کر ۱۹۲۴ء میں علامہ نے "طلوع اسلام" لکھی۔ علامہ مشرق وسطیٰ میں وطنیت کے فروغ سے بے حد متاثر ہوئے، لیکن چونکہ ان اسلامی ممالک میں مسلمان اکثریت میں تھے، اس لئے وہاں وطنیت کا اسلام سے تصادم ممکن نہ تھا بلکہ "وطنیت" اور اسلام سے ایک ہی معنی اخذ کیے جاتے تھے۔ اس کے برعکس برصغیر ہند میں چونکہ مسلمان اقلیت میں تھے، اس لئے یہاں ان کے "وطنیت" کے علمبردار ہونے سے مراد اپنے آپ کو غیر مسلموں کی اکثریت میں مدغم کرنا

تھا' یا دوسرے لفظوں میں اپنی قبر آپ کھودنا تھا۔ اسی بنا پر برصغیر ہند میں علامہ نے وطنیت کے نظریے کی تو مخالفت کی' لیکن "اسلامی وطنیت" کی تحریک کو اپنی تحریر اور عمل کے ذریعے تقویت بخشی اور اس تحریک کے پہلے داعی قرار دیئے گئے۔

ان کے قول کے مطابق اسلام ایسی "وطنیت" کے خلاف ہے جو دین سے بے تعلق ہو اور جس کی بنیاد خالصتاً" نسل' رنگ' ذات پات' زبان یا علاقائی حدود پر رکھی گئی ہو۔ اس طرز کی وطنیت ایک ایسا سیاسی مسلک ہے جس کے دعوے تعلیمات اسلام کے سراسر خلاف ہیں مگر حب وطن' یعنی اپنے وطن' عقائد' تاریخی روایات یا تہذیب کی خاطر جان تک قربان کر دینے کا جذبہ علامہ کے نزدیک مسلمانوں کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔ علامہ کے خیال میں اسلام نسلی امتیازات اور ہمیشہ تبدیل ہونے والی جغرافیائی حدود کو صرف اقوام کی شناخت یا زمان و مکان میں ان کا تعین کرنے کی خاطر قبول کرتا ہے' اپنے ارکان کے معاشری دائرے کو محدود کرنے کے لئے قبول نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں وطنیت کی گنجائش ہے نہ ملک گیری کی' بلکہ اسلام تو ایک "دول مشترکہ" ہے۔ اسلام دراصل بین الاقوامی ہے۔

علامہ نے "وطنیت" کی جگہ اسلام کو ایک اجتماعی تعمیری سیاسی قوت کی حیثیت سے پیش کر کے' "اسلامی وطنیت" کے تصور کو آگے بڑھایا جو آخر کار برصغیر ہند میں مسلمانوں کی ایک جداگانہ آزاد ریاست کے قیام پر منتج ہوا۔ جس طرح مشرق وسطیٰ میں نئی قوموں پر مشتمل نئی مسلم ریاستیں منصہء شہود پر آئیں' اسی طرح قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں ہندی مسلمانوں ہی کے اندر سے ایک نئی قوم عالم وجود میں آئی جس کی تہذیب کا نقشہ اسلامی خطوط پر کھینچا گیا تھا۔ اس نئی قوم نے آخر کار حق خود ارادی کے ساتھ ساتھ اپنے لئے ایک مخصوص وطن یعنی پاکستان بھی حاصل کر لیا۔

جو کچھ میں نے اب تک عرض کیا ہے' اس سے صرف یہی بتانا مقصود نہیں کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کے ساتھ علامہ کی کیا وابستگی تھی بلکہ گزشتہ صدی میں دنیائے اسلام پر جو گزری' اس کا مختصر جائزہ پیش کرنے میں میرا مدعا دراصل آپ کو تاریخ کے اس تسلسل سے روشناس کرانا تھا جس کا رخ ہم نے بدل کر رکھ دیا۔ ہم مغلوب تھے' وطن اور سلطنت سے محروم تھے۔ غیر ملکی استبداد کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ ہم میں عزم تھا نہ ہمت تھی۔ قوت تھی نہ طاقت۔ فقط اک یاس' ناامیدی اور مایوسی کا عالم ہم پر طاری تھا اور تاریخ کا تسلسل ہمیں یوں بہائے لئے جا رہا تھا جیسے سیلاب بے جان تنکوں کو۔ مگر جونہی ہم نے اپنی

ذات پر بھروسا کیا اور ربط ملت قائم رکھنے کے راز کو پایا، ہم نے تاریخ کے تسلسل کا رخ پھیر دیا۔ ہم نے غلامی کا طوق اتار کر حق خود ارادی حاصل کیا، ہم آزاد ہوئے، ہمیں وطن ملا، ریاست ملی۔ مگر آج سے پچاس برس پیشتر کون کہہ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کس قدر درخشاں مستقبل متعین کر رکھا ہے۔

تاریخ کے تسلسل پر قابو رکھنا زندہ قوموں کی پہچان ہے۔ زندہ قومیں ناکامیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہونے کے باوجود اپنی ذات پر یقین قائم رکھتی ہیں اور اپنا ملی شیرازہ کسی حالت میں بھی بکھرنے نہیں دیتیں۔ زندہ قوموں میں اجتماعی خودی کا شعور ان سے تخلیقی عمل سرزد کرواتا ہے اور وہ تاریخ کے تسلسل کو جس سمت چاہیں، پھیرنے لگتی ہیں یہاں تک کہ تاریخ ان کی دست نگر ہو کے رہ جاتی ہے یا ان کے ہاتھوں سے تاریخ کی تخلیق ہوتی ہے۔ مگر جونہی کسی قوم کا اپنی ذات پر سے یقین متزلزل ہونے لگے یا اس کا شیرازہ منتشر ہونے لگے، تاریخ ایک بیرونی حقیقت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ملت کے تخلیقی اعمال کو تاریخی حادثوں کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ہم میں سے بعض پاکستان کو بھی اب محض ایک تاریخی حادثہ سمجھنے لگے ہیں اور انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ پاکستان ہندی اسلام کے تخلیقی عمل کا کرشمہ ہے۔ پاکستان کا معرض وجود میں آنا اس امر کی دلیل ہے کہ مسلمانان پاکستان اگر اپنی ذات پر یقین رکھیں اور ربط ملت قائم رکھیں تو وہ تاریخ کو اپنا دست نگر بنا سکتے ہیں یا تاریخ کی تخلیق کے اہل ہو سکتے ہیں۔

ہمارے بزرگ اگر ناامیدی اور مایوسی کے دور سے گزرے تو وہ ایک لحاظ سے حق بجانب تھے کیونکہ ان کے ہاتھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن اس لاچاری اور بے بسی کے عالم میں بھی انہوں نے ہمارے لئے لائحہ عمل تجویز کیا اور ہمیں آزادی کی راہ پر گامزن کیا۔ اب جبکہ ہمیں آزادی کی نعمت میسر ہے، ہمارے ہاتھوں میں سب کچھ ہے تو ناامید یا مایوس بن بیٹھنا یا اپنے آپ کو بے بس اور لاچار تصور کرنا پرلے درجے کی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ ناامیدی اور مایوسی کا دور جس میں سے ملت پاکستان اس وقت گزر رہی ہے، محض ایک عارضی تھکن ہے جو کسی بھی اجتماعی جذباتی ہیجان کے بعد محسوس کی جا سکتی ہے اور دیرپا نہیں ہوتی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے لئے تگ و دو کے دوران میں ہم میں سے ہر ایک نے حقیقت کو اپنے ذاتی تخیل سے کچھ ایسا خلط ملط کیا کہ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو ہر کسی نے اپنی بساط کے مطابق اسے اپنے خوابوں کی دنیا سمجھا۔ مگر

جب خواب اور حقیقت میں امتیاز نہ ہو سکا تو اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھ گیا اور ناامید اور مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔

تخلیق کو سیاسی حقیقت کے قالب میں یقیناً ڈھالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے وقت درکار ہے، صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ قومیں پلک جھپکنے میں پیدا تو کی جا سکتی ہیں مگر انہیں سن بلوغ تک پہنچنے کے لئے سینکڑوں برس لگ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں پاکستان میں اپنی زندگی ہی میں وہ تمام اصلاحات نافذ دیکھنا چاہتا ہوں جو اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں تو اس کی خواہش اگرچہ نیک نیتی پر مبنی کیوں نہ ہو، جس جذبے نے اس کے دل میں یہ تمنا پیدا کی ہے، اس میں خود غرضی کی رمق موجود ہے کیونکہ اس نے ملت کی اجتماعی زندگی کو اپنی انفرادی زندگی کی قلیل مدت تک محدود کر لیا ہے اور وہ آنے والی نسلوں کے لئے کچھ بھی باقی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ہمارا فرض ہے کہ ملی اصلاح کے لئے جو کچھ بھی ہم سے بن پڑے کریں، اور جو باقی رہ جائے اسے آئندہ نسل کے سپرد کر جائیں۔

اس ناامیدی اور مایوسی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد، خاص طور پر قائداعظم کی وفات کے بعد، ہمیں جو بھی سیاست دان میسر آئے وہ ہماری توقعات سے کم نکلے۔ یہ ملت پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ وہ قائداعظم کی شخصیت سے دس درجہ کم شخصیتیں پیدا کرنے کی اہل بھی نہ ہو سکی۔ جہاں ایک قائداعظم کا تنہا ذہن اس ملک کے مسائل کا حل سوچتا تھا، وہاں ان کی وفات کے بعد بیس یا تیس شخصیتوں کے ذہن باہم مل کر بھی ہمارے مسائل کا حل سوچنے میں ناکام رہے۔ بہرحال، سیاسی قیادت کی اس نااہلی کے باوجود پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور گو ارتقا کی رفتار سست سہی، صنعتی اور چند ایک دوسرے حلقوں میں تسلی بخش ترقی کی گئی ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ جیسی قوم ہو ویسے ہی سیاست دان اسے نصیب ہوتے ہیں، لیکن غور طلب بات تو یہ ہے کہ کیا اس ملک کے سیاست دان ہمارے حقیقی نمائندے ہیں۔ پاکستان کا آئین جمہوری اصولوں پر استوار کیا گیا ہے اور اس ملک کے نمائندے وہی کہلا سکتے ہیں جنہیں ہم نے خود منتخب کیا ہو۔ مگر جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے، یہاں ایک مرتبہ بھی عام انتخابات نہیں ہوئے، اس لئے موجودہ سیاست دانوں میں سے کوئی بھی ہمارا نمائندہ نہیں ---- بلکہ ان سیاست دانوں میں سے وہ جو برسر اقتدار رہ چکنے کے بعد اب اس کوشش میں ہیں کہ دوبارہ برسر اقتدار آئیں، چند گنے چنے، دیکھے بھالے اور جانے پہچانے لوگ ہیں۔ ہم ان میں سے اکثر کو آزما چکے ہیں۔ وہ ہمارا اعتماد کھو چکے ہیں۔ ان کے

اور ہمارے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے۔ وہ ہم سے بے پروا ہیں اور ہم ان سے بے پروا ہیں۔ جب کسی جمہوریہ میں عوام کے نمائندوں کا عوام سے ربط ختم ہو جائے تو اس کا انجام دونوں کے لئے المناک ہوتا ہے۔

میں اگر اس مرحلے پر یہ بیان کروں کہ حضرت علامہ ایک سیاست دان میں کن خصوصیتوں کا موجود ہونا پسند کرتے تھے یا ان کی نگاہ میں ملت کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کن اصولوں پر استوار ہونی چاہئے، تو آپ کا وقت ضائع کروں گا۔ علامہ نے اس سلسلے میں اپنے نظریے کی وضاحت کے لئے جو جو اصطلاحیں استعمال کیں، ہم اور غالباً ہمارے سیاست دان ان کے لغوی معنوں سے بخوبی آشنا ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم میں سے کسی کو بھی ان پر عمل کرنے کی توفیق نہیں۔ بہرحال، اب فلسفیانہ طبع آزمائی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مثالی یا تخیلی موضوعات پر بحث بے کار ہے۔ گردش حالات نے ہمیں جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے، وہاں سے صرف فوری عمل ہی ہماری نجات کا موجب ہو سکتا ہے۔ ہمیں ایک بار پھر اپنی ذات پر اعتماد قائم کرنا ہو گا، اس ناامیدی اور مایوسی کے دور سے نکلنا ہو گا، اور ہر لحظہ اجتماعی زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھنے کی عادت ترک کرنی ہو گی!

پاکستان کے داخلی اور خارجی مسائل کا حل اس میں ہے کہ عام انتخابات جلد عمل میں لائے جائیں تاکہ ہم اپنی دانست کے مطابق ایسے نمائندے منتخب کر سکیں جو ملت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ عین ممکن ہے کہ عام انتخابات جب بھی عمل میں لائے جائیں، جانبدارانہ ہوں یا سیاست دانوں کا جو بھی گروہ برسر اقتدار ہو، اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لا کر صرف اپنے حامیوں کو کامیاب بنوائے، اور اس مقصد کے لئے اگر غیر جمہوری قدم بھی اٹھانے پڑیں، ان سے گریز نہ کرے تو بھی ان ناخوشگوار حالات میں ہمارا فرض ہے کہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ جب ہم نے اپنی مرضی سے اپنی فلاح و بہبود کے لئے جمہوری نظام قبول کیا ہے تو ہمیں اس کی لعنتیں بھی قبول کرنی پڑیں گی۔ جمہوری نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملت جو اسے قبول کرے، سن بلوغ کو پہنچ چکی ہو، اس میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہو اور وہ سیاہ و سفید میں تمیز کر سکنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ ہم ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے نہ ہم میں پورے طور پر سیاسی شعور پیدا ہوا ہے اور نہ ہی ہم سیاہ و سفید میں تمیز کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اس لئے جمہوری نظام کی لعنتوں کو دور کرنے کے لئے ہمیں ابھی مزید مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہمت ہار دیں یا اس امید پر بیٹھ رہیں کہ کوئی مسیحا پیدا ہو گا جو ہمیں

ہمارے نااہل سیاست دانوں سے نجات دلوائے گا۔ دراصل ہماری نجات ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے اور ہم جب چاہیں' ہمارے دور کا آغاز ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں ایک سے زائد سیاسی جماعتوں کا وجود اگرچہ جمہوری اصولوں کے عین مطابق ہے مگر بدقسمتی سے ان کثیر التعداد جماعتوں میں سے ایک بھی ایسی جماعت نہیں جس نے ہمارے مسائل کے حل کی کوئی واضح صورت پیش کی ہو۔ ملت پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ اقتصادی مسئلہ ہے جس کے حل کی عدم موجودگی نے پاکستان میں ہر طرف سیاسی بے اطمینانی پھیلا رکھی ہے' اور اسی سیاسی بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر چند سیاسی جماعتیں پاکستان کے استحکام کو زک پہنچانے کے درپے ہیں یا صوبائی تعصب پھیلا کر خاص طور پر مغربی پاکستان کی وحدت کو تہ و بالا کرنے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ پاکستان کی جدید سیاست میں اس قسم کے منفی رجحانات کا قلع قمع تبھی ہو سکتا ہے جب ملک کے اقتصادی مسئلے کا کوئی مناسب حل پیش کیا جائے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد برصغیر ہند کے مسلمانوں کے اقتصادی مسئلے کو مختلف طریقوں سے سلجھانے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ اس ہنگامے کے بعد مسلمانوں کے متوسط اور نچلے طبقے پر جو گزری' اس کی تفصیل میں جانا تو غیر ضروری ہے البتہ اس ہنگامے نے مسلمانوں کے صاحب ثروت طبقے کا خاتمہ کر دیا۔ سرسید مسلمانوں کے صاحب ثروت طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے غیر ملکی حاکموں کے ساتھ صلح کن رویہ اختیار کیا اور اپنے طبقے کی بحالی کے لئے کوشاں رہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد غیر ملکی حاکموں کی خدمات کے صلے میں مسلمان خاندانوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا ہوئیں۔ اور یوں مسلمانوں کا جدید صاحب ثروت طبقہ وجود میں آیا۔ سرسید اس طبقے کی بحالی پر خوش تھے کیونکہ ان کی نگاہ میں کسی بھی قوم کی عزت اور توقیر کا انحصار اس قوم میں امراء و رؤسا کی موجودگی پر ہے۔ اور جب کبھی کوئی قوم اپنے صاحب ثروت طبقے سے محروم کر دی جائے تو وہ ذلیل و خوار ہوتی ہے۔ سرسید کا یہ نظریہ درست تھا یا غلط' اس پر تبصرے کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہنگامے کے کچھ عرصہ بعد جب ہندوؤں کے منظم متوسط طبقے نے نیابتی حکومت پر اصرار شروع کیا تو سرسید کو مجبوراً مسلمانوں کے متوسط اور نچلے طبقے کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی پڑی۔ اور جب ان کی بدحالی کی تاب نہ لا سکے تو مسلمانوں کو ہندوؤں کی اقتصادی برتری کا خوف دلا کر انہیں سیاسیات ہند میں حصہ لینے سے منع کر دیا۔

مسلمانان ہند میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے ذمہ دار دراصل مولانا شبلی اور ان کے حامی

تھے جو مسلمانوں کے تعلیم یافتہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا شبلی نے مسلمانوں کے متوسط اور نچلے طبقے، خاص طور پر مسلمان زراعت کاروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شمال مغربی ہند کے جاگیردار ان علاقوں کے مسلمانوں کی سیاسی اور اقتصادی ترقی میں حائل ہوئے۔ سابق پنجاب میں علامہ اقبال نے مولانا شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جاگیرداروں کے خلاف ساری عمر جہاد جاری رکھا۔ علامہ نے بڑی کوشش کی کہ ایسی اصلاحات نافذ کر دی جائیں جن سے مسلمان زراعت کاروں کی حالت سنور سکے اور ان میں سیاسی شعور پیدا ہو سکے، لیکن جاگیرداروں نے ان کی پیش نہ چلنے دی۔

اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل علامہ نے قائداعظم پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اگر مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل نہ کیا گیا تو شمال مغربی ہند میں کسی بھی مسلم سیاسی جماعت کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ علامہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی حصول پاکستان کے لئے تگ و دو شروع ہوئی۔ اس تگ و دو کے دوران میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جاگیرداری نظام کا طلسم ٹوٹ گیا ہے۔ ہر خاص و عام کو یقین تھا کہ پاکستان کا معرض وجود میں آنا ہی اقتصادی مسئلے کا حل ہے ---- مگر یہ ان ایام کی بات ہے جب ہم میں سے ہر ایک نے حقیقت کو خوابوں سے خلط ملط کر رکھا تھا۔ جونہی پاکستان معرض وجود میں آیا اور ہم حقیقت کو خواب سے الگ دیکھنے کے قابل ہوئے، ہمیں احساس ہوا کہ وہی پرانا جاگیردار طبقہ نئے لبادے میں ہم پر مسلط ہو گیا ہے۔

ان چند برسوں میں جہاں ہم نے صنعتی ترقی کی ہے، وہاں ہم نے ایک نیا صاحب ثروت طبقہ بھی پیدا کیا ہے۔ یہ طبقہ کارخانہ داروں اور مل مالکان کا ہے۔ اگرچہ اس طبقے میں سے اکثر کی بنیادیں چور بازاری اور اشیاء کی ناجائز درآمد پر استوار ہیں، پھر بھی اسے آج حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس طبقے نے ملکی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہماری اجتماعی زندگی میں چند نئی مشکلات کا اضافہ ہو گیا ہے۔

ہمارے سیاسی قائدین جو اسلام کا دم بھرتے ہیں اور حب وطن کے نشے سے سرشار ہیں، انہیں غور کرنا چاہئے کہ اسلام ایسی سرمایہ داری کی اجازت ہرگز نہیں دیتا جہاں پیداکار سرمائے سے محروم رہیں۔ خوراک، لباس، تعلیم اور طبی امداد کا حق ہر خاص و عام کو حاصل ہے۔ مگر ہم میں سے بیشتر کو دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا، اپنا یا اپنی اولاد کا تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا میسر نہیں آتا، سر چھپانے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ جس ملک میں غربت و افلاس کا یہ عالم ہو، وہاں کے سیاست دانوں میں تکبر یا غرور کا مظاہرہ بے شرمی اور بے غیرتی کا

آئینہ دار سمجھا جائے گا۔ لیکن ہمارے سیاست دانوں کے نزدیک شاید ان اصطلاحوں کے کوئی معنی نہیں۔

ہمارے موجودہ سیاست دان ذاتی مفادات' ایک دوسرے سے حسد اور بے اعتمادی میں کچھ ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کی لغت میں سیاست سے مراد محض سازش' عیاری یا جعلسازی ہے جس سے اپنے حریف کو کرسی اقتدار سے گرانا یا نیچا دکھانا مقصود ہے۔ اس کش مکش میں انہیں اتنی فرصت نہیں کہ وہ ملت پاکستان کے مسائل کی طرف توجہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں ایک بھی ایسی سیاسی جماعت نہیں جس کا کوئی اصول یا کوئی واضح نصب العین ہو۔ ایک طرف تو وہ سیاسی قائد ہیں جو برسر اقتدار ہیں' اور دوسری طرف وہ سیاسی قائد ہیں جو برسر اقتدار رہ چکنے کے بعد اب دوبارہ برسر اقتدار آنے کی فکر میں ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان پاکستان کے عوام اس مسلسل کش مکش کو ناامید' مایوس' بے بس اور لاچار تماشائیوں کی طرح کھڑے دیکھ رہے ہیں۔

ہمیں اپنا اقتصادی مسئلہ سلجھانے کے لئے جاگیرداری نظام میں تغیر کی کوئی صورت اختیار کرنی پڑے گی اور مروجہ صنعتی نظام میں بھی مناسب تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ جب تک ہمارے سیاستدان خلوص دل سے ملت کے اقتصادی مسئلے کا حل پیش نہ کریں گے' یہ بے یقینی' بے اعتمادی' بے اطمینانی اور بے چینی کا دور ختم نہ ہو گا بلکہ کوئی عجب نہیں کہ اس مسئلے کے حل میں تاخیر آخرکار ہم سب کی تباہی و بربادی کا موجب بنے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں' اس میں وہشت پسند تحریکوں کا وجود میں آنا ایک لازمی امر ہے۔ اس قسم کی تحریکوں کا تختہ ء مشق ابتدا میں عموماً سیاسی قائد بنا کرتے ہیں' لیکن جب نظم و نسق معطل ہو جاتے ہیں تو کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔ انجام کار یا تو کسی نہ کسی طرز کی آمریت ملک پر مسلط ہوتی ہے اور شخصی آزادی کا خاتمہ کر دیتی ہے یا کوئی غیر ملکی طاقت ملک پر قبضہ جما لیتی ہے۔

پس' پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ عام انتخابات سے پیشتر ملک کے اقتصادی مسئلے کو سلجھانے کے سلسلے میں کوئی واضح منصوبہ عوام کے سامنے رکھیں' اور ہمارا یہ فرض ہے کہ عام انتخابات میں اپنے تدبر سے ایسے بے غرض' درد مند' مخلص اور ایماندار نمائندے منتخب کریں جنہیں خداوند تعالیٰ نے اپنی ذات' احباب یا برادریوں سے بلند ہو کر ملت کی خدمت کرنے کی توفیق عطا کر رکھی ہو۔ پاکستان کے دفاع کے لئے فوجوں کا سامان جنگ سے لیس ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اقتصادی اطمینان اور سیاسی استحکام

بھی ضروری ہے۔

ملت پاکستان کا دوسرا اہم مسئلہ ان امور سے متعلق ہے جن کے تصفیے پر پاکستان کی بقا کا انحصار ہے۔ ان امور میں سے کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ کس نے پیدا کیا' کیوں پیدا کیا گیا اور اب تک کن مراحل سے گزر چکا ہے' اس کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے البتہ گزشتہ چند سالوں میں ہمارے تجربات نے ہم پر اس حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ اس مسئلے میں ہمارے بہی خواہوں یعنی برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا رویہ ہمارے ساتھ ہمدردی کا نہیں بلکہ لا تعلقی کا رہا ہے۔ اسی بناء پر ہمیں رفتہ رفتہ یقین ہو گیا ہے کہ جو توقعات ہم ان سے وابستہ کیے بیٹھے تھے' وہ ان پر پورے نہیں اترے۔ اقوام متحدہ تک نے اس مسئلے کا مناسب حل پیش کرنے کی بجائے اسے لٹکائے رکھنا بہتر سمجھا ہے۔ اگر ہمارے بہی خواہوں یا اقوام متحدہ کو یہ خیال ہے کہ کشمیر کے مسئلے کے فوری حل کے لئے جوش و خروش کا اظہار محض پاکستانی عوام کے جذبات کا ابال ہے جو کچھ عرصہ گزرنے پر خود بخود ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ہم اس مسئلے کو فراموش کر دیں گے تو وہ غلطی پر ہیں۔ جس زمانے میں علامہ اقبال نے مسلمانان کشمیر کے حقوق کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی' اس وقت ممکن ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا تعلق ہمارے جذبات سے ہو' لیکن اب چونکہ اس مسئلے کا تعلق ہماری ملی بقا سے ہے' اس لئے ہم اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

ان حالات کے پیش نظر پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ عام انتخابات سے پیشتر اپنے جزوی اختلافات سے بلند ہو کر اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے وقت کا تعین کریں یا ہمارے ساتھ عہد کریں کہ ایک متعین عرصے تک خواہ اس کے حصول کے لئے ملت کو کیسی ہی کٹھن راہ اختیار کرنی پڑے' مسلمانان کشمیر کو آزاد کرا لیا جائے گا۔ اور ہمارا یہ فرض ہے کہ عام انتخابات میں ایسے جرأت مند اور دلیر نمائندے منتخب کریں جو بیانات دینے پر یا صرف تجاویز پیش کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ عملی طور پر بھی کچھ کر کے دکھائیں۔ کیا ہمارے سیاسی قائدین کو یہ معلوم نہیں کہ مسلم عوام عمل پر لبیک کہنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے؟

ملت پاکستان کا تیسرا اہم مسئلہ عالم اسلام کے اتحاد سے متعلق ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ پاکستان کے تخیل کی بنیاد 'اتحاد اسلامی' اور "اسلامی وطنیت" کے نظریوں پر رکھی گئی۔ بظاہر یہ نظریے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن حقیقت میں خاص طور پر اس انداز

سے جس میں انہیں علامہ اقبال نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا' ان نظریوں میں اختلاف ہے نہ تضاد' بلکہ ان میں ایسی مطابقت ہے جو نگاہوں کے سامنے ایک ہی تصور قائم کرتی ہے۔

عموماً کہا جاتا ہے کہ "اتحاد اسلامی" سے وہ تحریک مراد ہے جس کی داغ بیل پہلی جنگ عظیم سے قبل' جمال الدین افغانی نے ڈالی اور جس کا مقصد مسلمانان عالم کو خلافت عثمانیہ کے ماتحت لانا تھا' اور "اسلامی وطنیت" سے مراد وہ تحریک ہے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد "وطنیت" کے مغربی تصور کی مقبولیت کی وجہ سے مشرق وسطی میں پھیلی اور جس کے زیر اثر جدید ترکی' جدید ایران' جدید افغانستان وغیرہ منصہ ء شہود پر آئے۔ گویا اگر پہلی تحریک کا مقصد دنیائے اسلام کو خلافت عثمانیہ کے جھنڈے تلے متحد کرنا تھا تو دوسری تحریک کا مقصد عالم اسلام کا شیرازہ منتشر کرنا تھا۔ یوں' اسلام کے مغربی نقادوں نے "اسلامی وطنیت" کی تحریک کو "اتحاد اسلامی" کی تحریک کا رد عمل قرار دیا ہے۔

لیکن علامہ اقبال کا نظریہ ان "مستشرقین" کے نظریے سے قطعی مختلف ہے۔ ان کے نزدیک "اتحاد اسلامی" کا جو تصور جمال الدین افغانی نے پیش کیا' اس سے انہیں خلافت عثمانیہ کی آڑ میں سلطنت عثمانیہ کو پھیلانا مقصود نہ تھا بلکہ ان کا مقصد تو رائج الوقت خلافت عثمانیہ کی آئینی قیادت میں ان تمام مسلم ریاستوں کو جو سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھیں اور ان تمام مسلم ریاستوں کو جو سلطنت عثمانیہ سے باہر تھیں' سب کی وفاقیت کو معرض وجود میں لانا تھا۔ دوسرے لفظوں میں جمال الدین افغانی کا مدعا دراصل اسلامی ممالک کے اتحاد کا قیام تھا خواہ وہ کسی بھی سیاسی ہیئت میں ممکن ہو۔ انہوں نے خلافت عثمانیہ کی قیادت میں اسلامی ممالک کی وفاقیت کا نظریہ اس لئے پیش کیا کہ اس زمانے میں اتحاد ممالک اسلامیہ کو وجود میں لانے کی صرف یہی ایک عملی صورت تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد سلطنت عثمانیہ کے بطن سے بہت سی آزاد اور نیم آزاد مسلم ریاستیں پیدا ہوئیں۔ جب مغربی طاقتوں کے مشرق وسطی کے کچھ حصے پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے یا سیاسی دباؤ ڈالنے کی وجہ سے وہاں اسلامی وطنیت کی تحریک پھیلی اور نااہل سلاطین کی مطلق العنانیت کے خلاف مشرق وسطی کے عوام میں جمہوری روح بیدار ہوئی تو ترکوں نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ علامہ نے ترکوں کے اس فیصلے کو درست خیال کیا اور مشرق وسطی کے ممالک میں جمہوری روح کی بیداری یا آئین ساز مجالس کے قیام کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔ اس نئی صورت حال کو مد نظر رکھے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اس وقت ہر آزاد مسلم

ریاست کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہو مگر اس کے ساتھ ہی ان سب ریاستوں کو آپس میں رابطہ و اتحاد قائم کرنے کے لئے تگ و دو کرنی چاہئے تاکہ ان کے تمام اختلافات اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کی روشنی میں حل کیے جا سکیں کیونکہ اسلام ان سب کا مشترک روحانی مطمح نظر ہے۔

علامہ کے نزدیک اسلامی ممالک میں ایسی روحانی فضا موجود ہے جو ان ممالک کو سیاسی طور پر ایک دوسرے کے قریب لا سکتی ہے۔ یہ سیاسی قربت تین مختلف صورتوں میں وجود میں لائی جا سکتی ہے: اول' ایک بین الاقوامی اسلامی ریاست کی صورت میں' دوم جمعیت مسلم اقوام کی صورت میں' اور سوم' متفرق آزاد مسلم ریاستوں کے ایک دوسرے سے سیاسی' اقتصادی یا عسکری معاہدوں میں منسلک ہونے کی صورت میں۔ علامہ کی نگاہ میں ممالک اسلامیہ کا اتحاد' اگر وجود میں آ جائے تو' صرف دو طریقوں سے ٹوٹ سکتا ہے۔ سیاسی نقطۂ نگاہ سے تو یہ اتحاد اس وقت ٹوٹ سکتا ہے جب ایک مسلم ریاست دوسری مسلم ریاست پر حملہ کر دے' اور دینی نقطۂ نگاہ سے یہ اتحاد اس صورت میں ٹوٹ سکتا ہے جب مسلمان فرائض اسلام سے منحرف ہو جائیں۔

جب علامہ نے برصغیر ہند میں ایک آزاد اور خود مختار مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تو اگر وہ چاہتے تو اس ریاست کا کوئی موزوں نام تجویز کر سکتے تھے' لیکن مصلحتاً ایسا نہ کیا۔ علامہ کے سیاسی فلسفے کا یہ ایک پہلو ہے جسے ان کے مغربی نقاد سمجھنے سے قطعی طور پر قاصر رہے ہیں یہاں تک کہ "اسلام میں جدید رجحانات" کے مصنف پروفیسر گب نے صاف صاف کہہ دیا: "مجھے اقبال پر حیرت ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنی ساری عمر "وطنیت" کے نظریے کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھا ہو وہ کیونکر مسلمانان ہند کے لئے ایک الگ ریاست کے قیام پر مصر ہو سکتا ہے۔ کیا الگ ریاست کے لئے اس آرزو کے پس منظر میں وہی جذبۂ وطنیت کار فرما نہیں جس کی مخالفت کرنا اقبال کا شروع ہی سے شعار رہا ہے؟"

جب علامہ نے برصغیر ہند میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کے قیام کا نظریہ پیش کیا تو ان کے ذہن میں 'اسلامی ریاست ہائے متحدہ' کا تصور تھا۔ گویا پاکستان کو وجود میں لانے کا مقصد دراصل اس "اسلامستان" کو وجود میں لانا تھا جس کی اساس انہوں نے اسلام کی بین الاقوامیت کے نظریے پر قائم کر رکھی تھی۔ اسی بناء پر برصغیر ہند میں آزاد اور خود مختار مسلم ریاست کا نام تجویز نہ کیا گیا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ علامہ کی نظموں کے اثر سے مسلمانان ہند میں مشرق وسطیٰ

کے مسلمانوں کے لئے کس قدر جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اگر بلقان میں مسلمانوں کو شکست ہوتی تو اس کا رنج ہمیں ہوتا۔ اگر طرابلس میں مسلمان شہید ہوتے تو کہرام ہمارے گھروں میں مچتا۔ اگر فلسطین میں کوئی مسلمانوں کو ایذا پہنچاتا تو تکلیف ہمیں ہوتی۔ مگر آج ہماری یہ حالت ہے کہ فلسطین میں مسلمانوں کا خون بہا' ہماری نگاہوں کے سامنے یہودی ریاست قائم ہوئی' ہم نے انگلی تک نہ اٹھائی۔ مراکش میں مسلمان فرانسیسی استبداد کے خلاف لڑتے ہوئے کٹ مرے' مگر ہم نے پروا نہ کی۔ اب الجزائر میں فرانسیسیوں نے مسلمانوں پر قہر برپا کر رکھا ہے لیکن ہمارے سیاسی قائدین کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ انہیں معلوم تک نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

بہرحال' میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ علامہ کی نگاہ میں اسلامی ممالک کے اتحاد کو عمل میں لانے کی ایک صورت متفرق آزاد اسلامی ریاستوں کا ایک دوسرے سے سیاسی' اقتصادی و عسکری معاہدوں میں منسلک ہونا ہے۔ اس اتحاد کو عمل میں لانے کے لئے پاکستان کا معاہدۂ بغداد میں شریک ہونا ایک نہایت ہی کامیاب کوشش ہے بشرطیکہ اس معاہدے کی توسیع ممکن ہو۔ اس وقت برطانیہ کے علاوہ پاکستان' ایران' عراق اور ترکی اس معاہدے میں شریک ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں کو چاہئے کہ وہ ان چار ملکوں کو شاہراہوں یا ریل کے ذریعے ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی افغانستان' عرب ممالک اور شمالی افریقہ کے ممالک کو بھی اس معاہدے میں شریک بنانے کے لئے قدم اٹھائیں' اور اگر اس غرض کے لئے ہمیں برطانیہ کو اس معاہدے سے خارج کرنا پڑے تو ایسا کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

معاہدۂ بغداد کی موجودہ ہیئت سے ایک نہایت ہی نازک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے' اور وہ یہ ہے کہ اس معاہدے میں زیادہ تر عجمی قومیں شریک ہیں جس کے برعکس مصر اور شام کے وفاق کی صورت میں عرب قوموں کا اتحاد عمل میں لایا گیا ہے۔ ہمیں محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں ہماری بے توجہی کے باعث دنیائے اسلام دو حصوں یعنی "عجمی اتحاد' اور عربی اتحاد" میں منقسم نہ ہو جائے۔ عرب اور عجم میں امتیاز ایک نہایت ہی خطرناک رجحان ہے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ ماضی میں اس رجحان کے پیدا ہونے سے دنیائے اسلام کو زبردست نقصان پہنچ چکا ہے۔

سائنس ترقی کی منازل طے کرتے کرتے ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جو بے حد خطرناک ہے۔ انسان نے بنی نوع انسان کی تباہی و ہلاکت کے لئے ایسے آلات ایجاد کر لئے

ہیں کہ ہر کوئی لرزہ براندام ہے۔ وہی یورپ جس نے انیسویں صدی کی رومانویت کے زیر اثر دنیا کو "وطنیت" کا تصور دیا تھا' آج اسی تصور سے خوفزدہ و ہراساں ہے۔ یورپی قوموں پر علامہ اقبال کی پیش گوئی کے مطابق اب یہ حقیقت آشکارا ہو چکی ہے کہ نسلی' لسانی اور علاقائی حدود پر انسانیت کی تقسیم صرف تنگ نظری پر مبنی نہیں بلکہ تباہ کن بھی ہے۔ اسی بنا پر وہ ایک دوسرے سے رابطہ و اتحاد قائم کرنے کی فکر میں ہیں' اور اس غرض کے لئے اس مسیحیت کا احیاء عمل میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں جسے چند صدیاں گزریں' انہوں نے خود اپنی زندگیوں سے خارج کیا تھا۔

جس دور میں سے دنیا گزر رہی ہے' اس میں کسی بھی ملک کے لئے دوسرے سے الگ' بے نیاز یا بے تعلق رہنا مشکل ہے۔ سیارۂ ارض مشرقی اور مغربی بلاکوں میں بٹ چکا ہے۔ لیکن دنیائے اسلام کا جغرافیائی محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ اگر تمام اسلامی ملکوں کا اتحاد عمل میں لایا جا سکے تو اسلام ایک ایسی اہم سیاسی قوت بن سکتا ہے جس سے دوستی اور تعاون کے لئے مشرقی اور مغربی دونوں بلاک بے قرار ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں مسلمانان عالم صرف ممالک اسلامیہ کے اتحاد اور استحکام ہی سے حقیقی معنوں میں سیاسی اور اقتصادی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں متحد اسلام' غیر مسلم دنیا کے بارے میں جو بھی رویہ اختیار کرنا چاہے' کر سکتا ہے خواہ وہ مشرقی بلاک میں شامل ہو خواہ مغربی بلاک میں' اور خواہ غیر جانب دار رہے۔

جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال پر یہ حقیقت واضح تھی کہ "وطنیت" کے اصولوں پر یا ایک دوسرے سے علیحدگی' بے نیازی اور بے تکلفی کے اصولوں پر کوئی بھی اسلامی ملک صحیح معنوں میں آزاد نہیں کہلا سکتا۔ انہیں یقین تھا کہ ہر اسلامی ملک کی حیات و بقا کا انحصار دنیائے اسلام کی حیات و بقا پر ہے۔ اسی وجہ سے انہیں 'اتحاد اسلامی' اور 'اسلامی وطنیت' کی تحریکوں میں تضاد کی بجائے مماثلت دکھائی دی۔ پس' ہماری سیاسی جماعتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ عام انتخابات سے پیشتر معاہدۂ بغداد کی توسیع یا کسی دوسری شکل میں اسلامی ممالک کے اتحاد کو عمل میں لانے کے لئے کوئی جامع منصوبہ پیش کریں۔ اور ہمارا یہ فرض ہے کہ عام انتخابات میں اپنی عقل و ذہانت کو استعمال میں لا کر ایسے بالغ نظر اور دور اندیش نمائندے منتخب کریں جو اسلام کے استحکام کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو بھی تیار رہیں۔

پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کو فکر اقبال کے اصولوں پر ڈھالنے کے لئے کسی بنیادی

انقلاب کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم غیر ارادی طور پر اسی منزل کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں جس کا خواب علامہ نے اپنی زندگی میں دیکھا تھا البتہ ہمیں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ علامہ کے فلسفۂ حیات میں ناامید و مایوس شخصیت کے لئے زندہ رہنے کا قطعی کوئی حق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی منفی خصوصیات کی حامل صرف غلام یا مردہ شخصیتیں ہو سکتی ہیں۔ پس ہم میں سے ہر کوئی جو اپنی ذات پر اعتماد قائم رکھتا ہے، ملت کی اجتماعی زندگی کو اپنے تخلیقی یا تعمیری عمل سے تقویت بخشتا ہے اور پاکستان کے مستقبل سے ناامید و مایوس نہیں، اگرچہ اس نے اقبال کا نام بھی نہ سنا ہو، وہ تعلیمات اقبال کی حقیقی روح سے پورے طور پر آگاہ و باخبر ہے۔

اقبال، پاکستانی قوم پرستی، اور بین الاقوامی اسلام ☆

علامہ اقبال کے تخیل کو پوری طرح سمجھنے کے لئے جس طرح اسلامی اور یورپی فلسفیانہ روایات سے واقفیت لازم ہے، اسی طرح اس سیاسی ماحول سے شناسائی بھی ضروری ہے جس میں ان کے ذہن کی نشوونما ہوئی۔

علامہ کا سیاسی ماحول کیا تھا؟ اپنے فکر کی پختگی کے حصول تک وہ کن کن نظریاتی مراحل سے گزرے؟ انہوں نے "قوم پرستی" کے مغربی تصور کو کیوں ٹھکرا دیا؟ "قوم پرستی" کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ کیا تھا؟ اپنے اس نظریے کو انہوں نے "بین الاقوامی اسلام" کے تصور کے ساتھ کیسے منطبق کیا؟ آج وہ اگر زندہ ہوتے تو "پاکستانی قوم پرستی" کے تصور کے متعلق ان کی رائے کیا ہوتی؟ یہ چند سوال ہیں جن پر غور کرنا اس نسل کے پاکستانیوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ علامہ نے "قوم پرستی" اور "وطن پرستی" کے تصورات کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا تھا۔ علامہ کے متعلق یہ غلط فہمی غالباً ۱۹۳۸ء کے اوائل میں پیدا ہوئی جب انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی کے نظریے "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے خلاف آواز اٹھائی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ "قوم پرستی" اور "وطن پرستی" کی ایک مخصوص تاویل کے خلاف تھے، لیکن یہ کہنا کہ ان تصورات کو ان کے سیاسی فکر میں کوئی مقام حاصل نہیں، قطعی غلط ہے۔

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۶۱ء لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

علامہ نے اپنے سیاسی فکر کی اساس ہمیشہ کسی نہ کسی روحانی نظریے پر قائم کی' مثلاً ابتدائی دور میں جب آپ تصوف یا فلسفہء "ہمہ اوست" سے متاثر تھے تو "ہندی قوم پرستی اور وطن پرستی" کی حمایت میں نظمیں کہیں۔ اس زمانے میں ہر پڑھے لکھے حساس نوجوان کا ذہن "قوم پرستی" کے مغربی تصور سے اثر قبول کر رہا تھا۔ انگریز برصغیر ہند پر مسلط تھے اور گو علامہ کو کبھی کبھار یہ احساس ہوتا تھا (اور اس کا ثبوت ان کی ابتدائی تحریروں میں موجود ہے) کہ آزادی اور خود مختاری کے حصول کے لئے مسلمانان ہند کو صرف انگریزوں ہی سے نہیں بلکہ کسی نہ کسی مرحلے پر ہندو اکثریت سے بھی نبرد آزما ہونا پڑے گا' آپ حب وطن' کے جذبے سے سرشار وقت کی رو میں بہ گئے۔

یورپ میں قیام کے دوران میں ان کے نظریات میں تغیر آیا اور وہ "قوم پرستی" کے تنگ اور محدود تصور سے ذہنی آزادی حاصل کر کے انسان دوستی یا 'ہیومنزم' کے اصولوں پر اپنے لئے ایک نئی راہ تلاش کر چکے تھے۔

علامہ نے یورپ میں "قوم پرستی" کے جذبے کو برسر عمل دیکھا اور انہیں احساس ہوا کہ یہ اصول زندگی اخلاق عالیہ اور انسان دوستی کے اصولوں کے برعکس ہے۔ انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھاتا ہے' انسان کو خود غرض بناتا ہے اور اس میں ملک گیری اور استحصال کی حرص پیدا کرتا ہے۔ قوم پرستی اور وطن پرستی کا جو تصور یورپی لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر حاوی تھا' اس کا نتیجہ یورپی قوموں کے آپس میں حسد' جنگ و جدل اور قتل و غارت کی صورت میں رونما ہوتا رہا ہے۔

قیام یورپ کے دوران میں علامہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک طرف تو یورپ کی نو آبادیاتی طاقتیں ملک گیری کی حرص کو پورا کرنے کے لئے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک پر قابض ہونے کے منصوبے بنا رہی ہیں' دوسری طرف برصغیر ہند میں "لادین قوم پرستی" کے منافقانہ نعرے کی آڑ میں ہندو اکثریت روز بروز زیادہ سے زیادہ سیاسی قوت حاصل کرتی چلی جا رہی ہے۔ ان حالات میں علامہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانان عالم کی بقا کے لئے ان کا آپس میں اتحاد نہایت ضروری ہے' اور صرف یہ اتحاد ہی ان کے تمام دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔

سو' علامہ اپنی زندگی کے اس دور میں جمال الدین افغانی کے نظریہء "اتحاد اسلام" سے متاثر ہوئے۔ جمال الدین افغانی کا "اتحاد اسلام" کا تصور اپنے اندر "قوم پرستی" کے جراثیم بھی رکھتا تھا۔ پچھلی جنگ عظیم کے بعد جب مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں "قوم پرستی" کے جذبے کا فروغ ہوا اور وطن پرست اپنے اپنے ملک کی سیاسی آزادی کے حصول کے لئے

تگ و دو کرنے لگے تو علامہ نے بھی اپنے سیاسی تصور میں مسلم بین الاقوامی حقائق کی روشنی میں مناسب ترامیم کر لیں۔

بین الاقوامی اسلام' کا جو مسلک انہوں نے گزشتہ چند سالوں میں قبول کیا تھا' اس میں تو کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی لیکن ترکی میں خلافت کے خاتمے اور مشرق وسطیٰ میں 'قوم پرستی' کے جذبے کے فروغ کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے تحریر کیا کہ مسلم قوموں کو چاہیے کہ فی الحال اپنی تمام تر توجہ صرف اپنی اپنی انفرادی ذات تک محدود رکھیں' اپنے آپ کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مستحکم کریں' اور جب انفرادی طور پر یہ استحکام حاصل ہو جائے تو سب مسلم ممالک مل کر جمہوریتوں کے ایک زندہ خاندان کی طرح متحد ہو جائیں۔ علامہ کے نزدیک اسلام نہ تو 'قوم پرستی' کے جذبے پر قائم ہے نہ 'ملک گیری' کے جذبے پر ------ بلکہ اسلام تو مختلف اقوام کی ایک 'دولت مشترکہ' ہے۔

پس' علامہ نے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں تو 'قوم پرستی' اور 'وطن پرستی' کے فروغ کو اسلامی تعلیمات کے برعکس خیال نہ کیا' لیکن برصغیر ہند کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ 'ہندی قوم پرستی' کے اصول کو کسی صورت میں بھی قبول نہ کریں بلکہ 'مسلم قوم پرستی' کے اصول کو شعار زندگی بنائیں۔ یہی وہ مسلک تھا جس پر علامہ اپنی آخری عمر تک قائم رہے۔

برصغیر ہند میں 'مسلم قوم پرستی' کے جذبے کے فروغ نے 'ہندی قوم پرستی' کی تحریک کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ آخر کار ان دو مختلف قسم کی 'قوم پرست' تحریکوں نے اپنا اپنا نصب العین حاصل کر لیا۔ پاکستان کے وجود میں لائے جانے کا باعث 'مسلم قوم پرستی' کا جذبہ تھا۔ گویا پاکستان کے منصہ شہود پر آنے سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قومیں اوطان سے نہیں بنتیں بلکہ اوطان قوموں سے بنتے ہیں۔

علامہ کے سیاسی تصور پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر گب تحریر کرتے ہیں کہ اقبال ایک لمحے تو 'قوم پرستی' کے اصول کو رد کرتے ہیں اور دوسرے لمحے اسی اصول کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہیں' یہ تناقض اور تضاد نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن گب ان مستشرقین میں سے ہیں' جن کا بدقسمتی سے علامہ اور برصغیر ہند کے سیاسی حقائق کے متعلق مطالعہ نہایت محدود ہے۔

علامہ 'قوم پرستی' کے مغربی تصور کے خلاف تھے کیونکہ ان کی نگاہ میں یہ تصور اسلام کی روح کے برعکس تھا۔ آپ نے تحریر کیا کہ میں 'قوم پرستی' کے اس اصول کا مخالف ہوں جو یورپ میں رائج ہے' اس لئے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں نشوونما پانے کا موقع دیا

جائے تو اس سے مسلمانان ہند کو کم مادی فوائد پہنچنے کا امکان ہے بلکہ اس لئے کہ مجھے اس اصول میں لادین مادہ پرستی کے جراثیم دکھائی دیتے ہیں جو میرے نزدیک جدید انسانیت کی بقا کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔

علامہ نے تحریر کیا کہ مذاہب کی تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں مذہب 'قومی' ہوا کرتا تھا' مثلاً قدیم یونانیوں' مصریوں اور ہندوؤں کے مذاہب قومی تھے۔ بعد میں مذہب 'نسل' سے متعلق تصور کیا گیا جیسا کہ یہودیوں کا مذہب ہے۔ عیسائیت نے یہ تعلیم دی کہ مذہب انسان کا ذاتی اور نجی معاملہ ہے۔ عیسائیت کا ظہور ایک معاشرے کی صورت میں نہیں بلکہ اس نجس و ناپاک دنیا میں ایک خانقاہی سلسلے کی صورت میں ہوا۔ ابتدائی عیسائیوں نے دنیاوی معاملات میں رومن حکومت کی اطاعت قبول کی' لیکن جب رومن سلطنت عیسائی مذہب اختیار کر چکی تو ریاست اور کلیسا کے درمیان اختیارات کی حدود کے مسئلے پر کش مکش شروع ہو گئی جو صدیوں تک جاری رہی۔ مارٹن لوتھر کی تحریک (جو درحقیقت روایتی کلیسا کے خلاف تھی) کے نتائج دور رس ثابت ہوئے۔ یورپ میں کلیسا (یا مذہب) ایک ذاتی یا نجی معاملے کے طور پر ریاست سے منقطع کر دیا گیا اور ریاست کی بنیاد نسل' زبان اور علاقے کے اصولوں پر رکھی گئی۔ رفتہ رفتہ یورپ میں یہ تصور مقبول ہو گیا کہ چونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے' اس لئے انسانی اتحاد صرف نسلی' لسانی اور علاقائی اصولوں پر ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ مذہب اور ریاست کی ایک دوسرے سے لاتعلقی نے پہلے تو مذہب کو یورپی ریاستوں کی زندگی سے خارج کیا' پھر یورپ کو متفرق قوموں میں بانٹ دیا جو اپنی اپنی ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے لگیں۔

علامہ نے فرمایا کہ اسلام نے یہ حقیقت واضح کی کہ مسلمانوں کا دین نہ تو 'قومی' ہے نہ 'نسلی'، نہ 'ذاتی' ہے نہ 'نجی' بلکہ خالصتاً "انسانی" ہے۔ عیسائیت کے برعکس' اسلام ابتدا ہی سے ایک معاشرہ وجود میں لایا۔ یہ معاشرہ دینی اور دنیاوی معاملات میں ان قوانین کا پابند تھا جو قرآن مجید میں نازل ہو چکے تھے۔ پس' اسلام کے نزدیک 'مذہب و ریاست' 'دین و دنیا' یا روح و مادہ میں دوئی نہیں ہے۔ اسلام کا دینی اور معاشری نظام ایک ہے' اس لئے اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ ایک مخصوص انسانی معاشرے میں مساوات' اتحاد اور حریت کے اصولوں کے حصول کے لئے تگ و دو جاری رکھے۔

علامہ نے تحریر کیا کہ یہ کہنا غلط نہیں کہ قومیں اوطان سے وابستہ ہیں یا ہر قوم کا کوئی نہ کوئی وطن ہے۔ ہندی محض اس لئے ہندی کہلاتے ہیں کیونکہ وہ کرۂ ارض کے ایک ایسے

خطے میں آباد ہیں جس کو ہندوستان کہا جاتا ہے۔ خطہ یا علاقہ بحیثیت ایک جغرافیائی تصور کے اسلام سے، اس لئے متصادم نہیں ہوتا کہ ممالک کی حدود بدلتی رہتی ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پیشتر برما کے لوگ ہندی کہلاتے تھے لیکن اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد برمی کہلانے لگے۔ قوم پرستی کا اصول اسی صورت میں اسلام سے متصادم ہوتا ہے جب وہ ایک سیاسی اصول زندگی کی حیثیت سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسلام کسی قوم کی اجتماعی زندگی سے بحیثیت ایک زندہ عنصر خارج کر دیا جائے۔

جہاں تک وطن پرستی یا وطن کی خاطر جان پر کھیلنے کا تعلق ہے، علامہ نے فرمایا کہ اگر 'وطن پرستی' سے مراد محض ایک خطہ ء ارض کے لئے جان دینا ہے جس سے انسان کی روح کو ایک عارضی مناسبت پیدا ہو گئی ہو تو یہ نصب العین قطعی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ لیکن اگر 'وطن پرستی' سے مراد یہ لی جائے کہ انسان اپنے ایمان' اپنی روایات اور اپنے تمدن کے تحفظ کی خاطر جان دینے کے لئے تیار رہے تو اس قسم کی 'وطن پرستی' ہر مسلمان کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔

مسلمان اپنے ملی اتحاد کو ایسے کسی بھی محدود نظریے پر قربان نہیں کر سکتے جو خالصتاً" نسل' لسان اور علاقے کے اصولوں پر مبنی ہو۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی انسانوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے' وہاں ملت یا امت میں شامل ہونے کے لئے کہا گیا ہے: قوم میں شامل ہونے کے لئے نہیں کہا گیا۔ قوم سے مراد ایک ایسا انسانی گروہ ہے جو ایک قبیلے' ایک نسل' ایک لسان اور ایک علاقے سے تعلق رکھتا ہو۔ ایسے انسانی گروہ مختلف صورتوں میں متفرق مقامات پر ظہور پذیر ہو سکتے ہیں ——— مگر ملی جذبہ ایسے لاتعداد قومی گروہوں کو اپنے آپ میں مدغم کر کے انہیں ایک 'ملت' کی شکل دیتا ہے۔ اسلام چونکہ نسل' لسان اور علاقے سے بلند ہو کر انسانوں کو متحد ہونے کی تعلیم دیتا ہے' اس لئے اسلام انسانیت کے لئے اتحاد کا ایک زندہ پیغام ہے۔

علامہ کے نزدیک ترکی' ایران' مصر اور دیگر مسلم ممالک میں 'قوم پرستی' کے جذبے کا فروغ کسی قسم کی مشکلات پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ ان ملکوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے' اور اقلیتیں ایسے لوگوں پر مشتمل ہیں جنہیں اسلام 'اہل کتاب' یا 'مثل اہل کتاب' کا نام دیتا ہے۔ اسلام ان لوگوں سے معاشرتی تعلقات قائم رکھنے کے خلاف نہیں بلکہ ان کی عبادت گاہوں' مذہب اور تمدن کی حفاظت کرنا مسلمانوں کے لئے فرض قرار دیتا ہے۔ البتہ 'قوم پرستی' کا جذبہ مسلمانوں کے لئے ان ممالک میں مشکلات پیدا کرتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں؛

اور جہاں 'قوم پرستی' کا اصول یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی ملی انفرادیت مکمل طور پر ختم کر کے غیر مسلم اکثریت میں مدغم ہو جائیں۔

جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں' وہاں اسلام 'قوم پرستی' کے جذبے کو اپنے آپ میں جذب کر لیتا ہے کیونکہ ایسے ممالک میں اسلام اور 'قوم پرستی' دو مختلف و متضاد اصول نہیں بلکہ عملی طور پر ایک ہی اصول ہے ---- لیکن جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں' وہاں وہ اسلام کو ایک اجتماعی تعمیری قومی قوت کی حیثیت سے بروئے کار لا کر آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں یعنی 'قوم پرستی' کے جذبے کو اپنے آپ میں جذب کر کے یا بجائے خود 'قوم پرستی' کی بنیاد رکھتے ہوئے اسلام میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں بلکہ کامل ہم آہنگی ہے۔

آج علامہ اگر زندہ ہوتے تو 'پاکستانی قوم پرستی' یا 'وطن پرستی' کے جذبے کے فروغ کے متعلق ان کی کیا رائے ہوتی' اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر ہمیں اس بات پر غور کر لینا چاہئے کہ اگر 'پاکستانی قوم پرستی' کے اصول کو 'نیشنل ازم' کے مغربی تصور کی روشنی میں دیکھا جائے یا اگر 'پاکستانی قوم پرستی' کے اصول میں سے اسلام کا عنصر خارج کر کے اسے پرکھا جائے تو ہم کن نتائج پر پہنچیں گے۔

'نیشنل ازم' کے مغربی تصور کی بنیادیں نسل' لسان اور علاقے پر استوار کی گئی ہیں۔ کیا ہم اپنے متعلق یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ پاکستانی قوم نسلی' لسانی اور علاقائی اعتبار سے ایک ہے؟ نہیں ..... نسلی' لسانی اور علاقائی اعتبار سے پاکستان ایک نہیں بلکہ ان اصولوں پر مبنی انسانوں کے کئی گروہ پاکستان میں آباد ہیں۔ کیا ہم ان متفرق گروہوں کو ان کے کہنہ ماضی کی طرف متوجہ کر کے انہیں متحد کر سکتے ہیں؟ مثلاً کیا ہم انہیں یہ کہہ کر اکٹھا کر سکتے ہیں کہ اے منتشر گروہو! تم میں ہڑپہ' منجودڑو اور ٹیکسلا مشترک ہیں' اس لئے ان آثار قدیمہ کی خاطر جو تمہارے بزرگوں نے تعمیر کیے' ایک قوم بن جاؤ۔ ممکن ہے ہم ایسا کر سکتے ہوں لیکن اگر ہمیں ہڑپہ' منجودڑو اور ٹیکسلا کی خاطر ان منتشر گروہوں کو ایک لڑی میں پرونا تھا تو پاکستان کے معرض وجود میں لانے کی ضرورت کیا تھی' یہ منتشر گروہ تو اکھنڈ ہندوستان کے جھنڈے تلے بھی اکٹھے ہو سکتے تھے۔ 'پاکستانی قوم پرستی' کے اصول میں سے اسلام کا عنصر خارج کر کے اسے پرکھیے تو 'پنجابیت' یوپیت' بنگالیت' سندھیت' بلوچیت' پٹھانیت یا کشمیریت باقی رہ جاتی ہو تو رہ جاتی ہو' پاکستان سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔

پس 'پاکستانی قوم پرستی' کے اصول کو شعار زندگی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس

عنصر کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں، اس عنصر کی اہمیت سے ہمیشہ باخبر رہیں جس کی اساس پر ہمارا قومی اتحاد قائم ہے۔ ہم نسلی، لسانی اور علاقائی اعتبار سے ایک نہیں، ہم تو ملی اعتبار سے ایک ہیں۔ پاکستان بحیثیت وطن ہمارے قومی اتحاد کا خالق نہیں بلکہ پاکستان تو ہمارے ملی اتحاد کی تخلیق ہے۔ پاکستان نے پاکستانی قوم کو جنم نہیں دیا بلکہ مسلم قوم نے پاکستان کو پیدا کیا ہے۔ پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی ہے۔ اگر یہ بنیاد کھوکھلی ہو گئی تو ساری کی ساری عمارت ہمارے سروں پر آ رہے گی، اس لئے اگر پاکستانی قوم پرستی، یا وطن پرستی، کے اصول کے پس پشت اسلام کا جذبہ کار فرما ہے تو ہمارا سیاسی مسلک اقبال کا سیاسی مسلک ہے، لیکن اگر ہم پاکستانی قوم پرستی، یا وطن پرستی، کا نعرہ محض اس توقع پر بلند کر رہے ہیں کہ اور کسی طرح نہیں تو کم از کم یوں ممکن ہے کہ اسلام سے فرار کی راہ مل جائے تو یا تو ہم تاریکی میں بھٹک رہے ہیں یا بے حد معصوم ہیں یا قطعی احمق۔

○

اقبال اور پاکستان کے محمود و ایاز☆

پیشتر اس کے کہ حضرت علامہ سے متعلق کسی موضوع کی جانب رجوع کروں، میں آپ کے دلوں میں ایک ایسی شخصیت کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں جو آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ بعض ہستیوں کے اسمائے گرامی اگر ایک سانس میں اکٹھے لیے جائیں تو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اقبال و قائداعظم — قیام پاکستان، خاص طور پر وفات قائداعظم کے بعد اگر کسی شخصیت کا نام اقبال کے نام کے ساتھ وابستہ کیا جا سکتا ہے اور جو کچھ حد تک دل کی ڈھارس بھی بندھاتا ہے تو وہ صرف کیانی مرحوم کا نام ہے۔

پچھلے سال اسی ایوان میں، اسی مقام پر کھڑے ہو کر، شورش کاشمیری نے اس نحیف و نزار مگر بے خوف و خود آگاہ مرد سے تعارف کے سلسلے میں چند الفاظ کہے تھے۔ ممکن ہے آپ کو یاد ہوں۔ شورش نے کہا تھا کہ حضرت علامہ نے جس مہتاب کی آرزو شب تار کی ظلمتیں دور کرنے کے لئے کی تھی، وہ کیانی کے پیکر حریت میں آپ کے روبرو موجود ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے علامہ کا ایک شعر بھی پڑھا تھا۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی!

بعد میں آپ سب نے کیانی کو 'لسان پاکستان' کا لقب دیا۔ ان کی ذات سے آپ کی عقیدت، خلوص اور محبت کا یہ عالم تھا کہ ایوان 'کیانی زندہ باد' کے نعروں سے گونج گونج اٹھتا تھا۔ لسان پاکستان کے ارشادات کیا تھے، علامہ کے اس شعر کی تفسیر تھی۔

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء، لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ !

من حیث القوم یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بے خوف اور دلیر شخصیتیں ہم میں خال خال پیدا ہوتی ہیں۔ یا تو مٹی اتنی زرخیز ثابت نہیں ہوئی جتنی علامہ کو توقع تھی یا اس باغیچے کو مالی لاپروا نصیب ہوئے جنہوں نے اسے نمی سے محروم رکھا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی سمجھ لیجئے' یہ حقیقت ہے کہ کہ ہم 'بندۂ افلاک' قسم کے لوگ تو جتنے چاہیں فراہم کر سکتے ہیں لیکن 'خواجۂ افلاک' ہم میں محض حادثاتی طور پر ہی پیدا ہوتا ہے۔ پس ہر وہ پاکستانی جس کا دل زندہ اور پرسوز ہے' آج اسے اس ایوان میں کیانی کی عدم موجودگی کا احساس ہوگا۔

اس مرتبہ جب خواجہ عبدالرحیم نے حسب معمول مجھ سے یوم اقبال کے لئے مقالہ تحریر کرنے کا مطالبہ کیا تو بے اختیار کیانی کی مرگ ناگہاں کا خیال آگیا۔ یہ مہتاب کچھ دن اور اس شب تیرہ و تار کو روشن رکھ سکتا تھا' آخر ساقی اس قدر بے صبر کیوں واقع ہوا؟ کئی سوال ذہن میں ابھرے . . . نیا سوال تو کوئی نہ تھا' پرانے سوال ہی تھے جو آج ہر درد مند پاکستانی کے ذہن میں ابھرتے ہیں' اور علامہ کے ذہن میں بھی اکثر ابھرا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

قوم کو جس سے شفا ہو' وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو' وہ صبا کون سی ہے
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے' وہ آواز درا کون سی ہے

اگر ہم فکر اقبال کی روشنی میں دیکھیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ پاکستان کا حصول بجائے خود منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد جب منزل کی طرف قدم اٹھانے کا مرحلہ درپیش آیا تو مطلع ابر آلود ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ایسی تاریکی چھائی اور ہماری توقعات کے آفتاب کو ایسا گہن لگا کہ اب تک ایک شعاعِ امید کے لئے ترس رہے ہیں۔

کیا پاکستان کے سیاسی رہنما ملت اسلامیہ کو علامہ کے بتائے ہوئے راستہ پر لے جا رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ کا بتایا ہوا راستہ کیا ہے یا فکر اقبال کی روشنی میں ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہئے' نیز کیا ہمارے قائدین میں اس نصب العین کو سمجھنے اور اپنانے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔

اس مرتبہ چونکہ علامہ اقبال کی پچیسویں برسی منانے کا اہتمام کیا جا رہا ہے، اس لئے خیال تھا کہ یوم اقبال کو نصب العین کی از سر نو وضاحت کے لئے ایک اجتماع کی شکل دی جائے، ملک بھر کی مختلف سیاسی جماعتوں کے ذمہ دار نمائندے مدعو کیے جائیں تاکہ وہ فکر اقبال کی روشنی میں ہمارے نصب العین سے متعلق اپنے افکار پیش فرما سکیں لیکن آپ نے شاید یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہمارے سیاست دانوں میں محض چند ایسی شخصیتیں ہیں جنہوں نے اقبال کو پڑھا اور سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں میں سے بیشتر بوقت ضرورت اقبال کو 'اوڑھ' تو لیتے ہیں لیکن انہیں آج تک اقبال کو 'پہننے' کی توفیق نہیں ہوئی۔ انہیں صرف اتنا علم ہے کہ اقبال ایک ایسے شخص کا نام ہے جس نے ایک خواب دیکھا اور قائداعظم اسے کہتے ہیں جس نے اس خواب کو عملی جامہ پہنایا۔ اس کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ علامہ کے افکار پر مزید کچھ روشنی ڈال سکیں، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا ہمسایہ ملک یعنی بھارت ہم سے کہیں زیادہ خوش نصیب ہے۔ ہندوؤں کی اوپر کی سیاسی قیادت میں ہماری سیاسی قیادت کی طرح صرف صاحب ثروت طبقے کے لوگ یا پیشہ ور سیاست دان ہی شامل نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کے مالک عالم اور فاضل بھی موجود ہیں۔ ہمارے یہاں ماسوا چند گنتی کی شخصیتوں کے سیاست اور علم کا ایک دوسرے سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ پاکستان غالباً دنیا میں واحد ملک ہے جس کے میدان سیاست میں علم و فراست کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم کی وفات کے بعد اس ملک کی سیاسی قیادت نے عملی طور پر ایثار و قربانی، درد مندی و خلوص، ایمانداری و دیانتداری یا علم و فراست کی کوئی بھی قابل تقلید مثال قائم نہیں کی۔ جو بھی بر سر اقتدار آیا، اسے ساون کے اندھے کی طرح سب کچھ ہرا بھرا ہی دکھائی دیا، اور جو بھی اقتدار سے باہر ہوا، اسے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ پڑا۔ یہ ہماری پندرہ سالہ تاریخ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے سیاسی رہنماؤں میں اتنی سوجھ بوجھ، شعور یا ضمیر بھی نہیں کہ چاہے وہ اقتدار میں ہوں یا اقتدار سے باہر، کم از کم حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کے قابل تو ہو سکیں۔ ہمارے سیاسی قائدین میں سے بیشتر کے نزدیک آج تک تو حق و باطل کا معیار کرسی اقتدار ہی رہا ہے۔ انہوں نے قومی نصب العین کے بارے میں اقتدار یا ہوس اقتدار سے آگے سوچنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی۔ جس کے پاس دولت ہے، وہ اقتدار کے حصول کے لئے دیوانہ ہے اور جس کے پاس اقتدار ہے، وہ دولت سمیٹنے کی ہوس

میں اندھا ہو رہا ہے۔ باقی رہے عوام تو ان کی کیفیت ظاہر ہے۔

آرزو اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

علامہ کے نزدیک پاکستان کے حصول کے لئے تگ و دو کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کا موقع مل سکے۔ ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ پاکستان محض اس لئے حاصل کیا جائے تاکہ مسلمان مذہبی یا دینی طور پر آزاد ہو سکیں۔ مذہبی آزادی تو مسلمانوں کو ان کے غیر ملکی حاکموں نے بھی عطا کر رکھی تھی۔ صوم و صلوٰۃ پر تو انگریز کے زمانے میں بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پاکستان حاصل کرنے کا مقصد علامہ کے نزدیک دراصل یہ تھا کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جائے جو اسلام کے زریں اصولوں اخوت، مساوات اور عزت نفس پر مبنی ہو اور جس کے ذریعے معاشی انصاف کا حصول ممکن ہو سکے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ محمود و ایاز صرف مسجد ہی میں ایک صف میں کھڑے نہ ہوں (وہاں تو وہ ازل سے دوش بدوش کھڑے ہوتے چلے آئے ہیں اور ابد تک کھڑے ہوتے رہیں گے) بلکہ معاشی میدان میں بھی ایک صف میں کھڑے ہوں۔

اسلام کے تصور جمہوریت اور معاشی انصاف کے متعلق میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اس تقریر کو ذہن میں لائیے جو انہوں نے خلافت کا عہدہ قبول کرتے وقت کی تھی۔ آپؓ نے فرمایا:

> "اے مسلمانو! تم نے مجھے حکومت کی ذمہ داریاں سونپی ہیں۔ میں تم سب میں سے کسی لحاظ سے برتر و افضل نہیں۔ مجھے ہر قدم پر تمہارے مشورے اور مدد کی ضرورت ہے۔ اگر میرا عمل صحیح ہو تو میری حمایت کرو اور اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو مجھے ٹوکو اور صحیح راہ پر لاؤ۔ کسی حاکم کے سامنے کلمہ ء حق کہنا اصل فرمانبرداری ہے لیکن حق کو چھپانا عین غداری ہے۔ میری نگاہ میں طاقتور اور کمزور ایک جیسے ہیں اور مجھے ان دونوں سے یہی توقع ہے کہ وہ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے۔ میں اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا پابند رہوں تو میری اطاعت کرو، لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی ادائیگی میں کوتاہی برتوں تو مجھے تمہاری اطاعت حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا آخری وقت آن پہنچا تو آپ نے اپنے لواحقین سے ارشاد فرمایا:

"مجھے تین کپڑوں میں دفن کرنا، دو جو میں نے پہن رکھے ہیں، اور تیسرا خرید لینا۔ مردوں سے زیادہ زندوں کو کپڑے کی ضرورت ہے۔"

اسی طرح حضرت عمرؓ کی لاتعداد قابل تقلید مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً ایک مرتبہ جب ان کے دور خلافت میں مدینہ میں قحط پڑا تو آپ نے غلے کے چوروں پر قطع ید کی حد کا اطلاق منسوخ کر دیا اور فرمایا:

"یہ میری ذمہ داری ہے کہ فرد کو اس کی ضرورت کے مطابق اناج فراہم کروں۔ اگر مجھ سے یہ ممکن نہیں ہو سکا تو میں غلے کے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کا حق نہیں رکھتا۔"

یاد رہے یہ وہی حضرت عمرؓ ہیں جنھوں نے ایک جرم کی پاداش میں اپنے بیٹے کی لاش پر دروں کی تعداد پوری کروائی تھی!

علامہ نے اپنے سیاسی اور معاشی فلسفے کی عمارت اسلام کے تصور جمہوریت، معاشی انصاف اور عزت نفس کی بنیادوں پر تعمیر کی تھی لیکن آج تک ہمارے سیاسی رہنماؤں نے خواہ وہ اقتدار میں ہوں یا اقتدار سے باہر، پاکستان میں "عناصر" کا پرانا کھیل ہی کھیلا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اسلام کا نعرہ بلند کرتے رہے ہیں، لیکن یا تو اپنی کرسی محفوظ رکھنے کے لئے یا کرسی کے حصول کے لئے۔ عملی طور پر معاشی میدان میں محمود و ایاز کا ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑا ہونا تو ایک طرف رہا، محمود کی کسی نزدیک کی یا آس پاس کی صف میں بھی ایاز کے کھڑے ہونے کے امکانات پیدا نہیں کئے گئے۔ ایاز کے متعلق ان کا رویہ ہمیشہ یہی رہا۔

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہے کہ پاکستان کے بیشتر سیاسی رہنماؤں نے محض سازش، عیاری یا جعل سازی کو "سیاسیات" کا نام دے رکھا ہے اور اس صفائی سے عوام کی نگاہوں میں دھول جھونکی جاتی ہے کہ آج تک ہم اپنی آنکھیں کھولنے کے قابل نہیں ہو سکے۔

چھ سال ہوئے، قائداعظم کے یوم وفات کی تقریب میں ایک تقریر کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سرمایہ داری نظام کی صورت میں

اس ملک میں ایک یزید پل رہا ہے جس کے باعث اس وقت پاکستان کی کیفیت میدان کربلا کی کیفیت ایسی ہے اور ملت پاکستان کی معصومیت اور مظلومیت امام حسینؓ کی معصومیت اور مظلومیت ایسی ہے۔ اس بات کو کئے چھ برس گزر چکے ہیں، لیکن ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔

آپ چاہے کچھ بھی کہیں، پندو نصیحت کریں یا فریاد کریں، سب بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے نوجوان بے چین ہیں کیونکہ مثبت طریقے پر مستقبل کے متعلق سوچنے کے کوئی وسائل نہیں نہ ہی مستقبل کی قیادت کے منصہ ء شہود پر آنے کے کوئی امکانات پیدا کیے گئے ہیں۔ اب تو یہ نوبت آن پہنچی ہے کہ صرف دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے سیاسی رہنما فکر اقبال کی روشنی میں ہمارے نصب العین کو اپنائیں تاکہ معاشرے کی تشکیل کامل جمہوریت، اخوت، مساوات، عزت نفس اور معاشی انصاف کی قدروں پر استوار کی جا سکے۔ جب تک یہ نہیں ہو گا، پاکستان اقبال سے دور رہے گا اور اقبال پاکستان سے!

○

پاکستان کی نظریاتی اساس اور اسلامی قانون سازی کا اصول☆

(قائداعظم اور علامہ اقبال کی نظر میں)

جب کسی قوم کو مخدوش حالات کا سامنا ہو تو وہ اپنی اجتماعی بقا کی خاطر عموماً اپنی نظریاتی اساس کی طرف رجوع کرتی ہے۔ نظریاتی طور پر پاکستانی مسلمان بھی آج کچھ ایسے ہی ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف تو وہ نسلی' لسانی' علاقائی اور فرقہ وارانہ انتہا پسندی کا شکار ہیں اور دوسری طرف' جارحانہ عزائم کے ساتھ' دشمن پاکستان کی سرحدوں پر دستک دے رہا ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ نظریاتی اساس کو ایک بار پھر دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا اور اسلام ہی پاکستان کی نظریاتی اساس اور شناخت ہے کیونکہ اسلام ہی نے ان میں نسل' لسان اور علاقے کے اشتراک پر قومیت کی بنیاد رکھنے کے بجائے اشتراک ایمان کی بنیاد پر ایک متحد قوم بن جانے کا احساس پیدا کیا اور انہوں نے بحیثیت مسلم قوم پاکستان بطور وطن حاصل کر لیا۔ ظاہر ہے یہاں اسلام' اسلامی اقدار اور اسلامی قوانین پر کسی قسم کا منفی تبصرہ سننا کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا' اور نہ کرے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام پاکستان کی نظریاتی اساس ہے تو اس کی کونسی تعبیر پر پاکستان قائم کیا گیا اور اس کی کونسی تعبیر ہماری اجتماعی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں تو اسلام کی ایسی تعبیریں بھی پیش کی گئیں جو پاکستان کے قیام ہی کے خلاف

☆ ۱۹۹۱ء اگست میں تحریر کیا گیا۔

تھیں۔ مثلاً اس ضمن میں کہا گیا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو ہندوستان میں اسلام نہ رہے گا' اور پاکستان میں مسلمان نہ رہیں گے۔ اسی طرح پاکستان میں بھی اسلام کی مختلف تعبیریں موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ پاکستان جمہوری عمل کے نتیجے میں بنا ہے' لیکن جمہوریت اور اسلام ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ لہٰذا یہ واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ بانیان پاکستان کے نزدیک پاکستان اسلام کی کس تعبیر پر قائم کیا گیا اور اس تعبیر کی روشنی میں ہمیں کون کون سے مقاصد حاصل کرنے ہیں۔

بانیان پاکستان میں تو سرسید احمد خان سے لے کر قائداعظم تک کئی نام لئے جا سکتے ہیں' مگر فی الحال قائداعظم اور علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں نظریاتی اساس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ان کے افکار' ان کی تقریروں یا تحریروں سے اخذ کر کے اقتباسات کی صورت میں اسی طرح پیش کئے جائیں گے جیسا کہ مختلف کتب میں درج ہیں۔

قائداعظم کن معنوں میں چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلامی ریاست قائم ہو؟ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک پارلیمانی جمہوری نظام اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ آپ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ مساوات' عدل اور حسن سلوک کے پابند تھے اور شہریوں کے بنیادی حقوق کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ آپ عدلیہ کو انتظامیہ کے رحم و کرم پر نہیں بلکہ اس سے الگ تھلگ اور قطعی طور پر آزاد دیکھنا چاہتے تھے اور پاکستان میں شخصی اقتدار یا یک جماعتی حکومت کے قیام کے خلاف تھے۔

مثلاً ارشاد فرماتے ہیں:

> "آیئے' ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور نظریوں پر رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دے رکھا ہے کہ مملکت کے امور و مسائل کے بارے میں فیصلے باہمی بحث و تمحیص اور مشوروں سے کئے جائیں۔"

(قائداعظم۔ تقریر سبی دربار۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ قائداعظم کے نزدیک پارلیمنٹ بحیثیت شوریٰ کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو کسی مطلق العنان حاکم کو مشورے دینے کے لئے قائم کیا جائے بلکہ ایک ایسا خود مختار اور مقتدر ادارہ تھا جو باہمی مشوروں سے ملکی امور کے متعلق فیصلے صادر کرے یا قانون سازی کا مجاز ہو۔ پس وہ پارلیمنٹ کی بالادستی کے اصول کے قائل تھے۔

قائداعظم کا تصور اسلام کیا تھا؟ یہ کہ توحید ہمیں انسانی مساوات' اخوت اور آزادی کا

سبق دیتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں تو بہت سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے ...... اسلام سب کے لئے عزت، دیانت، شرافت، رواداری اور انصاف کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہے۔ توحید ربانی اور مساوات انسانی اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ اسلام میں انسان، انسان میں کوئی فرق نہیں۔ مساوات، آزادی اور اخوت اسلام کے اساسی اصول ہیں۔"

(قائداعظم۔ خطاب بار ایسوسی ایشن کراچی۔ ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء)

آپ پاکستان کو ایسی مذہبی ریاست یا تھیاکریسی کی شکل میں نہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں مذہبی پیشواؤں کی حکومت ہو یا ایک فرقے کے مسلمانوں کو تو پوری شہریت حاصل ہو لیکن غیر مسلموں اور مسلمانوں کے اقلیتی فرقوں کو مکمل شہری نہ قرار دیا جائے۔ آپ نے فرمایا:

"ہم میں سے بڑی اکثریت کا دین اسلام ہے۔ ہم حضرت محمد رسولؐ اللہ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ ہم اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، وقار اور عزت نفس کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اتحاد کی ایک بالکل مخصوص اور گہری حس رکھتے ہیں۔ لیکن کوئی غلطی نہ کھائیے۔ پاکستان تھیاکریسی یا اس سے ملتی جلتی چیز نہیں ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے رواداری کا سلوک کریں۔"

(قائداعظم۔ آسٹریلیا کے باشندوں کے لئے براڈ کاسٹ۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء)

پھر فرمایا

"مسلم لیگ اپنے اس بنیادی اصول کی ابتدا ہی سے پابند ہے کہ سب فرقوں اور مذہبوں کی آزادی برقرار رکھی جائے۔ پس، مسلم لیگ کبھی بھی مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور غیر مسلموں کے ایمان و عقائد میں مداخلت نہ کرے گی"۔

(قائداعظم۔ شیعہ کانفرنس کو پیغام' ۱۹۴۵ء)

قائداعظم کو علماء اور خاص طور پر کانگریسی ذہنیت کے علماء نے بہت زچ کیا۔ وہ سب،

اسلام ممیت' مسلمانوں کے حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حامی تھے اور دو قومی نظریے' مسلم قومیت کے اصول یا پاکستان جیسے نئے تصورات کو بدعت قرار دیتے ہوئے انہیں کسی صورت میں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی پس منظر میں قائداعظم نے مسلم یونیورسٹی یونین کے طلبہ و طالبات کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لیگ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے آپ کو مسلمانوں کے قدامت پسند عناصر سے نجات دلا دی ہے اور آپ میں بحیثیت مجموعی یہ رائے پیدا کر دی ہے کہ جو لوگ اپنے ذاتی مفاد کا کھیل کھیل رہے ہیں' وہ غدار ہیں۔ اس نے یقیناً آپ کو مولویوں اور مولاناؤں کے ناقابل برداشت عنصر سے آزادی دلا دی ہے۔ میں تمام مولویوں کے بارے میں بحیثیت ایک جماعت بات نہیں کر رہا۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو ہماری طرح محب وطن اور مخلص ہیں۔ لیکن ان میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو ناقابل برداشت ہے۔ اب جبکہ ہم سب نے برٹش حکومت' کانگریس' قدامت پسندوں اور نام نہاد مولویوں کے پنجوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے' تو کیا میں نوجوانوں سے اپیل کر سکتا ہوں کہ وہ ہماری خواتین کی آزادی کے لئے جدوجہد کریں؟ یہ اشد ضروری ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغرب کی برائیوں کی نقالی کریں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری خواتین صرف سوشل زندگی ہی میں نہیں بلکہ سیاسی زندگی میں بھی ہمارا ساتھ دیں"۔

(قائداعظم۔ تقریر ۵ر فروری ۱۹۳۸ء)

اس تقریر میں قائداعظم نے علمائے سوء کے خلاف ان کی تنگ نظری اور قدامت پسندی کے سبب نہایت سخت الفاظ استعمال کئے اور انہیں برٹش حکومت اور کانگریس ایسی استحصالی قوتوں کے زمرے میں شامل کر دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید بہتر ہوتا۔ لیکن ان کے خیالات سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ ان کے عقیدۂ اسلام میں تعصب' تنگ نظری یا قدامت پسندی کا شائبہ تک نہ تھا۔

بحیثیت مسلمان' قائداعظم ایک وسیع النظر انسان تھے اور پاکستان کو بھی ویسی ہی وسعت نظر کا مظہر دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ قرارداد مقاصد میں انہی کے تصور اسلام کو پاکستان کی نظریاتی اساس کے طور پر پیش کیا گیا۔ اور اس اعتبار سے یہی دستاویز پاکستان کی

آزادی کا چارٹر ہے۔

پیشتر اس کے کہ اس موضوع پر علامہ اقبال کے نظریات کا مطالعہ کیا جائے، ہم دیو بند کے مولانا حسین احمد مدنی کے معتقدین میں سے ایک کا علامہ اقبال کے بارے میں اقتباس نقل کرتے ہیں۔ یہ اقتباس مولانا نجم الدین اصلاحی کی تصنیف "مکتوبات شیخ الاسلام" لاہور، ۱۹۴۴ء جلد سوم ص ۱۴۱ سے لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم ڈاکٹر اقبال کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں کیونکہ ہم نے ان کے کلام کو بغور پڑھا ہے ..... ان کے کتنے ہی شعر ایسے ہیں جن میں کھلے بندوں اسلام اور اسلامی فلسفے پر ان کی زد پڑتی ہے"۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

"پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکر اقبال کی روشنی میں تو ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے، وہ اقبال مرحوم ہی کے فلسفے کا دوسرا نام ہے"۔

یہ اقتباس دو وجوہ کی بنا پر نقل کیا گیا ہے۔ پہلی یہ کہ پاکستان میں علماء کے ایک طبقے کے نزدیک علامہ اقبال صرف ایک شاعر اور فلسفی تھے اور ان کی مسلمانی اس اسلام پر مبنی نہ تھی جو علماء کے اس گروہ کا اسلام ہے۔ دوسری یہ کہ علماء کے اس طبقے کی رائے میں پاکستان ایک مخصوص قسم کے اسلام کے نام پر بنایا گیا اور یہ مخصوص اسلام علامہ اقبال ہی کے فلسفے کا دوسرا نام ہے۔ اگر مولانا نجم الدین اصلاحی کے نزدیک پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکر اقبال کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے کیونکہ جس مخصوص اسلام پر پاکستان بنایا گیا، وہ فلسفہ ء اقبال ہے تو آیئے، دیکھتے ہیں کہ فلسفہ ء اقبال کی یہ جہت کیا ہے۔

علامہ اقبال نے ایک نئے مسلم معاشرے کے قیام کا خواب دیکھا، اور وہ برصغیر میں نئی مسلم ریاست میں اسے عملی طور پر وجود میں لانے کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی تحریروں میں تین باتوں کا ذکر کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دینیات کے میدان میں تائید اصول مذہب کے لئے نئے علم الکلام کی تدوین ——— ان کے خیال میں روایتی علم الکلام چونکہ یونانی فلسفے کی بنیادوں پر ترتیب دیا گیا تھا، اس اعتبار سے فرسودہ ہو چکا ہے اور مسلمانوں کی نئی نسل اس سے استفادہ نہیں کر سکتی۔ پس، ضروری ہے کہ جدید سائنس کی تحقیقات کی روشنی میں ایک نئے علم الکلام کی تشکیل کی جائے

کیونکہ ان کے نزدیک جدید سائنس کے دریافت شدہ حقائق کی آیات قرآنی سے ہر لحاظ سے مطابقت ہے اور مسلمانوں کی جدید نسل کے لئے ایسا ہی علم الکلام ان کے قلوب میں ایمان کی جڑیں زیادہ مضبوط کر سکتا ہے۔

(۲) اجتہاد کی بنیادوں پر فقہ اسلامی کی تدوین نو ----- علامہ اقبال کے نزدیک شریعت اسلامیہ کی تعریف یہ ہے کہ فقہاء کے استدلالات کا دستیاب مجموعہ جسے حرف آخر نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ متغیر حالات کے سبب وہ ایک نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> "حالات زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آ جانے کی وجہ سے ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات' جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے' ایک نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ میرا یہ عندیہ نہیں کہ مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے جس کے سبب وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بنا پر جو استدلال فقہا نے وقتاً" فوقتاً" کئے ہیں' ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے تو واقعی مناسب اور قابل عمل تھے' مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔"
>
> (مضمون "قومی زندگی" مخزن' لاہور۔ اکتوبر ۱۹۰۴ء)

(۳) تعلیم کے شعبے میں اسلامی علوم کا جدید علوم یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ساتھ امتزاج ----- یہ انقلابی تبدیلی وہ اس لئے لانا چاہتے تھے تاکہ مسلم طلبہ و طالبات میں تحقیق' تخلیق' اختراع اور ایجاد کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا جا سکے۔ علاوہ اس کے علامہ اقبال کے نزدیک محض دینی علوم کی تجدید سے مسلمانوں کے تمدنی احیاء کا امکان نہ تھا۔

ظاہر ہے' یہ تینوں آئیڈیل ریاست یا سٹیٹ کے انعقاد ہی کے ذریعے حاصل کئے جا سکتے تھے' اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ علامہ اقبال کے ہاں ہمیں جدید اسلامی ریاست کا خاکہ کس قسم کا ملتا ہے۔

علامہ اقبال کی تحریروں سے عیاں ہے کہ وہ مسلم ممالک میں منتخب قانون ساز مجالس کے قیام کو اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک قرآن مجید سے ریاست کے لئے اگر کوئی بنیادی اصول اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ انتخاب ہی کا اصول ہے۔ آپ اس ضمن میں قرآن مجید کی سورۃ ۴۲ آیت ۳۸ کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور فرماتے

ہیں:

"جمہوری طرز حکومت نہ صرف اسلام کی روح کے عین مطابق ہے بلکہ اگر ان نئی قوتوں کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے جو اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں تو یہ طرز حکومت اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔"
(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ - ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۲۵)

وہ جدید اسلامی ریاست کو تین اصولوں پر قائم کرتے ہیں:

مساوات اتحاد انسانیت------- اور

آزادی

فرماتے ہیں:

"بحیثیت ایک اصول عمل "توحید" مساوات، اتحاد انسانیت اور حریت کی اساس ہے۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو از روئے اسلام ریاست کا مطلب ہو گا، ایک ایسی کوشش کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ گویا یہ ایک آرزو ہے، ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں کار فرما دیکھنے کی۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۲۲، ۱۲۳)

اسی طرح ان کے نزدیک اسلام کا مقصد صرف مادی معنوں میں جمہوریت کا قیام نہیں بلکہ اصل نصب العین ایک روحانی جمہوریت کا انعقاد ہے۔

فرماتے ہیں:

"آج کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے موقف کو پورے طور پر سمجھے اور اپنی معاشرتی زندگی کی از سرنو تشکیل اسلام کے ان بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کرے تاآنکہ اسلام کی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشوونما جو اس کا مقصود و منتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔" (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن۔ ص ۱۴۲)

خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء میں جسے پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ایک بنیادی سیاسی دستاویز تصور کیا جاتا ہے، علامہ اقبال مجوزہ مسلم ریاست میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مذہبی

رواداری کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ایک ایسی مذہبی جماعت جو دوسری جماعتوں کے لئے نفرت و حقارت کے جذبات رکھتی ہو، میری نگاہ میں کمینہ فطرت اور رذیل ہے۔ میں دوسری جماعتوں کے رسوم و رواجات، قانون، مذہبی اور معاشرتی اداروں کی انتہائی عزت کرتا ہوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پڑ جائے تو ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ بھی کروں۔"

(اقبال کی تقریریں اور بیانات۔ مرتبہ اے آر طارق۔ ص ۱۰)

قائداعظم کے نام علامہ اقبال کے خطوط سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی مجوزہ مسلم ریاست میں ایسی معاشی جمہوریت یا سوشل ڈیموکریسی کے قیام کے خواہشمند تھے جسے شریعت اسلامی کی تائید حاصل ہو۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، وہ اجتہاد کے ذریعے شریعت اسلامی کی تدوین نو کے زبردست حامی تھے اور انہیں یقین تھا کہ قانون شریعت کی ایسی تدوین سے مسلمان، اسلام کی برکات سے یقیناً فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو ممکن تھا وہ اس میدان میں ہماری رہبری کے لئے کچھ چھوڑ جاتے۔ عجیب بات ہے کہ آج سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی نظام، دونوں عالمی طور پر پسماندگی کو دور کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں اور دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں اب کسی کے پاس بھی پیش کرنے کے لئے ایسی کوئی معاشی تنظیم نہیں رہی جو انسان میں اپنے مستقبل کی زندگی کو آسودہ یا بہتر بنا سکنے کے لئے نیا عزم پیدا کر دے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اسلام اس ضمن میں ایسا کوئی معاشی نظام پیش نہیں کر سکے جس سے ہم دنیا کو اسلام کی برکات سے روشناس کرا سکیں۔

اب ہم ایک اور سوال کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں، وہ یہ کہ اجتہاد کے متعلق علامہ اقبال کا طریق کار کیا ہے۔ علامہ اقبال اجتہاد کا اختیار انفرادی مجتہدین کے ہاتھ سے لے کر مسلم اسمبلی یا پارلیمنٹ کو دینا چاہتے تھے، یعنی ان کے نزدیک قانون سازی کا حق صرف منتخب نمائندوں ہی کو دیا جا سکتا ہے جسے وہ اجماع امت کی جدید شکل قرار دیتے ہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ منتخب نمائندے گو مسلمان ہوں گے، لیکن ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ شریعت اسلامی کی قانونی باریکیوں سے پورے طور پر شناسا ہوں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال یہ تجویز کرتے ہیں کہ نامزدگی کی بنا پر علماء کا ایک بورڈ تشکیل دیا جا سکتا ہے جو اسمبلی میں قانون سازی کے بارے میں منتخب نمائندوں کی رہبری کرے یا ان کا ممد و معاون

ہو ـــــ لیکن وہ علماء کو ایرانی ولایت فقیہہ کی طرح مجلس قانون ساز کے وضع کردہ قوانین کو ویٹو کرنے کا اختیار نہیں دیتے بلکہ فرماتے ہیں کہ سنی ممالک میں یہ طریق کار بھی عارضی طور پر استعمال کیا جانا چاہئے۔ علامہ اقبال اسمبلی میں اسلامی قانون سازی کے معاملے میں علماء کے اولین رول کے کیوں خلاف ہیں؟ یہ ایک علیحدہ موضوع بحث ہے جس کی تفصیل میں جانا یہاں ممکن نہیں۔

بہرحال، علامہ اقبال کے نزدیک صحیح صورت یہی ہے کہ اسمبلی میں ایسے وکلا منتخب ہو کر آنے چاہئیں جو روایتی فقہ اسلامی کے ساتھ ساتھ جدید 'جورس پروڈنس' کے بھی ماہر ہوں۔ اور اس ضمن میں وہ یونیورسٹیوں میں قانون کی تعلیم کے شعبے میں بنیادی تبدیلیاں بھی لانا چاہتے تھے۔ تاہم مجلس قانون ساز کی بالادستی کو ہر صورت میں برقرار رکھنے کے قائل تھے۔ پاکستان میں آج تک جتنے بھی آئین بنائے گئے ہیں، ان میں اسلامی نظریاتی کونسل کی موجودگی علامہ اقبال کی اسی تجویز کی ایک عملی شکل ہے۔ فرماتے ہیں:

> "اگر اجتہاد کا اختیار مدرسہ ہائے فقہ کے انفرادی نمائندوں کے ہاتھ سے لے کر مجلس قانون ساز کو دے دیا جائے تو مسلمانوں کی مختلف فرقوں میں تقسیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید زمانے میں یہی ایک شکل ہے جو اجماع اختیار کر سکتا ہے اور جس کے ذریعے غیر علماء یا عام اشخاص بھی جو ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اس میں حصہ لے سکیں گے۔ یوں، ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے، از سرنو بیدار کر سکتے ہیں اور اس کے اندر ایک ارتقائی مطمح نظر پیدا کیا جا سکتا ہے ..... لیکن ابھی ایک اور سوال ہے جو اس سلسلے میں کیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہو گی، اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا ان کا طریق کار کیا ہو گا کیونکہ اس قسم کی مجالس، شریعت کی تعبیر میں شدید غلطیاں کر سکتی ہیں۔ ان غلطیوں کے ازالے یا کم سے کم امکان کی صورت کیا ہو گی؟ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں دینی امور سے متعلق علماء کی ایک علیحدہ کمیٹی بنائی گئی ہے ..... جسے مجلس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کا اختیار

ہے ..... بہرحال، ایرانی نظریۂ دستور خواہ کچھ بھی ہو، یہ انتظام بڑا خطرناک ہے اور سنی ممالک اسے اختیار بھی کریں تو عارضی طور پر۔ بہتر یہی ہو گا کہ علماء کو بطور ایک موثر جزو، مجلس قانون ساز میں شامل کیا جائے تاکہ وہ قانون سازی سے متعلق امور پر آزادانہ بحث و تمحیص میں ارکان کی امداد اور رہبری کر سکیں۔ بایں ہمہ شریعت کی غلط تعبیر کا سدباب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ بحالت موجودہ مسلم ممالک میں قانون کی تعلیم کے شعبے میں اصلاح کی جائے اور فقہ اسلامی کے نصاب کی توسیع یوں کی جائے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید جورس پروڈنس، کا مطالعہ بھی سوچ سمجھ کر کیا جائے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن۔ ص ۱۳۸ تا ۱۴۰)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ جدید اسلامی جمہوری فلاحی ریاست کے قیام کے بارے میں قائداعظم اور علامہ اقبال کے نظریات میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ اب فقہ اسلامی کے متعلق علامہ اقبال کے افکار کا جائزہ لیا جا سکتا ہے کہ وہ اجتہاد کی ضرورت کیوں محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے تفصیل سے وہ وجوہ بیان کی ہیں جن کی بنا پر ان کی رائے کے مطابق قانون شریعت کو جامد بنا دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان اسباب کو دریافت کریں جن کی بنا پر قانون اسلامی عملی طور پر سرتاسر جامد بنا دیا گیا ہے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۱۸)

ان کے نزدیک مسلمانوں کی انتہائی قدامت پسندی کے سبب شریعت کی تعبیر کے بارے میں جج صاحبان صرف فقہ کی معروف کتب پر انحصار کرتے ہوئے فیصلے صادر کرتے ہیں۔ نتیجتہ" قانون اسلامی اپنی جگہ پر جامد کھڑا ہے حالانکہ مسلمان آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کی غیر معمولی طور پر قدامت پسندی کے سبب عدالتوں کے جج صاحبان مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی کی مستند کتابوں سے سرمو انحراف نہ کریں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تو بدل رہے ہیں مگر قانون جہاں تھا، وہیں کھڑا ہے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۳۴)

علامہ اقبال اس لئے بھی اجتہاد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ شریعت اسلامی کی تعبیروں کے بارے میں جو مدرسہ ہائے فقہ وجود میں آئے' ان کے اماموں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ ان کی تعبیریں حرف آخر ہیں۔ اور ویسے بھی علامہ اقبال کے نزدیک شریعت اسلامی قدیم فقہا کے فتووں کا مجموعہ ہے جو محض ذاتی تعبیریں ہیں جنہیں حرف آخر نہ سمجھنا چاہیے۔

آپ فرماتے ہیں:

"لیکن اپنی ساری جامعیت کے باوجود ہمارے نظام ہائے فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں۔ اور اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر قانون اسلامی کی نشوونما کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے اسلام نے تو مذاہب فقہ کے بارے میں کچھ ایسی ہی رائے قائم کر رکھی ہے۔ لیکن پھر اس کے باوجود انہوں نے مکمل اجتہاد کی ضرورت سے بھی اصولاً" کبھی انکار نہیں کیا۔ میں ان اسباب کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جو میرے نزدیک علمائے اسلام کی اس روش کے محرک ہوئے۔ لیکن اب کہ زمانہ بدل چکا ہے اور دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکر انسانی کی ہر سمت میں غیر معمولی ترقی کے باعث پھیل رہی ہیں' کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مذاہب فقہ کی خاتمیت پر برابر اصرار کرتے رہنا چاہیے۔ ائمہ ء مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرف آخر ہیں؟ ہرگز نہیں ..... لہٰذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے' محض ایک افسانہ ہے جس کا خیال کچھ تو اس لئے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار فقہ ایک معین صورت اختیار کرتے چلے گئے' اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اگر فقہائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس افسانے کی حمایت کی ہے' تو کیا مضائقہ ہے۔ عہد حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں ..... نہ تو ہمارے اصول فقہ نہ نظامات فقہ میں آج بھی کوئی بات ایسی ہے

جس کے پیش نظر ہم اپنے موجودہ طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرائیں۔ برعکس اس کے دنیائے اسلام کو چاہئے کہ اپنے افکار کی وسعت، دقت نظر اور نئے نئے احوال اور تجربات کی روشنی میں فقہ اسلامی کی تشکیل نو کا کام جرأت سے انجام دیں۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۴۱، ۱۴۲)

علامہ اقبال چونکہ معاملات کے بارے میں مکمل اجتہاد کے قائل ہیں، اس لئے امام کرخیؒ سے اتفاق کرتے ہوئے اجماع صحابہ کرامؓ کو بھی صرف اس صورت میں آئندہ نسلوں کے لئے حرف آخر سمجھتے ہیں جب اس کا تعلق کسی واقعاتی شہادت کے مسئلے سے ہو۔ لیکن اگر اس کا تعلق محض کسی قانونی مسئلے کی تعبیر سے ہے تو آئندہ نسلیں ان کے متفقہ فیصلے کی پابند نہ ہوں گی۔

فرماتے ہیں:

"لیکن فرض کیجئے، صحابہ کسی امر پر متفق ہیں۔ اندریں صورت سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے فیصلے کی پابندی کیا ہمارے لئے بھی ضروری ہے ...... میری رائے میں اس مسئلے کا فیصلہ یوں ہونا چاہئے کہ ہم ایک "امر واقعی" اور "امر قانونی" میں فرق کریں۔ مثلاً اس مسئلے میں کہ آخری دو سورتیں "معوذتان" قرآن پاک کا جزو ہیں یا نہیں اور جن کے متعلق صحابہ کا بالاتفاق یہ فیصلہ ہے کہ یہ سورتیں جزو قرآن ہیں، ہمارے لئے ان کا اجماع حجت ہے کیونکہ یہ صرف صحابہ تھے جو اس "امر واقعی" کو ٹھیک جانتے تھے۔ بصورت دیگر یہ مسئلہ تعبیر اور ترجمانی کا ہو گا۔ لہٰذا میں کرخی کی سند پر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس صورت میں صحابہ کا اجماع ہمارے لئے حجت نہیں۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۳۹)

اسی طرح علامہ اقبال جرائم کی اسلامی سزاؤں سے متعلق شرعی احکام کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ کی "حجۃ اللہ البالغہ" کے حوالے سے ان کی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ چونکہ یہ سزائیں بجائے خود کوئی مقصد نہیں، اس لئے آئندہ نسلوں پر ان

کا سختی سے اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے اس اقتباس کو مولانا شبلی نعمانی نے بھی اپنی تصنیف "الکلام" میں صفحات ۱۱۴، ۱۱۵ پر نقل کیا ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ میں اس کا مفاد ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں، ان پر اسی قوم کے رسم و رواج اور عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے، لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہوں، اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول نازل کئے جائیں گے نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالم گیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہی اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کار فرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح جو شرعی احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً جرائم کی سزائیں) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لئے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ یہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ ۱۹۸۶ء ایڈیشن ص ۱۳۶، ۱۳۷)

علامہ اقبال نے حضرت شاہ ولی اللہ کا نظریہ اس لئے پیش کیا ہے کہ ان کی نگاہ میں بھی اسلامی ریاست میں اسلامی برکات کی اہمیت اسلامی سزاؤں سے کہیں زیادہ ہے۔

قائداعظم اور علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں پاکستان کی نظریاتی اساس کی وضاحت سے صاف نظر آتا ہے کہ ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کی سوچ کا اہم پہلو وسیع النظری تھا۔ اپنے اپنے زمانے میں ان دونوں کے افکار کو غلط سمجھا گیا اور ان پر کفر کے فتوے بھی لگے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود مسلمانان برصغیر نے ان کے افکار اور قیادت پر اعتماد کیا اور

پاکستان حاصل کر لیا۔

پاکستان کے قیام کے ابتدائی دور میں کچھ مدت تک قائداعظم اور علامہ اقبال کے افکار سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مثلاً اسلامی قانون سازی کے اصول کے طور پر قرار داد مقاصد کا منظور کیا جانا اور پاکستان کے پہلے آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل کا وجود انہی کے نظریات کی عکاسی ہے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اور ہم جمہوریت کے رستے سے ہٹ کر آمریت کی راہ پر آگئے' رواداری کا خاتمہ ہو گیا اور وسیع النظری کو خیرباد کہہ کر ہم تنگ نظری اور قدامت پسندی کو اپنا شعار بناتے چلے گئے۔ تنگ نظری یا قدامت پسندی کی اس ملک میں کئی جہتیں ہیں اور وقت کے بہاؤ میں اس نے کئی روپ دھارے ہیں۔ سب سے پہلے ایوب خان کی آمریت کے زمانے میں اس نے لسان پرستی اور علاقہ پرستی کا روپ دھارا' اور یحییٰ خان کے دور آمریت میں ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ بعد ازاں بھٹو کی جمہوری آمریت کے زمانے میں ہم لسانی اور مذہبی قدامت پسندی کی لپیٹ میں آ گئے۔ بالآخر ضیاء الحق کے دور آمریت میں لسانی' نسلی اور مذہبی قدامت پسندی اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہم قائداعظم اور علامہ اقبال کے بتائے ہوئے رستے سے ہٹ کر کسی اور سمت میں رواں دواں ہیں تو غلط نہ ہو گا۔ تنگ نظری کی اس تاریک سرنگ میں جمہوریت کا مستقبل بھی تاریک نظر آتا ہے!

پس ہمارے لئے لازم ہے کہ قومی اور ملکی بقا کی خاطر ایک بار پھر بانیان پاکستان کے افکار کی طرف رجوع کریں اور ان کے افکار کے روشنی میں نظریاتی اساس کی تعبیر کو پیش نظر رکھ کر پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک ایسی جدید اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنائیں جو اسلامی قانون سازی کے ذریعے وہ مقاصد حاصل کر سکے جو بانیان پاکستان کی نگاہ میں تھے' اور ہم اسلام کی برکات سے بہرہ ور ہو سکیں۔ ایسے اقدام کا ہر محب وطن پاکستانی مسلمان خیر مقدم کرے گا۔ اس مرحلے پر ایک سوال غور طلب ہے' کیا موجودہ شکل میں بعض سینیٹروں کا پیش کردہ شریعت بل ہماری نظریاتی اساس سے مطابقت رکھتا ہے؟ اس سوال کا جواب میں قارئین پر چھوڑتا ہوں کیونکہ ہم تو یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ شریعت بل کے پس پردہ سیاسی عوامل کار فرما تھے یا کچھ اور مقاصد۔ یہ تو مستقبل ہی بتا سکتا ہے کہ وہ زندہ بھی ہے یا ختم ہو چکا ہے۔

بہرحال' اگر پاکستان میں انتخابات کے ذریعے پارلیمنٹ کو ایک بار پھر وجود میں آنا ہے تو خیال رہے کہ شریعت بل کی پارلیمنٹ پر بالادستی سے آئین معطل ہو جاتا ہے اور پارلیمنٹ

کی زبردستی سے شریعت کی عزت و تکریم پر حرف آتا ہے۔ اول تو اس معاملے میں اپنی خامیوں کے باوجود آئین پاکستان بجائے خود کافی ہے، لیکن اگر ایسا نہیں تو بہتر یہی ہو گا کہ بانیان پاکستان کے افکار کی روشنی میں قانون نفاذ شریعت کی ایسی قطع و برید کی جائے کہ سب کو قابل قبول ہو اور ایوان میں مکمل اتفاق رائے سے اسے منظور کر کے اس مسئلے پر آئینی خامیاں دور کرنے کے بعد آئین کا اضافی حصہ بنا دیا جائے۔ یہ قومی وقار کا مسئلہ ہے۔ لیکن ایسے بل کو پیش کرتے وقت اگر ووٹوں کی تقسیم ہو گئی تو ہم سب کے لئے اجتماعی طور پر شرمندگی اور ندامت کا باعث ہو گا' اس لئے ہمارے سیاسی قائدین اور مستقبل کے اراکین پارلیمنٹ کو چاہیے کہ قوم کو ایسی آزمائش میں نہ ڈالیں اور کم از کم اس بنیادی اصول پر ہمارے قومی اتحاد اور یکجہتی کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

○

سیاسیات

اقبال اور اسلامی ریاست☆

علامہ اقبال کے نزدیک جدید مغربی تہذیب کی بنیادیں ان انسانی علوم پر استوار ہیں جن کو قرون وسطیٰ کی دنیائے اسلام نے نہ صرف دستبرد زمانہ سے محفوظ رکھا بلکہ ان میں وقتاً فوقتاً اضافہ بھی کیا۔ یہ علوم رفتہ رفتہ ہسپانوی مسلمانوں کی وساطت سے وسطی اور جنوبی یورپ تک پہنچے اور بالآخر یورپ کو گمراہی اور جہالت کی نیند سے بیدار کرنے میں ممد ثابت ہوئے۔

علامہ کی رائے میں جدید مسلمان کا مغرب کے نظریاتی ارتقاء میں دلچسپی رکھنا یا مغربی تصورات کو اپنانا کوئی بری بات نہیں کیونکہ یوں جدید مسلمان اپنے تمدنی ارتقاء کو قائم و جاری رکھنے کی خاطر وہ کچھ یورپ سے واپس لے سکے گا جو دنیائے اسلام نے یورپ کو عطا کیا تھا۔ مگر علامہ، یورپ کی اندھا دھند تقلید کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اسلامی ممالک غیر مقلدانہ انداز میں مغربی تصورات کی قدر و قیمت کا تعین کریں اور انہیں اپنانے سے پیشتر اس بات پر غور کرلیں کہ یورپ میں ان تصورات کا ارتقاء کن حالات میں اور کن وجوہات کی بنا پر ہوا اور کسی مخصوص تصور کو عملی طور پر اپنا کر یورپی قوموں نے اپنے اس تجربے سے کیا نتائج اخذ کیے۔

علامہ مغرب کی "لادینی ریاست" کے تصور کو دنیائے اسلام میں اپنانے کے خلاف

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء، لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر جسٹس کیانی کی زیر صدارت پڑھا گیا۔

تھے۔ ان کی رائے میں یہ تصور مسیحیت میں روح اور مادے کی بنیادی دوئی کے باعث ظہور میں آیا ور اسی کی وجہ سے مغربی ممالک کے باشندوں کی اجتماعی زندگی یعنی ان کی ریاست سے دین بالکل خارج ہو گیا۔ علامہ کی رائے میں مسیحیت یورپ میں ایک خانقاہی نظام کی صورت میں پھیلی۔ چونکہ یہ مذہب مادی دنیا کو نجس اور ناپاک خیال کرتا ہے' اس لئے انسانیت کو کوئی مخصوص دنیاوی نظام زندگی پیش نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغربی ریاستیں 'لادینیت' کے اصول پر قائم کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس "گو اسلام ایسا دین ہے جس کا کسی خطہ ء زمین کی جغرافیائی حدود سے کوئی تعلق نہیں اور بحیثیت ایک تمدن نہ تو اس کی کوئی مخصوص زبان ہے نہ کوئی مخصوص رسم الخط اور نہ ہی کوئی مخصوص لباس' پھر بھی اسلام مادی دنیا کو نجس یا ناپاک تصور نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی کے روحانی اور دنیاوی' دونوں پہلوؤں پر یکساں حاوی ہے اور انسانیت کو ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کرتا ہے جس کی بنیاد روحانی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا کسی مسلم ریاست کے ایک "لادین ریاست" ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ محض نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر اگر کسی مسلم ریاست میں شعبہ ء امور دینیہ کو دوسرے شعبوں سے جدا کر دینے کی ضرورت پڑے تو علامہ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

ان کی رائے میں کسی مسلم ریاست میں شعبہ ء امور دینیہ کی دوسرے شعبوں سے علیحدگی کو یورپ میں کلیسا اور ریاست کی ایک دوسرے سے علیحدگی کے مترادف تصور نہ کرنا چاہئے کیونکہ اول الذکر طرز کی علیحدگی نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر ایک مسلم ریاست میں محض شعبوں کی تقسیم ہے' لیکن آخر الذکر طرز کی علیحدگی مسیحیت میں روح اور مادے کی بنیادی دوئی کے باعث وجود میں آئی' اس لئے یہ تقسیم ایک اصولی تقسیم ہے۔

تاریخ اسلام میں شعبہ ء امور دینیہ کے دوسرے شعبوں سے جدا ہونے کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ سنی اور شیعہ سلطنتوں میں (مثلاً عثمانیہ اور مغلیہ سلطنتوں میں یا ایران میں) دوسرے شعبوں کے ساتھ رفتہ رفتہ شعبہ ء امور دینیہ کا وجود میں لایا جانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ماضی میں نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر اس قسم کی تقسیم کو اسلامی احکام کے منافی خیال نہیں کیا گیا۔ علامہ کے نزدیک چونکہ کسی مسلم ریاست میں شعبہ ء امور دینیہ کی دوسرے شعبوں سے علیحدگی کا یہ مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام بحیثیت دین مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا گیا ہے' اس لئے محض نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر جدید اسلامی ریاست کے شعبوں میں اس قسم کی تقسیم وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

اسلامی ریاست کے کلاسیکی تصور میں تین اہم وظائف کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ یہ تین

وظائف (ا) امامت (امیر یا صدر مملکت کا منصب)، (ب) فتویٰ (مفتی کا منصب)، اور (ج) قضا (قاضی کا منصب) ہیں۔

جہاں تک امامت کا تعلق ہے، ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد دنیائے اسلام نے اوائل اسلام کے کئی بڑے فقہا کی آراء پر قائم کردہ اس "اجتہاد" کو قبول کر لیا ہے کہ منصب امامت افراد کے ایک ادارے یا منتخب اسمبلی کو تفویض کیا جا سکتا ہے۔ علامہ نے ترکوں کے خلافت کو ختم کرنے کے فیصلے کو درست خیال کیا۔ انہوں نے اسلامی ممالک میں جمہوری روح کی بیداری کو قبولیت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ ان کے نزدیک جمہوریت، اسلام کی اصل اور قدرتی سادگی کی طرف رجوع تھا۔ اسی طرح علامہ اسلامی ممالک میں آئین ساز مجالس کے قیام پر بھی بے حد مطمئن تھے۔ پس، چونکہ اسلامی ممالک میں جمہوری جذبے کے فروغ یا مجالس قانون ساز کے قیام کو اسلامی صالحیت کی تجدید قرار دیا جا چکا ہے، اس لئے ملت کے نمائندوں کا منظورہ کردہ آئین اور اس آئین کے تحت منتخب کردہ صدر، اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے سابق خلیفہ، امام، امیر یا سلطان کا آئینی بدل سمجھا جائے گا۔

جہاں تک اسلامی ریاست کے دوسرے اہم وظیفے، "فتویٰ" کا تعلق ہے، یہ منصب صرف ان قضاۃ کو سونپا جاتا تھا جنہیں اسلامی فقہ کے بنیادی ماخذ یا جزئیات پر دسترس حاصل ہوتی تھی اور جو ان ماخذ سے استنباط کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔ ان قضاۃ کو 'ارباب الاجتہاد' کے زمرے میں شمار کیا جاتا اور صدر مملکت ان میں سے کسی کو مفتی مقرر کر دیتا۔ امیر کے جاری کردہ فرمان کے احکام اسلامی کے مطابق یا منافی ہونے کے متعلق آخری فیصلہ (یا فتویٰ) صادر کرنے کا حق مفتی ہی کو حاصل تھا۔ عثمانیہ اور مغلیہ سلطنتوں میں اس منصب کو ریاست کے متفرق شعبوں کی طرح ایک شعبے کی صورت میں منتقل کر دیا گیا اور اس شعبے کا ناظم اعلیٰ "شیخ الاسلام" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

پاکستان میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے (جس کا تقرر قرار داد مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا) اپنی ۱۹۵۲ء کی پیش کردہ رپورٹ میں ایک سفارش یہ بھی کی تھی کہ صدر علماء کے ایک بورڈ کا تعین کرے جس کی حیثیت مشاورتی ہو اور جو یہ فیصلہ کرے کہ اسمبلی کے منظور کردہ قوانین اسلامی احکام سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس سفارش پر خاصی لے دے ہوئی اور اس کی تعبیریوں کی گئی کہ اس طرح ریاست اور دین ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ اسی باعث یہ تجویز مسترد کر دی گئی (عجیب بات ہے کہ علامہ نے اپنی تصنیف

"تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں ایرانی آئین کے تحت علماء یا مجتہدین کے بورڈ کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے بھی اس اصلاح کے حق میں نہیں دی) بہرحال، اس تجویز کے مسترد کر دیئے جانے کے بعد یہ توقع تھی کہ نئے آئین میں سپریم کورٹ کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے گا کہ آیا اسمبلی کے منظور کردہ قوانین اسلامی احکام کے مطابق ہیں یا منافی۔ بالآخر جب آئین نافذ ہوا تو اس کی شق نمبر ۲۶۳ کے تحت سپریم کورٹ کو مشاورتی اختیار تو دیا گیا مگر صرف غیر مذہبی امور کی حد تک۔ لیکن اگر اسی شق میں سپریم کورٹ کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار بھی دیا جاتا کہ آیا اسمبلی کے منظور کردہ قوانین اسلامی احکام کے مطابق ہیں یا منافی، تو ایسی صورت میں اس کے فرائض "فتویٰ" کے مماثل ہو سکتے تھے۔

اسلامی ریاست کے تیسرے اہم وظیفے "قضاء" کا تعلق گو خالصتاً عدل و انصاف سے تھا (یہ شعبہ شروع ہی سے اسلامی ریاست کے دوسرے شعبوں سے جدا رہا) لیکن قاضی آجکل کے ججوں کی طرح صرف قضیوں کا فیصلہ ہی نہ کرتا یا صرف ملزموں کو سزا ہی نہ دیتا بلکہ دیوانی اور فوجداری اختیارات کے علاوہ اسے چند مزید فرائض بھی سونپے گئے تھے۔ مثلاً اسے کسی متوفی کی جائیداد و املاک پر قانونی دستاویز یا وصیت کی رو سے تصرف کرنے کا حق حاصل تھا اور وہ متوفی کے قرضے بے باق کرنے کا مجاز تھا۔ وہ اوقاف کی نگرانی کرتا تھا۔ نکاح خوانی اور جمعہ و عیدین کی نماز کی امامت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

برصغیر ہند میں انگریزوں نے ۱۸۶۴ء میں منصب "قضاء" کا خاتمہ کر دیا جس کے باعث مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی، اس لئے کہ مسلم عوام میں ایک پرانا فتویٰ رائج تھا، اور وہ فتویٰ یہ تھا کہ ہندوستان صرف اس وقت تک دارالاسلام رہے گا جب تک کہ منصب قضاء برقرار رہے گا۔ منصب قضاء کے خاتمے سے پیشتر ہی ہندوستان دارالحرب قرار دیا جا چکا تھا لیکن ۱۸۶۴ء میں مسلمانوں نے جمعہ و عیدین کی نماز میں شرکت ترک کر دی۔ نکاحوں کے ابطال، متوفی کی جائیداد و املاک کی غیر شرعی نگرانی، اوقاف کی بدنظمی اور مساجد میں جمعہ و عیدین کی نماز کی امامت کے فرائض کی ادائیگی کے لئے ائمہ کی عدم موجودگی کے اندیشوں سے مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ منصب قضاء کا خاتمہ بہرحال برقرار رہا اور ۱۸۶۴ء کے بعد سے برصغیر ہند کے مسلمان اسلامی ریاست کے اس اہم وظیفے سے محروم کر دیئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم جس اسلامی نظام عدل کے عادی تھے، وہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

ہمیں اس کے علاوہ ایک بھاری نقصان اور بھی ہوا، وہ یہ کہ اسلام کو مسلم عوام کی

زندگیوں میں داخل کرنے کا جو اہم کام قاضی کے ذریعے اسلامی ریاست انجام دیتی تھی، وہ رابطہ ختم ہو گیا۔ دراصل قاضی ہی مسلمانوں کو اسلام کے قریب تر لانے کا باعث تھا یا دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں اسلام کو جو اتنا بڑا عمل دخل تھا تو اس کی وجہ منصب قضاء کا قیام ہی تھا۔ اس منصب کے خاتمے سے اسلام کے ساتھ جو مسلم عوام کی عملی وابستگی تھی، وہ ختم ہو گئی اور مسلمان کم علم، کٹ حجت اور بے بضاعت ملا کے دام میں پھنس کر رہ گئے اور ملا نے مسلم عوام کو بڑی آسانی سے ان نظریات کی لپیٹ میں لے لیا جو اسلام کی خود ساختہ تشریح پر مبنی تھے۔ پس، ہماری اجتماعی زندگی میں ملا کا دخل ۱۸۶۴ء سے شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے۔

علامہ نے اسلامی ریاست پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت گو منصب قضاء کی اہمیت کا ذکر تفصیل کے ساتھ نہیں کیا، لیکن انہیں مسلم عوام کی زندگی میں ملا کے دخل سے پیدا شدہ خطرات کا پورا احساس تھا۔ علامہ کی نگاہ میں مسلمانوں کی تنزل کی تین بڑی وجوہات تھیں: اول، دنیائے اسلام میں تنزل پذیر بادشاہت کی موجودگی۔ دوم، ملائیت۔ اور سوم، تصوف۔ بادشاہت گو دنیائے اسلام میں جمہوری جذبے کے فروغ کی وجہ سے مٹتی جا رہی ہے، لیکن ملائیت اور تصوف کا ابھی تک دور دورہ ہے اور مسلم عوام ان سے بدستور اثر قبول کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء اسلام نے گزشتہ تاریخ میں اسلامی دینیات اور نظری علوم کی تشریح و تصریح کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، لیکن علامہ کی رائے میں ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد علماء اسلام بے حد رجعت پسند ہو گئے اور انہوں نے "اجتہاد" ترک کر دیا جس کی وجہ سے اسلامی دینیات کی تشریح و تصریح کا سلسلہ جاری رہنے کے بجائے غیر متحرک ہو گیا۔ علامہ کی رائے میں مسلمانوں کے قدیم فقہی اداروں اور روایتوں پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی فقہ میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت پر خاص زور دیا اور جدید تجربات کی روشنی میں اسلامی احکام کی تعبیر کرنے کے لئے "اجتہاد" کی تائید کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے تعلیمی نصاب خصوصاً قانونی تعلیم کے نصاب کی اصلاح و ترمیم کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔

یہاں اس امر کا اظہار دلچسپی سے خالی نہیں کہ خلفاء عباسیہ اپنے تنزل کے دور میں بھی قضاء اور ائمہ ء مساجد کے تقرر کے اختیارات سے دستکش نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ مشکواۃ میں منقول ایک حدیث کے مطابق پیغمبرؐ اسلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ صرف امیر مملکت یا اس کی

جانب سے مقرر کردہ فرد یا افراد ہی عوام میں تبلیغ کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ علامہ اس حدیث کا حوالہ دے کر یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں صرف حکومت کی طرف سے سند یافتہ علماء ہی کو تبلیغ کا اختیار دیا جانا چاہئے۔ جب مصطفےٰ کمال پاشا نے جدید ترکی میں یہ اصلاح نافذ کی تو علامہ نے ان الفاظ میں اتاترک کو خراج تحسین ادا کیا:

"جہاں تک علماء کو سند دینے کے قانون کا تعلق ہے، اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اسے یقینی طور پر مسلمانان ہند میں رائج کرتا۔ عام مسلمان کی کند ذہنی کا باعث دراصل دینی معاملات میں ملا کی من گھڑت داستان تراشی ہے۔ اسے عوام کی دینی زندگی سے خارج کر کے اتاترک نے وہ کام سرانجام دیا ہے جو ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ جیسی شخصیتوں کے لئے مسرت کا باعث بنتا۔"

علامہ کی نظریاتی وسیع النظری اسی بات میں مضمر ہے کہ انہیں ایک طرف تو وقت کے نئے تقاضوں کے ایک ٹھوس حقیقت ہونے کا احساس تھا اور دوسری طرف وہ اسلام کو بھی ایسا دین تصور کرتے تھے جو حقیقت سے فرار کا قائل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جدید تجربات کی روشنی میں اسلامی احکام کی تعبیر کرنے کے لئے "اجتہاد" کے لئے احیاء کی ضرورت محسوس کی اور ہمیں "دوام در تغیر" کے فلسفے سے روشناس کرایا۔

علامہ کی بڑی خواہش تھی کہ جدید مسلمانوں میں علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جس کا شعار میانہ روی ہو اور جو اسلام کے ساتھ ساتھ وقت کے نئے تقاضوں کو بھی ایک ٹھوس حقیقت خیال کرے۔

اسی سلسلے میں انہوں نے فرمایا:

"روحانی طور پر ہم نے اپنے آپ کو گزشتہ کئی صدیوں سے ایسے خیالات و جذبات میں جکڑ رکھا ہے کہ اب اس قید خانے سے کسی صورت چھٹکارا ممکن نہیں ...... اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے اذہان کو قرون وسطیٰ کے علماء کے فرسودہ نظریات سے آزاد کریں۔"

لیکن ہوا یہ کہ ہمارے نام نہاد علماء نے انہیں مغرب زدہ سمجھ کر اپنے زمرے سے خارج کر دیا، اور مغرب کے پرستاروں نے انہیں رجعت پسند خیال کر کے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ حقیقت میں علامہ جس طرح ملائیت کے خلاف تھے، اسی طرح وہ مغرب پسندی

کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی وسیع النظری دراصل ان کی میانہ روی میں پوشیدہ تھی۔

بدقسمتی سے علامہ کی نظریاتی میانہ روی ہم میں ابھی تک پیدا نہیں ہوئی۔ ہم نظریاتی طور پر دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک بڑی تعداد تو ان لوگوں کی ہے جو ملائیت کے زیر اثر نہایت رجعت پسند خیالات رکھتے ہیں اور کسی قسم کے تغیر یا تبدل کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔ دوسری طرف ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں مغرب پسندی خاصی مقبول ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس گروہ کو ہمارے دین' تمدن اور تاریخی روایات میں کوئی بھی کام کی بات دکھائی نہیں دیتی۔ وہ ہمارے ہر اس ادارے سے منحرف ہے جسے ہم اپنا کہہ سکتے ہیں۔

روایت ہے کہ ایک روز خلیفہ ثانیؓ سے بازار میں کھڑے کسی یہودی نے سوال کیا: "اے عمر! کیا مجھے اپنے فعل و عمل پر کلی آزادی حاصل ہے یا جو کچھ مجھ سے سرزد ہوتا ہے' خدا کی طرف سے ہوتا ہے؟" خلیفہ ثانیؓ نے اسے اپنی ایک ٹانگ اٹھانے کو کہا۔ یہودی نے ایک ٹانگ اٹھا دی۔ خلیفہ ثانیؓ پھر گویا ہوئے: "اب دوسری ٹانگ بھی اٹھاؤ!" یہودی نے بتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن دوسری ٹانگ نہ اٹھا سکا۔ سو ہمارا مغرب زدہ طبقہ بھی اس روایتی یہودی کی طرح اپنی دونوں ٹانگیں ہوا میں اٹھانے پر تلا ہوا ہے' اور دوسری طرف ہمارا رجعت پسند طبقہ ایک ٹانگ اٹھانے پر بھی کفر و الحاد کے فتوے لگانے سے باز نہیں رہتا۔

پاکستان اس لئے معرض وجود میں آیا کہ برصغیر ہند میں دو ایسی قومیں آباد تھیں جو ہر لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف تھیں۔ مسلم قوم چونکہ اپنی اجتماعی زندگی کو اپنے مخصوص تمدن کے سانچے میں ڈھالنا چاہتی تھی' اس لئے اس نے اپنی خواہشات کی آزادانہ تکمیل کے لئے ایک علیحدہ خطہ ء زمین حاصل کر لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرارداد مقاصد میں یہ طے پایا تھا کہ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق' جو قرآن و سنت میں متعین ہیں' ڈھال سکیں' لیکن غور طلب مسئلہ تو یہ ہے کہ گزشتہ گیارہ سالوں میں ہمارے قائدین میں سے کسی ایک نے بھی اس مقدس اصول کی بنیادوں پر ہماری نئی آنے والی نسلوں کی تعمیر کی خاطر کوئی قدم اٹھایا یا اس مقدس اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے تعلیمی اداروں کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی یا ہماری غلامی کے عہد کے نصاب تعلیم کو بدلنے کا خیال کیا!

تاریخ عالم اس بات کی شاہد ہے کہ جب کسی نئے تصور کی بنیادوں پر کسی قوم کی تعمیر ہوتی ہے تو اس میں اہل فکر یا اہل تخیل شخصیتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ایسی شخصیتیں اپنی تمام

ر قوت فکر و تخیل، اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کرتی ہیں تاکہ وہ تصور زندہ و پائندہ رہ سکے جس کی بنیادوں پر انہیں قوم کی تعمیر مقصود ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کا بنیادی تصور زندہ و برقرار نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس تصور کی بنیادوں پر نئی آنے والی نسلوں کی تعمیر کے امکانات پیدا نہ کیے جائیں۔ پاکستان کے حصول تک بلاشبہہ ہم میں ایسی شخصیتیں موجود تھیں جن کے فکر و تخیل پر قوم کو اعتماد تھا۔ مگر جب پاکستان کی تعمیر کا وقت آیا تو ہم ان نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ ہم نے سیاست دان ضرور پیدا کیے، لیکن ایک بھی صاحب نظر، صاحب تخیل یا صاحب فکر شخصیت پیدا کرنے کی توفیق ہمیں نہ ہوئی۔ چنانچہ ہماری نئی آنے والی نسلوں کی تعمیر کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ نہ تو ہمارے تعلیمی اداروں کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی گئی اور نہ ہی کسی کو ہماری غلامی کے عہد کے نصاب تعلیم کو بدلنے کا خیال آیا۔ البتہ اسلامی تحقیق سے متعلق نام نہاد ادارے ضرور قائم کیے گئے، اقبال اکادمیاں ضرور ترتیب دی گئیں، لیکن ان اداروں سے اگر فائدہ اٹھایا تو چند گنے چنے خوشامد پرست اصحاب نے جن کے پیٹ بھرنے کا سامان پیدا ہو گیا۔ مگر چونکہ ان اداروں کا ہماری تعلیم گاہوں یا یونیورسٹیوں سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا، اس لئے ہمارے طلبہ میں تخلیقی اور تعمیری تحقیق کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔

اب آیئے اس سوال پر غور کریں کہ وہ آئین جو سات آٹھ سال کے مسلسل انتظار کے بعد ہمیں وضع کر کے دیا گیا، اس میں اسلام کو کیا مقام حاصل تھا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین قرار داد مقاصد کے تحت عمل میں لائی گئی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دستوری سفارشات پر مبنی تھا۔ قرار داد مقاصد میں یہ طے پایا تھا کہ پاکستان کے آئین میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کو، جس طرح کہ اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۵۳ء میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کا نام دے دیا گیا اور ۱۹۵۶ء کے آئین کو بھی آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان کہہ کر پکارا گیا، لیکن کیا ۱۹۵۶ء کے آئین میں عملی طور پر ان اصولوں کو برقرار رکھا گیا جن کا ذکر قرار داد مقاصد میں کیا گیا تھا؟ یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ ۱۹۵۶ء کا آئین کس حد تک جمہوری آئین تھا بلکہ سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین کس حد تک اسلامی جمہوریہ کے آئین ہونے کا دعویٰ کرتا تھا یا دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۶ء کے آئین کو کس حد تک اسلامی آئین بنانے کی کوشش کی گئی۔

۱۹۵۶ء کے آئین کو گو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کا نام دیا گیا اور اس کے حصہ

سوم میں مملکت کی پالیسی کے رہنما اصولوں کی تفصیل بھی دی گئی' لیکن اگر آئین کی ان شقوں کو کوئی اہمیت حاصل تھی بھی تو محض تخیلی۔ آئین میں ان کی عملی حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔

۱۹۵۶ء کے آئین میں اسلام کو اگر کوئی عملی حیثیت دی بھی گئی تو دو صورتوں میں۔ اول شق نمبر ۳۲ میں جس کے تحت صدر صرف مسلمان ہی منتخب ہو سکتا تھا' اور دوم آئین کے حصہ دوازدہم میں جہاں اسلامی احکام کا ذکر تھا۔ اس حصے کی شق نمبر ۱۹۷ کے تحت صدر پر لازم تھا کہ مسلم معاشرے کی صحیح اسلامی اساس پر تنظیم کے لئے اسلامی تحقیق کا ادارہ قائم کرے۔ پھر شق نمبر ۱۹۸ کے تحت پانچ سال کا عرصہ گزرنے کے بعد مملکت میں رائج قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق بنائے جانے کے امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

جہاں تک صدر منتخب ہونے کے لئے مسلمان ہونا لازمی تھا' تو یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی وجہ سے ایک آئین اسلامی آئین کہلانے کا مستحق ہو سکتا تھا کیونکہ بیشتر "لادین ریاستوں" میں بھی صدر ہمیشہ اسی مذہب یا فرقے سے منتخب کیا جاتا ہے جس کی ملک میں اکثریت ہو۔ دوسرے' شق نمبر ۱۹۷ کے تحت اسلامی تحقیق کا ادارہ قائم کرنا گو صدر کا فرض تھا' لیکن اس سلسلے میں کچھ نہ کیا گیا۔ اسلامی تحقیق سے متعلق ادارے اگر قائم کیے بھی گئے تو ان سے ہمارے طلبہ فائدہ نہ اٹھا سکے' اس لئے مسلم معاشرے کی صحیح اسلامی اساس پر تنظیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ تیسرے' شق نمبر ۱۹۸ کے تحت اگر مملکت میں رائج قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق ڈھالا بھی جاتا تو اس کے امکانات پانچ سال یا شاید اس سے بھی زائد عرصے کے بعد پیدا ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو عملی طور پر آزمانے سے پیشتر ہی منسوخ کر دیا گیا' لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو جس ہیئت میں پیش کیا گیا' اس میں اسلام کو اگر کوئی مقام حاصل تھا تو اس کی اہمیت محض تخیلی تھی' عملی نہ تھی۔

اگر کسی جمہوریہ کے آئین کو اسلامی جمہوریہ کے آئین کا نام دے دیا جائے تو وہ کیا حقیقی معنوں میں اسلامی جمہوریہ کا آئین کہلانے کا مستحق ہو گا؟ اس سلسلے میں دو نظریے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تخیلی ہے اور دوسرا عملی۔ تخیلی نظریے کے مطابق کسی ملک کا آئین منطقی اصولوں پر استوار کردہ قانون محض ہی قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ ایک قوم کی امیدوں' تمناؤں' خوابوں اور اس کے تصورات و تخیلات کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کانوں میں اذان کہی جاتی

ہے، اس کا اسلامی نام رکھا جاتا ہے۔ پانچ چھ سال کی عمر تک یا جب تک یہ بچہ پڑھنا لکھنا سیکھنے کے قابل نہیں ہو جاتا، اس میں اپنے اسلامی نام کے سوا اور کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے اسے مسلمان کہا جا سکے۔ جب وہ پانچ چھ سال کا ہو جاتا ہے تو والدین اسے قرآن مجید پڑھانا شروع کراتے ہیں، اسے وضو کرنا اور نماز پڑھنا سکھاتے ہیں، حتیٰ کے وہ بڑا ہو جاتا ہے اور والدین اسے اس خیال سے تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ اب ہم نے اپنے بیٹے میں جوان ہو کر ایک باعقیدہ اور باعمل مسلمان بننے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کسی جمہوریہ کے آئین کو اسلامی جمہوریہ کے آئین کے نام سے پکارنے میں کوئی ہرج نہیں بشرطیکہ مستقبل قریب میں اس آئین میں اسلامی احکام کے وجود میں آنے کے امکانات موجود ہوں۔ پس، اس لحاظ سے ۱۹۵۶ء کے آئین کو اسلامی جمہوریہ کا آئین کہا جا سکتا ہے کیونکہ اگرچہ وہ اپنی اصلی شکل میں اسلامی نہ تھا لیکن مستقبل میں اس میں اسلامی آئین بن جانے کی صلاحیت موجود تھی۔

دوسرا نظریہ ------ عملی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس نظریے کے مطابق کوئی بھی مبالغہ آمیز دعویٰ کرنا مسلمان کی شان کے شایاں نہیں۔ مسلمان وہ ہے جو بحیثیت انسان اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر معافی مانگتا رہتا ہے، جو مبالغہ آمیز دعوے کرنے کی بجائے عجز و انکسار سے کام لیتا ہے، زیادہ باتیں بنانے کی بجائے خاموش عمل کا قائل ہے، جس کی شخصیت "کہنے" سے نہیں بلکہ "کر دکھانے" سے ظاہر ہوتی ہے۔ خلیفہ ثانیؓ سے متعلق ایک اور روایت ہے کہ جب انہیں "خلیفۃ اللہ" کے نام سے پکارا گیا تو انہوں نے غضب ناک لہجے میں فرمایا کہ "خلیفۃ اللہ" تو صرف داؤد علیہ السلام تھے۔ پھر جب انہیں "خلیفۃ الرسول اللہ" کے نام سے مخاطب کیا گیا تو فرمایا کہ وہ تو حضرت ابوبکرؓ تھے۔ مگر جب انہیں خلیفۃ الخلیفۃ الرسول اللہ" کا خطاب دیا گیا تو خاموشی سے قبول فرمالیا۔ لیکن یہ ترکیب چونکہ بہت طویل تھی، اس لئے رائج نہ ہوئی اور مسلمان انہیں "امیر المومنین" کہہ کر پکارنے لگے۔ مگر حضرت عمرؓ نے اس لقب کو کبھی پسند نہ فرمایا۔ ان کا اعتراض تھا کہ اس لقب سے تکبر اور رعونت ٹپکتی ہے۔ یہ ہے اسلامی حقیقت پسندی کرر عجز و انکسار کی ایک مثال۔ جب ہمیں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہے تو ہمیں مبالغہ آمیز دعوے کرنے کی بجائے عجز و انکسار سے کام لینا چاہئے اور عملی طور پر ان خامیوں اور کمزوریوں کو رفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محض مبالغہ آمیز دعوے کرنے سے تو ہماری خامیوں اور کمزوریوں کا ازالہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ پس، اس نظریے کے مطابق کسی بھی

جمہوریہ کا آئین اسلامی جمہوریہ کا آئین کہلانے کا مستحق نہیں جب تک کہ وہ حقیقی معنوں میں یعنی عملی طور پر اسلامی نہ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو قوم بحیثیت مجموعی ایک مبالغہ آمیز دعویٰ کر رہی ہے جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ پس اس لحاظ سے ۱۹۵۶ء کے آئین کو اسلامی جمہوریہ کا آئین نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ اپنی اصلی صورت میں عملی طور پر اسلامی نہیں تھا۔

ان دونوں نظریوں میں سے کونسا صحیح ہے اور کونسا غلط' یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ گزشتہ دس سالوں میں اس ملک کے بیشتر سیاست دانوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے جائز و ناجائز کی تمیز کا خیال نہیں رکھا۔ چور بازاری' سمگلنگ' نااہلی' رشوت ستانی' اقربا پروری' حق تلفی' بے ایمانی' جعل سازی سب اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ ان سیاست دانوں نے جس طرح ملی اخلاق کی دھجیاں اڑائیں' اسی طرح وہ اسلام کو بھی اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال میں لانے سے باز نہیں رہے۔ ہم میں سے جس کسی نے بھی منیر کمیٹی رپورٹ کا مطالعہ کیا ہے' اسے اس تلخ حقیقت کا احساس ہے۔

پچھلے سال مارشل لاء کے نفاذ سے پیشتر' یوم اقبال کے موقع پر' میں نے آپ کے سامنے ملکی سیاست کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا:

> "ہمارے موجودہ سیاست دان ذاتی مفادات' ایک دوسرے سے حسد اور بے اعتمادی میں کچھ ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کی لغت میں "سیاست" سے مراد محض سازش' عیاری یا جعل سازی ہے جس سے اپنے حریف کو کرسی اقتدار سے گرانا یا نیچا دکھانا مقصود ہے۔ اس کشمکش میں انہیں اتنی فرصت نہیں کہ وہ ملت پاکستان کے مسائل کی طرف توجہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت پاکستان میں ایک بھی ایسی سیاسی جماعت نہیں جس کا کوئی اصول یا کوئی واضح نصب العین ہو۔ ایک طرف تو وہ سیاسی قائدین ہیں جو برسر اقتدار ہیں' اور دوسری طرف وہ سیاسی قائدین ہیں جو برسر اقتدار رہ چکنے کے بعد اب دوبارہ برسر اقتدار آنے کی فکر میں ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان پاکستان کے عوام اس مسلسل کشمکش کو ناامید' بے بس اور لاچار تماشائیوں کی طرح کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنا اقتصادی مسئلہ سلجھانے کے لئے جاگیر داری نظام میں تغیر کی کوئی صورت

اختیار کرنی پڑے گی اور مروجہ صنعتی نظام میں بھی مناسب تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ جب تک ہمارے سیاست دان خلوص دل سے ملت کے اقتصادی مسئلے کا حل پیش نہ کریں گے، یہ بے یقینی، بے اعتمادی، بے اطمینانی اور بے چینی کا دور ختم نہ ہو گا بلکہ کوئی عجب نہیں کہ اس مسئلے کے حل میں تاخیر آخر کار ہم سب کی تباہی و بربادی کا موجب بنے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس میں دہشت پسند تحریکوں کا وجود میں آنا ایک لازمی امر ہے۔ اس قسم کی تحریکوں کا تختہ ءمشق ابتدا میں عموماً سیاسی قائد بنا کرتے ہیں، لیکن جب نظم و نسق معطل ہو جاتے ہیں تو کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا۔ انجام کار یا تو کسی نہ کسی طرز کی آمریت ملک پر آ مسلط ہوتی ہے اور شخصی آزادی کا خاتمہ کر دیتی ہے یا کوئی غیر ملکی طاقت ملک پر قبضہ جما لیتی ہے۔"

بہرحال، خدا بڑا کارساز اور مسبب الاسباب ہے۔ اسے چونکہ پاکستان کی تباہی و بربادی منظور نہیں تھی، اس لئے اس نے ایک ایسی صورت پیدا کر دی جس کا کسی کو وہم و گمان تک نہ تھا۔ ملک میں ایک خاموش اور پرامن انقلاب آیا جس نے ان سیاست دانوں کو ملکی سیاست کے قرطاس پر سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کے بیشتر سیاست دانوں کے ہاتھوں جس طرح عوام کو نقصان پہنچا، اسی طرح اسلام کو بھی نقصان پہنچا۔ اب چونکہ اس ملک کی انقلابی حکومت کی ہر ممکن کوشش یہی ہے کہ ان سیاست دانوں کے ہاتھوں جو نقصان پاکستان کو بحیثیت مجموعی پہنچا ہے، اس کی تلافی کی جائے، اس لئے ہمیں ان سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ ملت کی اجتماعی زندگی میں اسلام کو اس کا کھویا ہوا مقام بھی حاصل کر کے دیں گے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں، بلکہ نہایت کٹھن کام ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے قائم کردہ کمشنوں کی طرح اگر ایک اسلامی کمشن بھی وجود میں لایا جائے تو نہایت موزوں ہو گا۔ اس کمشن کا مقصد، سوالناموں یا کسی اور ذریعے سے، ہمارے معاشرے کے اہل علم حضرات سے یہ پوچھنا ہو کہ ملت کی اجتماعی زندگی میں اسلام کا عمل دخل کس نوعیت کی اصلاحات کے نفوذ سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کمشن کی رپورٹ سے نہایت اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے لئے سب سے مقدم امر یہ ہے کہ جن بنیادی اصولوں پر پاکستان کے تخیل کی نمود ہوئی یا جس نصب العین کے تحت پاکستان کو معرض وجود میں لایا گیا، اس سے ہماری نئی

آنے والی نسلوں کو روشناس کرایا جائے تاکہ وہ نصب العین ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و برقرار رہ سکے۔ اس کے لئے ہماری غلامی کے عہد کے نصاب تعلیم کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس نصب العین کو زندہ و برقرار رکھنے کے لئے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے سرکاری اسکولوں میں مسلمان بچوں کے لئے دینیات کی تعلیم لازمی قرار دے دی جائے تاکہ وہ اپنی عمر کے اس زود اثر پذیر حصے میں قرآن مجید ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بساط کے مطابق اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے اہل ہو سکیں۔ اسی طرح ہماری یونیورسٹیوں میں بھی دینیات کے شعبے قائم کیے جائیں تاکہ جن طلبہ نے ایف اے اور بی اے میں عربی کا مضمون لے رکھا ہو' وہ اس کے ساتھ دینیات کا مضمون بھی لے سکیں۔ ایم اے میں دینیات کی تعلیم کا معیار بہت بلند اور اعلیٰ ہونا چاہئے تاکہ اس مضمون میں ممتاز و نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو اسلامی دینیات' فقہ' فلسفہ' حکمت' اخلاقیات' اقتصادیات' سیاسیات' تاریخ' ادب اور دوسرے موضوعات پر تحقیق کے کام پر لگایا جا سکے۔

اسلامی تحقیق کے ادارے کا قیام علامہ اقبال کے بہت سے خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔ گو ۱۹۵۶ء کے آئین کی شق نمبر ۱۹۷ کے تحت صدر پر لازم تھا کہ مسلم معاشرے کی صحیح اسلامی اساس پر تنظیم کے لئے اسلامی تحقیق کا ادارہ قائم کرے' لیکن اس سلسلے میں کچھ نہ کیا گیا' بلکہ جو نام نہاد ادارے قائم کیے بھی گئے' ان سے صرف چند گنے چنے خوشامد پرست افراد نے فائدہ اٹھایا۔ چونکہ ان اداروں کا ہماری یونیورسٹیوں سے دور کا تعلق بھی نہ تھا' اس لئے ہمارے طلبہ میں تخلیقی اور تعمیری تحقیق کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ دنیا کے کسی ملک کی مثال لے لیجئے' اس میں تحقیقی مرکز یا ادارے آپ کو یونیورسٹیوں ہی سے منسلک نظر آئیں گے' یونیورسٹیوں سے باہر ان کے وجود کو کوئی عملی حیثیت حاصل نہیں ہو گی۔ پس اس ملک میں مسلم معاشرے کی صحیح اسلامی اساس پر تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی تحقیق سے متعلق تمام اداروں اور اقبال اکادمیوں کو ایک علمی اسلامی مرکز کی صورت میں ہماری یونیورسٹیوں سے منسلک کر دیا جائے۔ اس مرکز کے ساتھ ایک ایسا کتب خانہ بھی قائم کیا جائے جس میں اسلامی موضوعات سے متعلق ہر قسم کی اور ہر زبان میں نئی اور پرانی کتب موجود ہوں۔ تحقیق کرنے والے طلبہ کی رہبری کے لئے چند ایسے روشن خیال اور وسیع النظر معلم جو علوم شرعیہ اور تاریخ تمدن اسلامی میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ وقت کے نئے تقاضوں پر بھی نگاہ رکھتے ہوں' مسلم ممالک سے بلوائے جا سکتے ہیں۔ اس مرکز کے طلبہ کو اپنے اپنے موضوع میں صحیح طور پر ماہر بننے کی خاطر کچھ عرصے کے لئے مختلف مسلم ممالک

میں اپنی تحقیق جاری رکھنے کے لئے بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ یوں، پاکستان میں نہ صرف فکر اسلامی کی تجدید کے امکانات پیدا ہو جائیں گے بلکہ تمدن اسلامی اس ملک میں از سرِ نو زندہ ہو جائے گا۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ علامہ کی نگاہ میں مسلمانوں کے تنزل کا باعث دراصل دنیائے اسلام میں ملائیت اور تصوف کا رائج ہونا تھا۔ ملائیت اور تصوف کے منفی اثرات کا قلع قمع کرنے کے لئے فکر اقبال کی روشنی میں ایک اصلاحی تدبیر پیش کی جا سکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انقلابی حکومت دوسرے انتظامی شعبوں کی طرح فی الفور ایک شعبہ ء امور دینیہ قائم کرے۔ جس طرح ریاست کے دوسرے انتظامی شعبے اپنی اپنی وزارتوں کے تحت اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اسی طرح شعبہ ء امور دینیہ بھی وزارت امور دینیہ کے تحت اپنے فرائض انجام دے۔

وزارت امور دینیہ پاکستان بھر کی مسجدوں کو اپنی تحویل میں لے، اور ان مساجد کی دیکھ بھال اور مرمت و تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا جائے۔ وزارت امور دینیہ کو ائمہ ء مساجد کے تقرر کے اختیارات دیے جائیں۔ ان ائمہ ء مساجد کی حیثیت سرکاری ملازموں جیسی ہو، یعنی وہ تنخواہ دار ہوں اور انہیں اپنی اپنی مسجد میں امامت، تبلیغ یا خطابت کے لئے حکومت کی جانب سے سند ملی ہو۔ کسی غیر سند یافتہ شخص کو پاکستان کی کسی مسجد میں تبلیغ کرنے یا خطبہ پڑھنے کی اجازت نہ دی جائے بلکہ کسی غیر سند یافتہ شخص کے لئے ایسا کرنا جرم قرار دے دیا جائے (اس پیش کردہ اصلاح سے یہ مقصود نہیں کہ سرکاری ائمہ ء کے سوا دینی امور کے سلسلے میں ہر کسی کے زبان کھولنے پر پابندی عائد کر دی جائے بلکہ ہر شخص کو دینی امور پر تحریر و تقریر کے ذریعے رائج قانون کی حدود کے اندر، اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی جو آزادی اب حاصل ہے، اسے برقرار رکھا جائے۔ البتہ پاکستان کی مساجد میں تبلیغ کرنے یا خطبہ پڑھنے کا اختیار صرف حکومت کی جانب سے سند یافتہ ائمہ ء ہی کو حاصل ہو)۔

اس تجویز پر ایک اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ائمہ ء مساجد کے تقرر کے اختیارات حکومت کو سونپ دیے جائیں تو ممکن ہے جس طرح ہمارے بعض سیاسی حکمرانوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انتظامیہ اور پولیس کو استعمال میں لانے سے گریز نہیں کیا، اسی طرح وہ اس طاقت کو بھی اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے لگیں اور ائمہ ء مساجد کو سرکار کی طرف سے تحریر کردہ خطبے کے سوا اور کوئی خطبہ پڑھنے کی اجازت نہ ہو۔ اس سلسلے میں اتنا عرض ہے کہ ایک طرف تو ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستان میں دین اور

مملکت ایک ہیں' اور دوسری طرف ہم دین کو مملکت کا عملی حصہ بنانے سے محض اس لئے احتراز کرتے ہیں کہ کہیں مملکت' دین کو اپنی ذاتی اغراض کی خاطر استعمال نہ کرنے لگے۔ بعض سیاسی حکمرانوں کے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر انتظامیہ اور پولیس کو استعمال میں لانے کے باوجود ہم نے ان شعبوں کو ختم کرنے کا خیال نہیں کیا کیونکہ ان شعبوں کو ختم کرنے سے کوئی بھی حکومت نہیں چلائی جا سکتی۔ بہرحال' مملکت کے مختلف شعبوں کے ارباب بست و کشاد کا فرض ملکی سیاست میں حصہ لینا نہیں بلکہ مملکت سے وفاداری کا دم بھرنا ہے۔ پس ائمہ ء مساجد کا فرض بھی یہی ہونا چاہئے کہ ملکی سیاست میں حصہ لینے کی بجائے مملکت سے وفاداری کا دم بھریں جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں ملت کی اجتماعی زندگی سے وفاداری کا دم بھرنا ہے۔ یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ سوائے اسلام کے ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہر شعبہ مملکت کا عملی حصہ ہے' لیکن باوجود اس کے کہ ہم پاکستان میں دین و مملکت کے ایک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' ہمارا دین عملی طور پر ہماری مملکت کا حصہ نہیں ہے۔ پاکستان میں ایک ڈاکٹر یا وکیل کے لئے تو سند حاصل کرنا ضروری ہے' لیکن امام مسجد کے لئے ایسی کوئی شرط نہیں!

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ برصغیر ہند میں' مسلمانوں کے دور حکومت میں' اسلام مملکت کا عملی حصہ تھا کیونکہ قضاۃ اور ائمہ ء مساجد کے تقرر کے اختیارات حکومت کو حاصل تھے' لیکن انگریزی تسلط کے دور میں اسلام کو مملکت سے خارج کر دیا گیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب پاکستان میں ہماری اپنی حکومت ہونے کے باوجود اور ہمارے اس دعوے کے باوجود کہ پاکستان میں دین و مملکت ایک ہیں' دین ہماری مملکت کا عملی حصہ نہیں ہے بلکہ ہم اپنی غلامی کے عہد کے بعض رواجات سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ دین کو مملکت کا عملی حصہ بنانے کے خیال تک سے خائف ہیں۔ مسیحی ممالک میں گو مملکت عملی طور پر 'لادین' ہے لیکن دینی امور کے تحفظ کے لئے وہاں کلیسائی نظام کی صورت میں ایک شعبہ موجود ہے جسے کلیساؤں کی دیکھ بھال کرنے یا پادریوں کے تقرر کے اختیارات حاصل ہیں۔ اسلام میں کلیسائی نظام کے شعبے کی صورت میں کسی شعبے کو وجود میں لانے کی قطعی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ہمارے نزدیک دین مملکت کا عملی حصہ ہے (یعنی مملکت سے جدا نہیں)۔ ہمارے ماضی میں دین مملکت کا عملی حصہ رہا ہے' اور اب بھی اسے مملکت کا عملی حصہ بنانے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارا یہ دعویٰ کہ پاکستان میں دین و مملکت ایک ہیں' قطعی بے بنیاد ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ائمہ ء مساجد کو دوسرے اختیارات کے ساتھ قاضی کے چند

اختیارات بھی سونپے جائیں، مثلاً وہ نکاح خوانی کے فرائض انجام دیں اور ہر نکاح جو وہ پڑھائیں اس کا اندراج ایک رجسٹر میں کریں۔ ہر مسجد کے ساتھ اگر ہو سکے تو امام کا دفتر قائم کیا جائے۔ مسجد کی دیکھ بھال اور نمازیوں کی سہولت کے لئے ذرائع فراہم کرنا امام کے ذمے ہو اور وہ اس سلسلے میں نوکر چاکر رکھنے کا مجاز ہو۔ امام اپنا ہر دینی فریضہ بلا معاوضہ ادا کرے۔ جب ہماری یونیورسٹیوں میں دینیات کا مضمون پڑھایا جانے لگے تو امام مسجد کے امیدواروں کے لئے دینیات کا گریجوایٹ ہونا شرط قرار دے دیا جائے۔

وزارت امور دینیہ پاکستان بھر کے اوقاف کو اپنی تحویل میں لے اور ان کی نگرانی کے لئے اسے ناظم مقرر کرنے کے اختیارات دیئے جائیں۔ خدمت خلق کا شعبہ جو اب وزارت صحت سے منسلک ہے، اسے وزارت امور دینیہ سے منسلک کر دیا جائے۔

وزارت امور دینیہ ملک بھر کی تمام خانقاہوں کو اپنی تحویل میں لے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے ناظم مقرر کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں سلسلۂ طریقت نے دنیائے اسلام میں بڑے بڑے اہل قلب و عرفان اولیاء اللہ پیدا کیے جن کی عظمت ان کی بزرگی، درویشی، استغنیٰ اور خدا رسیدگی میں پنہاں تھی۔ ایک وقت تھا کہ جب یہی خانقاہیں اہل علم اور اہل نظر شخصیتوں کا مرکز تھیں، لیکن اب ان کی جو حالت ہے وہ کسی کی نگاہ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ان میں سے بیشتر طرح طرح کی اخلاقی غلاظت اور گندگی سے آلودہ کر دی گئی ہیں۔ ہماری اجتماعی زندگی کے اس افسوس ناک پہلو کی طرف آج تک کسی نے دھیان نہیں دیا، مگر اب وقت آن پہنچا ہے کہ یا تو ان خانقاہوں سے منسلک متولیوں، مجاوروں، صاحبزادوں، گدی نشینوں، سجادہ نشینوں اور پیروں کی اصلاح کی جائے یا انہیں ان بزرگوں کی خانقاہوں سے اٹھوا دیا جائے۔

اگر ان بنیادوں پر جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، وزارت امور دینیہ کے وجود میں آنے کے امکانات پیدا ہو جائیں تو ہمارے دیہاتی اور شہری عوام کی زندگیوں میں ملا اور پیر، دونوں کا بے جا دخل ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک ہماری اجتماعی زندگی میں سے ملائیت اور تصوف خارج نہیں ہو جاتے، روشن دماغی اور وسیع النظری کے فروغ کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ان پیش کردہ اصلاحات کے نفوذ کے بعد جمہوری اصولوں پر جو بھی آئین مرتب کیا جائے گا، اگرچہ اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین نہ بھی ہو، وہ کم از کم حقیقی معنوں میں یا عملی طور پر کچھ حد تک اسلامی آئین کہلانے کا مستحق ہو گا۔

اقبال اور ان کے زمانے کی مسلم سیاسی جماعتیں☆

۱۸۸۵ء میں جب آل انڈیا نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تو علامہ اقبال تقریباً نو برس کے تھے۔ کانگریس کی بنیاد ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے 'ریڈیکل' اصولوں پر قائم کی گئی۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا' ہندوؤں کی اس سیاسی جماعت میں اپنی قوم کی معاشری اصلاح اور اقتصادی بہبود کے لئے روایات قائم ہونے لگیں۔ مگر برصغیر ہند کے مسلمانوں کی کیفیت ہندوؤں سے قطعی مختلف تھی۔ اسی انیسویں صدی میں انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھ سے ہندوستان کی حکومت چھینی تھی۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو "دارالحرب" قرار دیا تھا۔ مسلم مجاہدین' انگریزوں کے خلاف صوبہ سرحد میں کئی بار لڑ چکے تھے بلکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا الزام بھی مسلمانوں ہی پر عائد کیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد حکومت انگلیسیہ نے مسلم کش پالیسی اختیار کی' اور ہندو اکثریت نے سیاسی اور اقتصادی اغراض کے پیش نظر حکومت انگلیسیہ کی اس پالیسی کی حمایت کی۔

مسلمانان ہند اور حکومت انگلیسیہ کے درمیان مصالحت سرسید احمد خان کی مخلصانہ اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔ سرسید پہلے ہندی مسلمان تھے جنہیں احساس ہوا کہ ازمنہ ء وسطی کا مسلم سیاسی' معاشری' تعلیمی اور اقتصادی نظام دور جدید میں قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وقت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک جدید معاشری نظام کے قیام کی ضرورت ہے' اور جدید معاشری نظام کا قیام جدید تعلیم کے حصول کے بغیر ممکن نہیں۔ سرسید کے تجربے نے ان پر یہ حقیقت بھی واضح کر دی

☆ ۲۱ر اپریل ۱۹۶۰ء لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا گیا۔

تھی کہ ہندو اکثریت کو مسلمانوں سے قطعاً کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ ہندو تو مسلمانوں کا تعلیمی یا اقتصادی اعتبار سے آگے بڑھنا شبہے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لئے مصلحت اسی میں ہے کہ اپنی تمام تر توجہ جدید تعلیم کے حصول کی طرف مبذول کریں، اپنی مالی حالت سنواریں اور حکومت انگلیسیہ کا ساتھ کسی حالت میں بھی نہ چھوڑیں۔

پس سرسید نے کانگریس کے مقابلے پر ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانگرس قائم کی۔ ایک سال بعد انہوں نے اپنی مشہور و معروف تقریر میں مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے ان کی پوزیشن اس قابل نہیں ہے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لے سکیں نیز انہیں یہ احساس بھی دلایا کہ ہندوستان کی حکومت اگر رائے کی اکثریت کے اصولوں پر قائم کی گئی تو ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر چھا جائے گی اور مسلمان، ہندو اکثریت کے دست نگر ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں جب کانگریس تک کے زیر اثر آئی اور بمبئی میں ہندو۔ مسلم فساد ہو گیا تو سرسید نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس آف اپر انڈیا کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ سرسید کی وفات کے دو سال بعد یعنی ۱۹۰۰ء میں جب ہندوؤں نے ہندوستان میں ہندی زبان رائج کرنے کی تحریک بڑے زوروں سے چلا رکھی تھی، علی گڑھ میں اردو ڈیفنس ایسوی ایشن قائم کی گئی۔ ایک سال بعد علی گڑھ میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی گئی۔ اگرچہ یہ جماعت ۱۹۰۳ء تک زندہ رہی لیکن اس کا پولیٹکس کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔

۱۹۰۶ء میں جب امکانات پیدا ہوئے کہ حکومت انگلیسیہ ہندو اکثریت کے دباؤ کے باعث ہندوستان میں کسی نہ کسی شکل میں انتخابی اصول رائج کرنے والی ہے تو مسلمان رئیسوں اور جاگیرداروں نے جو سرسید کے سیاسی مسلک پر کاربند تھے، ایک سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔ اس جماعت کی بنیاد 'ریڈیکل' یا ترقی پذیر اصولوں کی بجائے 'کنزرویٹو' یا رجعت پسند اصول پر قائم کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کا مسلم عوام کے ساتھ کوئی ربط پیدا نہ ہو سکا البتہ ایک فائدہ ہوا، اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا اصول مان لیا گیا۔

مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کے اس دور میں جتنی بھی انجمنیں قائم ہوئیں، ان کے مقاصد محدود تھے۔ وہ صحیح طور پر سیاسی انجمنیں کہلانے کی مستحق نہ تھیں کیونکہ ان کا نصب العین

یا تو مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ اور حکومت انگلیسیہ کے ساتھ وفاداری کا دم بھرنے تک محدود تھا یا وہ ہندو اکثریت کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کے خلاف دفاعی محاذ کے طور پر وجود میں لائی گئی تھیں۔ سرسید کی زندگی میں، اور ان کی وفات کے بعد گو مسلمان رئیسوں اور جاگیرداروں کا گروہ عرصے تک ان کے سیاسی مسلک پر کاربند رہا، لیکن نوجوان عنصر نے اس سیاسی مسلک کو کچھ عرصے بعد ترک کر دیا۔

علامہ اقبال اس زمانے کے مسلمانوں کے نوجوان عنصر سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں مولانا سید میر حسن کے زیر اثر حاصل کی۔ مولانا، سرسید کی تحریک سے بے حد متاثر تھے اور علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں حصہ لے چکے تھے، بلکہ سرسید کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانگرس کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ مولانا، سرسید کے سیاسی مسلک اور اس کی مصلحت کو بخوبی سمجھتے تھے اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کی وساطت سے علامہ اقبال علی گڑھ کی تحریک سے روشناس ہوئے اور وقتی مصلحت کے پیش نظر انہوں نے سرسید کے سیاسی مسلک کو تھوڑے عرصے کے لئے قبول کیا۔

علامہ ۱۸۹۵ء میں لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ علامہ کی ایک انگریزی نوٹ بک بعنوان "افکار منتشر" اقبال کا (Stray Reflections) راقم کے پاس محفوظ ہے۔ اس ڈائری میں اندراج کے مطابق علامہ نے اسے اپریل ۱۹۱۰ء میں تحریر کرنا شروع کیا اور غالباً کچھ عرصے تک جاری رکھا۔ اس ڈائری کے بعض اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ طالب علمی کے دور میں دہریت کے مرحلے سے بھی گزرے اور اس ذہنی الجھاؤ سے انہیں ورڈز ورتھ کی تعلیمات نے نجات دلائی۔ علامہ اپنے فکری ارتقاء کے اس دور میں "وحدت الوجود" کے فلسفے سے بھی متاثر ہوئے۔ غالباً اسی دور میں انہوں نے حافظ شیرازی کا اثر بھی قبول کیا اور اپنے سیاسی نظریات کی بنیاد 'وحدت الوجود' کے فلسفے پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ علامہ نے جتنے بھی اشعار ہندی نیشنل ازم کی حمایت میں کہے، غالباً اسی دور میں لکھے گئے، مگر یہ محض ایک تجربہ تھا۔ علامہ پر "وحدت الوجود" کا رنگ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۰۵ء میں جب آپ انگلستان گئے تو "اتحاد اسلام" کی تحریک ہر پڑھے لکھے حساس مسلمان کو متاثر کر رہی تھی۔ تین سال یورپ میں قیام کے دوران میں علامہ کے خیالات میں ایک تغیر رونما ہوا۔ آپ نے "وحدت الوجود" کے فلسفے کو غیر تسلی بخش سمجھ کر ترک کر دیا اور "اتحاد اسلام" کے اصول پر اپنے سیاسی فکر کی اساس قائم کی۔ اسی دور میں آپ

"مسلم نیشنلزم" کے حامی ہوئے، اور ساری عمر اس مسلک پر قائم رہے۔

علامہ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس تشریف لائے۔ تب مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی حالت نہایت مخدوش تھی۔ یورپ کی نو آبادیاتی طاقتیں مسلم ممالک پر اقتصادی دباؤ ڈال رہی تھیں یا یکے بعد دیگرے ان پر قبضہ جما رہی تھیں۔ مشرق وسطیٰ میں "اتحاد اسلام" کا جذبہ اپنے عروج پر تھا اور جگہ جگہ مسلم وطنیت کی تحریکوں کی صورت میں رونما ہو رہا تھا۔ ان تحریکوں نے مسلمانان عالم میں حب وطن کے احساس کو بیدار کیا۔

برصغیر ہند میں ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت صرف مسلم لیگ ہی تھی جس پر حکومت انگلیسیہ کے خدمت گزار مسلمان رئیسوں اور جاگیرداروں کا تسلط تھا۔ یہ نام نہاد مسلم سیاست دان مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی کشمکش سے لاتعلقی کا اظہار کرتے تھے اور صرف اپنے مفادات کی حفاظت کے درپے تھے۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال مسلمانوں کی اس سیاسی جماعت سے وابستگی پیدا نہ کر سکتے تھے۔

مسلمانوں کی اس سیاسی جماعت کی اصلاح کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن بقول مولانا شبلی جدوجہد، سعی و کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھایا رہا۔ مسلمانوں کے رئیس اور جاگیردار سیاسی رہنماؤں میں سے ایک نے بھی ایثار نفس کی مثال پیدا نہ کی۔

مولانا شبلی نے اس زمانے کے مسلم سیاست دانوں کے نصب العین پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ان کی رائے میں ان سیاست دانوں کا منتہائے خیال مسلم قوم کو محض بی۔ اے پاس کرانا یا نوکریاں دلانا ہی تھا۔ مولانا کے نزدیک رئیسوں اور جاگیرداروں کا یہ گروہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت کا اہل نہیں تھا۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا:

> "لیڈری کے لئے وہ شخص درکار ہے جو ..... خطاب، جائداد، دولت اور تمام تعلقات سے آزاد ہو، پرجوش اور دلیر ہو۔ اس کے ساتھ پالیٹکس کا ماہر ہو اور پولیٹیکل لٹریچر کا مدتوں مطالعہ کر چکا ہو۔ اگر قوم میں ایسے شخص موجود نہیں ہیں تو لیڈری کے تخت کو اور بھی چند روز خالی رکھنا اور واقعی تخت نشینی کا انتظار کرنا چاہئے۔"

مولانا کو یہ بھی احساس تھا کہ مسلم قوم میں ابھی سیاسی شعور پیدا نہیں ہوا، اس لئے انہوں نے فرمایا:

> "سب سے بڑی اور سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ قوم میں

پالیٹکس کا مذاق پیدا کیا جائے۔ پالیٹکس ایک وسیع علم ہے۔ اس کے مسائل اور معلومات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہے۔ ان کو بقدر ضرورت اپنی زبان میں لایا جائے۔ مہمات مسائل پر رسالے اور پمفلٹ شائع کیے جائیں۔ کچھ لوگ مقرر کیے جائیں جو ملک میں دورہ کریں اور پولٹیکل مسائل پر کچھ عالمانہ لکچر دیں جو دلائل، معلومات اور اعداد پر مبنی ہوں۔"

برصغیر ہند میں مولانا پہلے مسلمان تھے جنہوں نے قوم کی توجہ مسلم کاشتکار کے افلاس کی طرف مبذول کرائی۔ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسے مسلمانوں کی سیاسی جماعت نے کبھی خیال کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوا تھا۔ مولانا کی رائے میں قوم کی قسمت کا فیصلہ کاشتکار کی اقتصادی فلاح و بہبود پر موقوف تھا۔

بہرحال، مولانا شبلی نے مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی اصلاح کے لئے جو تجاویز پیش کیں، ان پر قطعاً کوئی عمل درآمد نہ کیا گیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ بڑے بڑے رئیس اور جاگیردار جو مسلم لیگ پر چھائے ہوئے تھے، مسلم لیگ میں شامل نوجوان عنصر سے خائف رہنے لگے۔ ان دنوں مسلم لیگ میں شامل نوجوان عنصر مولانا محمد علی جیسے پرجوش، دلیر اور باغیرت قائدین پر مشتمل تھا جو مولانا شبلی کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان جوانمردوں نے قائداعظم کے زیر قیادت مسلم اور ہندو سیاسی رہنماؤں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر کھڑا کر دیا۔ ۱۹۱۶ء کا میثاق لکھنؤ اسی قربت کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس معاہدے کے باوجود مسلم لیگ اپنے دائرۂ مقاصد کو وسیع نہ کر سکی۔ اسی بناء پر مولانا محمد علی جیسے دردمند قائدین مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے ۱۹۱۹ء میں "خلافت کمیٹی" قائم کر لی۔

"خلافت کمیٹی" کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کی شکست کے باوجود مغربی نو آبادیاتی طاقتوں کو عثمانی خلافت کے برقرار رکھنے پر مجبور کیا جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر تحریک خلافت وجود میں لائی گئی۔ اس تحریک کی بنیادیں "اتحاد اسلام" کے اصول پر استوار کی گئی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی خلافت کمیٹی نے "ہندو۔ مسلم اتحاد" کا متضاد نعرہ بھی بلند کیا اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر حکومت انگلیسیہ سے ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ تحریک خلافت کا دور برصغیر ہند میں مسلم سیاست کا ایک رومانی دور تھا۔ اس دور میں دماغوں پر دل حاوی تھے۔ تحریک خلافت کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر ہند کے مسلم عوام "اتحاد اسلام" کے تصور سے روشناس ہو گئے۔ گویا "اتحاد اسلام" کے جذبے نے

انہیں سیاسی طور پر بیدار کر دیا۔ لیکن اس تحریک کا ایک منفی پہلو بھی تھا' اور وہ یہ کہ اس تحریک کے "ہندو۔ مسلم اتحاد" کے تصور نے اس وقت کے مسلم قائدین کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ کچھ مسلم سیاست دان ہندی نیشنل ازم کے ہمنوا بن کر کانگریس میں شریک ہو گئے۔ مثلاً برصغیر ہند کے چوٹی کے علماء کی جماعت (جمیعت العلماء) جو خلافت کمیٹی کے ساتھ وجود میں لائی گئی تھی' ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کانگریس کی ہمنوا بن گئی۔ بہرحال' ۱۹۲۴ء میں قائدِ اعظم نے مسلم لیگ کو از سرنو زندہ کیا' لیکن تین سال بعد یعنی ۱۹۲۷ء میں یہ سیاسی جماعت مسلمانوں کے لئے مخلوط یا علیحدہ نمائندگی پر اختلاف رائے کے باعث دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔

علامہ اقبال نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ نمائندگی کے اصول کو کبھی نہ چھوڑا۔ اس حد تک وہ سرسید کی 'رجعت پسندی' یا مسلم لیگ کے بنیادی سیاسی مسلک کے ہمیشہ قائل رہے' اگرچہ وہ مسلم لیگ سے مولانا شبلی اور مولانا محمد علی کی طرح قطعی مایوس تھے۔ علامہ نے تحریک خلافت کا ساتھ بھی صرف اس حد تک دیا کہ مسلم عوام "اتحاد اسلام" کے جذبے یا اس کی سیاسی اہمیت سے آشنا ہو جائیں۔ لیکن انہوں نے خلافت کمیٹی یا جمعیت العلماء کے "ہندو۔ مسلم اتحاد" کے سیاسی مسلک کو قبول کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ علامہ جس طرح جمال الدین افغانی کے "اتحاد اسلام" کے تصور سے متاثر ہوئے' اسی طرح انہوں نے مشرق وسطیٰ میں "مسلم نیشنلزم" کے فروغ سے بھی اثر قبول کیا۔ وطنیت کے متعلق علامہ کا بنیادی تصور یہ تھا کہ اسلام صرف ان ممالک میں وطنیت یا نیشنلزم سے متصادم ہوتا ہے جن میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں' وہاں اسلام اور وطنیت کے تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہاں تو اسلام اور وطنیت سے ایک ہی معنی اخذ کیے جاتے ہیں۔

علامہ برصغیر ہند کی مسلم سیاسی جماعتوں سے کوئی گہرا تعلق پیدا نہ کر سکے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کا نصب العین بھی وہ "کلیتہً" قبول نہ کر سکتے تھے۔ اس دور میں انہوں نے اپنا بیشتر وقت اپنے سیاسی فلسفے کی تشکیل میں صرف کیا۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۲ء تک کا دور برصغیر ہند کی سیاست کا نہایت اہم دور تھا۔ اس دور میں ہندوستان کی قسمت کا ایک مناسب حد تک فیصلہ کیے جانے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ حکومت انگلیسیہ نے ہندو اور مسلم سیاست دانوں کو دعوت دی تھی کہ وہ برصغیر ہند کا آئین مرتب کرنے کے لئے سفارشات پیش کریں' اگرچہ سائمن کمشن اپنی تجاویز مرتب

کرنے میں مصروف تھا۔ ہندو سیاست دانوں نے ۱۹۲۸ء میں نہرو کمیٹی رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کو تمام ہندو سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہوئی۔ بعد میں گول میز کانفرنسیں بھی ہوئیں۔ بہرکیف' اس دور میں ہندوؤں کی تنظیم کا تو یہ عالم تھا کہ ایک آواز بھی نہرو کمیٹی رپورٹ کے خلاف نہ اٹھتی تھی۔

لیکن اس دور کے مسلم سیاسی رہنماؤں کے ذہنوں میں جو انتشار تھا' ذرا اس کا اندازہ بھی لگایئے!

اس دور میں برصغیر ہند میں مسلم سیاسی جماعتوں کی تعداد پندرہ سے اوپر جا چکی تھی اور ہر مسلم سیاسی جماعت کا مسلک دوسری سے یا تو الٹ تھا یا مختلف تھا۔ مسلم لیگ ۱۹۲۷ء سے دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی' اس لئے مردہ تھی۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا سیشن جو علامہ اقبال کے زیر صدارت الہ آباد میں منعقد ہوا اور جس میں علامہ نے پہلی بار پاکستان کا اصول پیش کیا' اس سیشن میں لیگ کے ممبروں کی تعداد اس قدر قلیل تھی کہ کورم بھی پورا نہ تھا۔

خلافت کمیٹی کے سیاسی رہنماؤں میں بھی آپس میں اختلاف تھا' اس لئے یہ سیاسی جماعت بھی دو حصوں میں منقسم تھی۔ جمعیت العلماء کانگریس کی ہمنوا تھی' اس لئے اس جماعت کا خالصتاً" مسلم سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "مسلم نیشنل پارٹی قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں کو کانگریس کے دام میں لانا تھا۔ یہ جماعت ۱۹۳۰ء میں کانگریس میں مدغم کر دی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب میں "احرار پارٹی" کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہ جماعت جمعیت العلماء سے وابستہ تھی اور کانگریس کی ہمنوا تھی۔ ۱۹۳۱-۳۲ء میں کشمیر ایجی ٹیشن کے دنوں میں پنجاب میں اسے مقبولیت حاصل ہوئی لیکن جب اس جماعت نے لکھنؤ میں شیعہ۔ سنی فساد کروا دیا تو خاصی بدنام ہو گئی۔ قائداعظم اور تحریک پاکستان کی جتنی مخالفت اس جماعت نے کی ہے' شاید ہی کسی اور مسلم سیاسی جماعت نے کی ہو۔ ۱۹۲۹ء میں خان عبدالغفار خان نے صوبہ سرحد میں ایک سیاسی جماعت "خدائی خدمتگار" قائم کی۔ یہ جماعت بھی احرار پارٹی کی طرح جمعیت العلماء اور مسلم نیشنل پارٹی کے زیر اثر اور کانگریس کی ہمنوا تھی۔ بعد میں یہ جماعت کانگریس میں مدغم کر دی گئی۔ ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ کے شیعہ مسلمانوں نے "شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ یہ جماعت مسلم لیگ کی مخالف مگر کانگریس کی حامی تھی اور شیعہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ نمائندگی کی طلب گار تھی۔ بلوچستان میں "وطن پارٹی" قائم کی گئی۔ یہ جماعت بھی کانگریس کی ہمنوا تھی۔ کشمیر ایجی ٹیشن کے دنوں میں شیخ محمد عبداللہ نے جموں اور کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ بعد میں یہ جماعت

بھی کانگریس کی ہمنوا بن گئی۔ ۱۹۱۳ء میں عنایت اللہ خان مشرقی نے پنجاب میں "خاکسار پارٹی" قائم کی۔ یہ جماعت ایک فوجی قسم کے نظام پر مبنی تھی اور کسی دوسری مسلم سیاسی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا اس کے پروگرام سے خارج تھا۔

ان مسلم سیاسی جماعتوں کے علاوہ اس دور میں چند جماعتیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ مثلاً کلکتہ میں "مومن کانفرنس" کانگریس کی حامی تھی۔ بنگال میں مولوی فضل حق نے غریب اور قلاش مسلم کاشتکاروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے "مسلم پرجا پارٹی" بنا رکھی تھی۔ مگر پنجاب میں امیر اور صاحب ثروت جاگیر داروں کے حقوق کے تحفظ کے لئے میاں فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ اس دور میں اور بھی چند مسلم سیاسی جماعتیں موجود تھیں جن کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کی اس تعداد سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور کے مسلم سیاسی رہنماؤں کے ذہنی انتشار کی کیا کیفیت تھی۔ ایسی صورت میں مسلم عوام اپنے سیاسی قائدین سے کیا توقع رکھ سکتے تھے! مسلم سیاسی جماعتوں کے قائدین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے اگرچہ ۱۹۲۹ء میں مسلم کانفرنس وجود میں لائی گئی لیکن اس کوشش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ علامہ اقبال اس دور کی مسلم قیادت سے نہایت مایوس تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ایک تقریر کے دوران میں انہوں نے مایوسی کے عالم میں فرمایا:

> "ہم بڈھوں کے لئے یہ نہایت شرم کا مقام ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسل کے نوجوانوں کو اس اقتصادی' سیاسی اور دینی کشمکش کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنے میں ناکام رہے ہیں جو مستقبل قریب میں انہیں پیش آنے والی ہے۔ ساری کی ساری قوم کی موجودہ ذہنیت میں انقلاب لایا جانا از بس ضروری ہو گیا ہے کیونکہ اس انقلاب کے بغیر مسلم قوم اپنے قلب میں نئے جذبوں اور نئی تمناؤں کی پرورش نہیں کر سکتی۔ مسلمان اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنا سراغ پانے کا اہل نہیں رہا . . . . . وہ لوگ جنہیں مسلمانوں کی سیاسی قیادت حاصل ہے' اور جو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں ان کی رہنمائی کر رہے ہیں' ابھی تک ان کے ذہنوں میں انتشار ہے . . . . گو عوام میں قربانی کے جذبے کا فقدان نہیں ہے۔ پچھلے چند سالوں کے واقعات شاہد ہیں کہ قوم کی رہنمائی کسی قابل قبول اصول

کے ماتحت نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ خود ہماری سیاسی جماعتوں کے اندر اختلاف اور تضاد کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔"

علامہ نے مسلمانوں کی تنظیم نو کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے فرمایا "مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا نام خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس کا اساسی دستور ایسا ہونا چاہئے کہ ہر قسم کے سیاسی فکر کو ابھرنے کا موقع مل سکے۔" آپ نے کہا "میرا مشورہ یہ ہے کہ ملک کے اندر نوجوانوں کی جماعتیں اور والنٹیروں کے دستے قائم کئے جائیں جو اپنی تمام تر توجہ خدمت خلق، رسومات اور قصبوں اور دیہات میں اقتصادی پروپیگنڈے پر صرف کریں۔" علامہ نے دیہاتی اقتصادیات کی تباہی اور اجناس کی تجارت پر جس سے کاشتکار ہمیشہ جاگیردار کا شکار بنا رہتا ہے، تشویش کا اظہار کیا اور فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے مستقبل کا انحصار کاشتکاروں کی آزادی پر ہے۔" علامہ نے فرمایا "تمام بڑے قصبوں میں مردوں اور عورتوں کے ادارے قائم کیے جائیں جو آئندہ نسل کی خوابیدہ قوتوں کو مجتمع کریں، عوام کو اسلام کی گزشتہ فتوحات یاد دلائیں اور یہ بتلائیں کہ عالم انسانیت کی دینی اور تمدنی زندگی کے ارتقاء کے سلسلے میں ابھی اسلام کو کیا کچھ کرنا ہے۔ عوام کی ترقی پذیر صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ ان کے سامنے کوئی نیا کام رکھا جائے جو فرد کو پوری جماعت پر نظر ڈالنے اور سمجھنے کی توفیق بخشے۔ جب یہ قوتیں ایک بار بیدار ہو جائیں تو وہ اپنے ساتھ نئی کشمکش کے لئے تازہ دم لاتی ہیں۔"

چار سال بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں قائداعظم نے علامہ کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا۔ انہوں نے اپنی سعی و کوشش، قوت عمل اور ایثار نفس کے بل بوتے پر مسلم لیگ کو حقیقی معنوں میں زندہ کیا اور اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس بیکار شے کو ایک عوامی جماعت کی صورت میں منتقل کر دیا۔ قائداعظم نے پاکستان کا نصب العین پیش کر کے عوام کے سامنے ایک نیا کام رکھا۔ اس نئے مقصد کے حصول کے لئے عوام کی ترقی پذیر صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ نئی کشمکش اپنے ساتھ تازہ دم لائی۔

تاریخی واقعات کی یہ پیش کردہ تفصیل ہمیں دو سبق سکھاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ علامہ نے اپنے سیاسی فکر کی اساس ہمیشہ روحانی قدروں پر قائم کی۔ انہوں نے سیاست کو دینی قدروں سے الگ کر کے کبھی قبول نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو سیاست دین سے جدا ہو، علامہ کی نگاہ میں چنگیزی ہے۔ دوسرا سبق یہ کہ علامہ کے نزدیک کسی قوم میں سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد جمہوریت کی طرف نہیں بلکہ اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس قوم کے

سیاسی رہنماؤں کے ذہنوں میں انتشار ہے۔ مسلمانوں کی گزشتہ نصف صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد برصغیر ہند کی مسلم سیاست میں سوائے انتشار اور بے ترتیبی پھیلانے کے اور کسی صورت میں بھی ممد ثابت نہیں ہوئی۔

یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہم نے یا ہمارے سیاسی رہنماؤں نے اپنی گزشتہ سیاسی تاریخ سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ گزشتہ دس پندرہ سالوں میں اس ملک میں سیاسی جماعتوں کی تعداد کچھ اس انداز سے بڑھی اور انتشار یا بے ترتیبی یوں پھیلی کہ ۱۹۳۲ء کے مسلم ہند کی یاد تازہ ہو گئی۔ پاکستان میں ایک سے زائد سیاسی جماعتوں کا وجود اگرچہ جمہوری اصولوں کے عین مطابق سمجھا گیا، مگر بدقسمتی سے ان کثیر التعداد جماعتوں میں سے ایک بھی ایسی جماعت نہیں تھی جس نے ہمارے مسائل کے حل کی کوئی واضح صورت پیش کی ہو۔ سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد سیاسی عدم استحکام کا موجب بنی۔ انجام کار اس ملک میں انقلاب آیا اور سیاسی جماعتیں اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔

جو قومیں اپنی تاریخ سے سبق سیکھنے کی اہل نہیں، انہیں اپنی گزشتہ غلطیوں کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے، وہ اپنے ماضی کی خامیوں کا ازالہ کر کے ترقی کی منازل پر کیونکر گامزن ہو سکتی ہیں۔ دنیا کے جن ممالک میں جمہوری نظام قائم ہے، وہاں کے باشندوں نے اس نصب العین کو اپنے تاریخی تسلسل میں بتدریج حاصل کیا۔ اور بعض قوموں کو تو اس نصب العین کے حصول کے لئے صدیوں تک تگ و دو جاری رکھنی پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دنیا کے جمہوری ممالک میں اب فرد سیاسی طور پر اس قدر بیدار ہے کہ ان ممالک میں سیاسی جماعتوں کی تعداد اگر کثیر بھی ہو تو ان جماعتوں میں سے صرف دو یا تین کو اکثریت کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

اگرچہ برطانیہ یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سیاسی جماعتوں کے قیام، ان کی تنظیم یا تعداد پر کوئی آئینی پابندی عائد نہیں ہے اور وہاں بیسیوں سیاسی جماعتیں ابھرتی یا ڈوب جاتی ہیں، لیکن ان ممالک کے افراد آئینی روایات کے اس قدر پابند ہیں کہ صرف دو یا تین سیاسی جماعتوں کو ہی عوام میں سے اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ باقی جماعتوں کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح ان ممالک میں کسی سیاسی جماعت کا رکن اگر اپنی جماعت تبدیل کرنا چاہے تو بھی اس سلسلے میں آئینی روایات کی پابندی ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ گو ایک

سیاسی جماعت تبدیل کر کے دوسری جماعت کی رکنیت اختیار کرنے کے سلسلے میں ان ممالک میں کوئی امتناعی قانون موجود نہیں بلکہ اس سلسلے میں فرد کو کامل آزادی حاصل ہے' پھر بھی ان ممالک میں کسی سیاسی جماعت کا رکن وقتی ضروریات کے پیش نظر یا ذاتی مفاد کی خاطر گرگٹ کی طرح یکایک رنگ نہیں بدلتا اور اچانک فرش عبور کر کے دوسری جماعت کی صفوں میں نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اگر اسے جماعت تبدیل کرنا مقصود ہو تو پہلے اپنی سیاسی جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دیتا ہے' پھر دوسری جماعت کے ٹکٹ پر انتخاب لڑتا ہے' اور کامیابی نصیب ہو جائے تو دوسری جماعت کی صفوں میں بیٹھتا ہے۔ پس' ان ممالک میں جمہوریت ذہنی انتشار' بے ترتیبی یا سیاسی عدم استحکام کی کیفیت اس لئے اختیار نہیں کرتی کیونکہ افراد آئین کی جمہوری روح کو برقرار رکھتے ہوئے آئینی روایات کے پابند رہتے ہیں' اور گو آئینی روایات کو قوانین کی پوزیشن حاصل نہیں ہے تاہم عملی مقاصد کے لئے جس طرح ان کا احترام کیا جاتا ہے' اس سے ظاہر ہے کہ ان کو بھی ایک لحاظ سے قوانین ہی کا مقام حاصل ہے۔

اکثر سننے میں آیا ہے کہ پاکستان میں آئین کے نفاذ پر مارشل لاء ختم کر دیا جائے گا اور سیاسی جماعتوں پر سے تمام پابندیاں ہٹا لی جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی انقلابی حکومت اس ملک میں جس قدر جلد ممکن ہو سکے' جمہوری نظام کو قوی اور مضبوط بنیادوں پر از سر نو بحال کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال' مسلمانوں کی گزشتہ سیاسی تاریخ کے تلخ تجربوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ چونکہ اس ملک کے سیاسی رہنماؤں میں سے بیشتر میں آئینی روایات کا پابند رہنے کا رواج نہیں اور نہ ہی اس ملک میں دوسرے جمہوری ممالک کی طرح ابھی تک رائے عامہ کو قوت حاصل ہے' اس لئے پاکستان میں جمہوری نظام کے تحفظ اور بقا کے لئے لازم ہے کہ آئینی روایات کو آئینی قوانین کی شکل دے دی جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس ملک میں جمہوری تجربے کی ناکامی کا ایک باعث سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد تھی جس کی وجہ سے ملک میں سیاسی عدم استحکام کی کیفیت طاری ہو گئی' پس آئین کی کسی نہ کسی شق کے تحت اس ملک میں کل پاکستان اصول پر فی الحال صرف دو ایسی سیاسی جماعتوں کا احیاء عمل میں لایا جائے جو پاکستان کے بنیادی تصور پر ایمان رکھتی ہوں' جو ملی اساس پر قائم ہوں یا جن کا نصب العین ملی مفاد ہو۔ نسلی' لسانی' علاقائی' طبقاتی اور مخصوص مفادات یا ہنگامی حالات کے تحت جماعتوں اور تحریکوں کو ہرگز معرض وجود میں نہ آنے دیا جائے۔ اسی طرح آئین کی کسی نہ کسی شق کے ذریعے یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ آئندہ کی نیشنل اسمبلی

کا کوئی رکن اگر جماعت تبدیل کرنا چاہے تو پہلے اپنی سیاسی جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے، پھر دوسری جماعت کے ٹکٹ پر انتخاب لڑے، اور اگر کامیاب ہو جائے تو اسے دوسری جماعت کے رکن کی حیثیت سے اسمبلی میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔

جس طرح اور معاملوں میں ملت پاکستان کا تحفظ پاکستان کی بقا کے لئے لازم ہے، اسی طرح پاکستان کے عوام کو بدنیت سیاستدانوں سے محفوظ رکھنا اور مخلص اور دیانت دار سیاستدانوں کے لئے قوم کی خدمت کرنے کے مواقع فراہم کرنا بھی اس ملک میں جمہوری نظام کی بقا کے لئے نہایت ضروری ہے۔ سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد جمہوری نظام میں ہمیشہ سیاسی عدم استحکام کا سبب بنتی ہے جیسا کہ ہمارے گزشتہ سیاسی تجربے سے واضح ہے۔ پس، پاکستان کے نئے آئین میں اگر ان خدشات کے تدارک کا سامان نہ کیا گیا تو کچھ عجب نہیں کہ اس ملک میں سیاسی جماعتوں کی کثرت تعداد ایک بار پھر سیاسی عدم استحکام کی کیفیت پیدا کر دے اور پاکستان کو ایک بار پھر انقلاب کی ضرورت محسوس ہو۔ قوموں کی زندگی میں انقلاب صرف ایک بار ہی آئے تو اچھا ہے۔ اس تجربے کو بار بار دہرانا بجائے خود نقصان دہ ہے!

○

علامہ اقبالؒ کا تصور جمہوریت اور موجودہ صورتحال☆

حضرت علامہ اقبالؒ نے علی گڑھ کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ کئی خامیوں کے باوجود جمہوریت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اسی طرح انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر مسلم ممالک میں صحیح طرز کی جمہوریت کا انعقاد ہو سکے تو یہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع ہو گا۔ حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک جمہوریت کی خامیاں کیا ہیں اور صحیح جمہوریت کیا ہے' یہ سوال غور طلب ہے۔ جہاں تک جمہوریت کی خامیوں کا تعلق ہے' انہوں نے ہمیں تین قسم کے جمہوری نظاموں سے گریز کرنے کو کہا ہے:۔

اول۔ ان کے خیال میں غیر منظم اور فاقہ کش یا پسماندہ ممالک میں جمہوریت کا انعقاد بڑی احتیاط سے کرنا چاہئے' اور احتیاط سے ان کی مراد یہی ہے کہ سیاسی جماعتیں جو انتخابات لڑیں' ان سب کو قومی نظریے کا پابند ہونا چاہئے اور ان کے نصب العین اسی قومی نظریے کے تحت ترتیب دیئے جانے چاہئیں۔ اگر ایسی صورت نہ ہو تو ایسے ممالک میں جمہوریت کا انعقاد سیاسی عدم استحکام' معاشی تباہ حالی اور قومی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

دوم۔ اگر کسی ملک میں کسی ایک سیاسی جماعت کو اتنی اکثریت دے دی جائے کہ یک جماعتی حکومت کا قیام وجود میں آ جائے تو ایسی جمہوریت ان کی نگاہ میں جمہوری قبا میں دیو

☆ "نوائے وقت" ۱۷ مئی ۱۹۹۰ء

استبداد کو وجود میں لانے کے مترادف ہو گی۔ بالفاظ دیگر ایسا جمہوری نظام دراصل جمہوری آمریت کی شکل اختیار کرے گا جو حقیقی جمہوریت کی نفی ہو گی۔

سوم۔ اگر کسی جمہوری نظام میں امیدوار کے حق میں رائے کا اظہار کرتے وقت محض "سر گننے" پر اکتفا کیا جائے اور امیدوار کو "تولنے" کی ضرورت محسوس نہ ہو تو یہ صورت بھی خطرناک نتائج کی حامل ہو گی کیونکہ اس طرح کسی جمہوری ملک میں یا تو کوئی نہ کوئی مافیا اقتدار حاصل کر لے گا یا بکاؤ مال منتخب ہو کر آئے گا جو اسمبلیوں کو "بکرمنڈیوں" میں تبدیل کر دے گا یا نااہل لوگ حاکم بن جائیں گے۔ اور بقول اقبال اگر اس طرح کسی ملک کے عوام دو سو گدھوں کو منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیج دیں تو بھی ایک انسان کی عقل ایسے منتخب اداروں میں موجود نہ ہو گی۔

پاکستان کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے آج تک جمہوریت کے انعقاد کے سلسلے میں جو بھی تجربے اب تک کئے ہیں، وہ بالکل وہی ہیں جن سے ہمیں حضرت علامہ گریز کرنے کو کہتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان جمہوری اصولوں کے تحت ہی وجود میں آیا، لیکن اس وقت اسے ایک منظم سیاسی جماعت مسلم لیگ کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ یہ سیاسی جماعت نہ صرف منظم تھی بلکہ اس کی قیادت محض سیاست دانوں کی بجائے ایسے سیاسی مدبروں کے ہاتھ میں تھی جن کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا۔ اس نصب العین کی اساس ایک مضبوط نظریے پر قائم کی گئی تھی۔ پاکستان کا قیام قائداعظمؒ کی قیادت کا ایک کرشمہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس صحیح جمہوریت کے انعقاد کی طرف توجہ کرنی چاہئے جس کے اصول ہمیں علامہ اقبالؒ کی تعلیمات میں ملتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک ملک میں بے شک متعدد جماعتی نظام رائج ہوں لیکن دو بڑی منظم سیاسی جماعتوں کے قیام کی اشد ضرورت ہے جو ایک دوسرے کا احترام کریں۔ ایک اگر اقتدار میں ہو تو دوسری اقتدار کی منتظر رہے اور مخالفت برائے مخالفت کا طریقہ اپنانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ سیاسی جماعتیں پاکستان کی نظریاتی اساس کی علمبردار ہوں۔ تیسرے یہ کہ سیاسی جماعتوں کا انحصار شخصیت پرستی پر نہ ہو اور موروثی سیاست کا خاتمہ کیا جائے، کارکنان پر اعتماد کیا جائے اور انہی کے مشورے سے امیدواروں کی نامزدگی کی جائے۔ مخصوص جاگیردار خاندانوں کے افراد کو، جو مختلف لیبل لگا کر اقتدار حاصل کر سکتے ہیں، سیاست سے نکالنے کی تحریک چلائی جائے۔ چوتھے یہ کہ سیاسی نمائندے اسمبلی کی ایک ٹرم یعنی پانچ سال کی مدت تک منتخب سمجھے جائیں۔ اس کے بعد انہیں انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑا نہ ہونے دیا

جائے۔ سیاسی جماعت کو چھوڑنے (جسے ڈیفیکشن یا فلور کراسنگ کہتے ہیں) سے متعلق قانون کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اور اگر یہی صورت قائم رہی تو ارکان اسمبلی کی سیاسی بھیڑ بکریوں کی خرید و فروخت رک سکتی ہے اور یہ بکر منڈی بند کی جا سکتی ہے۔

پانچویں یہ کہ پبلک مینڈیٹ یا عوامی اعتماد کا احترام اس حد تک کیا جائے کہ جو سیاست دان اس کے خلاف عمل کرنے کی کوشش کرے، اس پر آئین کی اس شق کا جو غداری سے متعلق ہے، اطلاق ہو سکے۔ اس شق کے مطابق آئین کو کالعدم قرار دینے والے شخص کے خلاف غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم جمہوریت کے انعقاد کے سلسلے میں نیک نیت ہیں تو آئین کی شق میں یہ اضافہ کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ عوامی اعتماد کے خلاف عمل کرنے والے کو جمہوریت سے غداری کے الزام کا مرتکب قرار دیا جائے۔ اور اس کے خلاف بھی مقدمہ چلایا جا سکے تاکہ ایسے غدار کو موت کی سزا دی جا سکے۔

چھٹے یہ کہ انتخابی حلقوں کے عوام کی تربیت میڈیا کے ذریعے کی جائے یعنی ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات عوام کو تلقین کریں کہ ووٹ ڈالتے وقت امیدوار کے حق میں صرف گننے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اسے تول کر ووٹ ڈالیں۔

ساتویں یہ کہ باربار انتخابات کرائے جائیں تاکہ مال دار امیدواروں کو دولت کے بوجھ سے ہلکا کیا جا سکے یہ باربار انتخابات غریبوں کے لئے معاشی بہبود کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں کیونکہ اگر غریب عوام کی بہتری کے لئے کوئی مثبت خرچ ہوتا ہے تو وہ امیر امیدوار انتخابات ہی کے موقع پر کرتے ہیں۔ لہٰذا عوام کی معاشی بہبود کی خاطر کچھ مدت تک یعنی دس سے پندرہ سال تک باربار انتخابات کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

اگر ہم حضرت علامہ کے منشا کے مطابق یہ اقدامات کرنے کے قابل ہو سکیں تو ملک میں صحیح، جدید، اسلامی، فلاحی جمہوریت کے انعقاد کے قابل ہو سکیں گے۔ صرف اسی طریقے سے جمہوریت ہمیں کچھ دے سکتی ہے، دیگر طریقوں سے وہ ہر دفعہ ہم سے کچھ نہ کچھ لیتی ہی چلی جائے گی۔ جمہوریت کے دو تجربوں سے ہم نقصان اٹھا چکے ہیں، اب تیسرا تجربہ کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے گزشتہ تجربوں سے سبق نہ سیکھا تو یہ تیسرا تجربہ بھی ہمیں پہلے تجربوں کی طرح کسی نہ کسی طرح لے بیٹھے گا۔

یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ پاکستان کو جمہوریت نے توڑا یا عسکریت نے؟ اصل

ذمہ دار کون ہے' اور کیا طویل ضیائی مارشل لاء کے بعد کی جمہوریت بھی ملک کو تباہی کے کنارے پر نہیں لے جا رہی۔

میں سمجھتا ہوں' پاکستان بننے کے بعد اس ملک میں اگر صحیح انتخابات ہوئے تو تقریباً ۲۴ سال بعد' یعنی ۱۹۷۱ء میں ہوئے۔ لیکن ان انتخابات کے نتیجے میں کیسی جمہوریت وجود میں آئی!۔یہ وہی صورت تھی جس کے متعلق علامہ نے فرما رکھا تھا کہ کسی پسماندہ ملک میں جمہوریت کا انعقاد اگر احتیاط سے نہ کیا جائے تو سیاسی عدم استحکام' معاشی تباہ حالی اور قومی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ بس اس تجربے نے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اسے توڑ کر رکھ دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان عسکریت نے توڑا' لیکن بعض کی رائے میں جمہوری قیادت ہی اسے توڑنے کا سبب بنی۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ پاکستان فوج نے توڑا یا جمہوریت نے۔ پاکستان ٹوٹنے کے وقت جنوبی ایشیا میں تین اہم شخصیات: مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو' مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان اور بھارت میں شریمتی اندرا گاندھی کو سربراہی حاصل تھی۔ تینوں کا انجام نہایت عبرت ناک ہوا۔ چوتھی شخصیت جس نے اس ڈرامے میں اہم کردار ادا کیا' وہ جنرل یحییٰ خان کی شخصیت تھی جنہیں قدرتی موت نصیب ہوئی۔ اگر پاکستان توڑنے کے ملزم جنرل یحییٰ خان ہی تھے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قدرتی موت مروا کر اس جرم کی سزا دی اور باقی تین شخصیات ذوالفقار علی بھٹو' شیخ مجیب الرحمان اور شریمتی اندرا گاندھی جو قطعی معصوم تھیں' انہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کا انعام دیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں ہم ذوالفقار علی بھٹو کو شہید کہتے ہیں اور بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمان کو بھی شہید کہا جاتا ہے' اگر یہ سیاسی شہدائے پاکستان ہیں تو بے چاری شریمتی اندرا گاندھی کا کیا قصور ہے کہ پاکستان کو توڑنے کے ڈرامے میں ان کے ملوث ہونے کے سبب ان کا شمار شہیدوں میں نہ کیا جائے۔

تو یہ ایک صورت جمہوریت کے انعقاد کی تھی جس سے ہم ملک تڑوا بیٹھے۔ دوسری صورت پاکستان میں ایک جماعت پی پی پی کا اقتدار حاصل کرنا تھا۔ ہم نے اتنی اکثریت سے اس سیاسی جماعت کو یہ اقتدار سونپا کہ دوسری جماعتیں بے حیثیت ہو گئیں۔ جمہوریت کی شکل میں ملک بھر میں ایک آندھی چلی تھی جس نے اقتدار حاصل کر لیا' اور یہ اقتدار اس ملک میں جمہوریت کا نہیں بلکہ جمہوری آمریت کا اقتدار تھا۔ اس نظام کا قلع قمع مخالف سیاسی جماعتوں کے اجتماع نے نظام مصطفیٰ کی تحریک چلا کر اور ملک میں ضیائی مارشل لاء لگوا کر کیا۔

بالآخر ملک کے وزیراعظم کو پھانسی پر چڑھایا گیا' اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جسے قوم کا ضمیر آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ لیکن ہم نے ان دونوں تجربوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔

یہ نتائج تو ۱۹۷۱ء کے انتخابات کے تھے' اب ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات کی طرف آیئے اور دیکھنے کی کوشش کیجئے کہ جمہوریت کے سلسلے میں ہمارا تیسرا تجربہ کس نوعیت کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں کے یا آزاد امیدواروں کو محض سلوگن پر ووٹ دیئے ہیں اور ان میں سے ہر فرد کو تولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہرحال' نتیجے میں پبلک مینڈیٹ یا عوامی اعتماد منقسم شکل میں سامنے آیا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ پنجاب مرکزی حکومت کے ساتھ نہیں ہے۔ اسی طرح رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بلوچستان بھی مرکزی حکومت کے ساتھ نہیں ہے۔ صوبہ سرحد میں بڑی مشکل سے جوڑ توڑ کر کے مرکزی حکومت کی حمایت میں صوبائی حکومت بنی ہے۔ چونکہ پبلک مینڈیٹ منقسم ہے' اس لئے مرکزی حکومت کا مخالف صوبائی حکومتوں سے تصادم ہے۔

قائداعظم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ پنجاب پاکستان کا دل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دل مرکزی حکومت کے ساتھ نہیں' اور اگر دل مرکزی حکومت کے ساتھ نہیں تو یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ مرکزی حکومت پاکستان کی کمزور ترین مرکزی حکومت ہے۔ اب ملک میں جمہوریت کے انعقاد کا دوسرا سال ہے لیکن ابھی تک مرکز میں کوئی قانون سازی نہیں ہو سکی۔ مرکز اور پنجاب کے تصادم کے سبب کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی ترقیاتی کام نہیں ہو رہے۔ بے روزگاری اور گرانی روز بروز بڑھ رہی ہے اور غریب کی حالت بہتر ہونے کی بجائے پہلے سے بھی ابتر ہو رہی ہے۔ متحارب حکومتیں آئے دن ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جلسوں پر اربوں روپے خرچ کر رہی ہیں۔ دونوں گروہ پبلک مینڈیٹ حاصل کرنے کے باوجود ان کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ تصادم کی فضا سے منتخب اراکین قومی و صوبائی اسمبلی کی خرید و فروخت کا بازار گرم ہے اور ان میں سے اکثر کی بدعنوانیوں کا ذکر صرف قومی اخبارات ہی میں نہیں بلکہ بین الاقوامی رسائل میں بھی ہو رہا ہے۔

پبلک مینڈیٹ کا منقسم ہو کے ظاہر ہونا کوئی انوکھی بات نہیں' ایسی صورت کئی جمہوری ملکوں میں پیدا ہوتی رہی ہے اور انہوں نے اس مسئلے کے کئی طریقے بھی وضع کر رکھے ہیں

پہلا یہ کہ پبلک مینڈیٹ کا احترام کیا جائے اور مرکزی یا صوبائی حکومتیں ایک دوسرے

کو تسلیم کریں اور انہیں اپنا اپنا کام کرنے دیں تاکہ عوام کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ آخر عوام ہی نے تو انہیں منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجا ہے۔

دوم یہ کہ دو بڑی سیاسی جماعتیں آپس میں عظیم تر اتحاد یعنی گرینڈ الائنس قائم کر کے اقتدار سنبھال لیں جیسے مغربی جرمنی یا اسرائیل میں ہوا۔۔۔۔ اور

سوم یہ کہ قومی حکومت یا نیشنل گورنمنٹ کو وجود میں لایا جائے جس میں ہر کامیاب سیاسی جماعت کو اس کی کامیابی کے تناسب کے اعتبار سے شامل کیا جائے جس طرح جنگ کے ایام میں برطانیہ نے پارلیمنٹ کی ساری جماعتوں پر مشتمل حکومت چرچل کی زیر قیادت بنا دی تھی اور ایمرجنسی کے سبب ملک میں کوئی حزب اختلاف باقی نہ رہ گئی تھی۔

لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ عیسائی اور یہودی تو عوامی فلاح و بہبود کے لئے پبلک مینڈیٹ کا احترام کرتے ہوئے اکٹھے ہو سکتے ہیں' لیکن مسلمانوں کو یہ توفیق حاصل نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں پبلک مینڈیٹ کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ مرکزی حکومت کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کے دل پنجاب میں چھرا گھونپ دے' اور پنجاب کی حکومت نے مرکز کی گردن دبوچ رکھی ہے تاکہ اس کا گلا گھونٹ دے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے جلسوں پر دولت لٹائی جا رہی ہے۔ ممبران اسمبلی کی خرید و فروخت جاری ہے۔ کوئی فلور کراسنگ کر کے پھدک کر اس ٹہنی پر بیٹھ رہا ہے اور کوئی اس ٹہنی پر بیٹھ رہا ہے۔ آئے دن ضروریات زندگی پٹرول' بجلی اور گیس کے نرخ بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ سیاست ایک قسم کی تجارت یا انڈسٹری بن کر رہ گئی ہے جس میں سیاست گری میں تو سونا ہی سونا ہے مگر مار غریب عوام کو پڑ رہی ہے۔ ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ ان غریبوں کو معلوم بھی نہیں یا احساس بھی نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

مرکزی حکومت کے کمزور ترین حکومت ہونے کے سبب کسی بھی مسئلے پر ہمارا کوئی بھی مضبوط قومی موقف نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو وہ ہمارا ازلی دشمن بھارت ہے۔ ہم پر آج تک یہ واضح نہیں ہوا کہ افغانستان اور مسئلہ ء کشمیر کے متعلق ہمارا قومی موقف کیا ہے۔ کشمیری مسلمان اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں' لیکن ہم اسلامی ملکوں کو بھی ان کے حق میں اپنے ساتھ جمع نہیں کر سکے۔ بھارت بار بار ہمیں جنگ کی دھمکیاں دیتا ہے لیکن ہمارا رویہ معذرت خواہانہ ہے۔ لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی سیاسی انتشار کا تعلق ہے' وہاں ہمارا رویہ ایک دوسرے سے معذرت خواہانہ کی بجائے جارحانہ ہے۔ بالفاظ دیگر ہم مرکز اور صوبائی تصادم میں تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہیں لیکن

دشمن کے سامنے بھیگی بلی بنے ہوئے ہیں۔ پاکستانی فوج کے سربراہ بھارت کے جنگی ارادوں کے پیش نظر وقتاً" فوقتاً" ملک کے سیاست دانوں کو خبردار کرتے رہتے ہیں لیکن ان کی باتوں پر آج تک کسی نے بھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔

بعض دردمندوں کا خیال ہے کہ جس جمہوری تصادم میں پاکستان اس وقت مبتلا ہے' یہ مرض بالآخر ہمیں مارشل لاء کی طرف لے جائے گا۔ دیگر احباب یہ سمجھتے ہیں کہ عوام چونکہ دونوں متحارب فریقوں سے بیزار ہیں' اس لئے کوئی تیسری سیاسی قوت منظر عام پر آئے گی اور اقتدار سنبھال لے گی۔ میرے خیال میں یہ دونوں قیاس آرائیاں درست ہیں۔ ملک میں اگر کوئی تیسری منظم قوت موجود ہے تو وہ یقیناً فوج ہے۔ اور میں یہ بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر بھارت کی طرف سے جنگ کا خطرہ ہوا تو دونوں سیاسی متحارب فریق جو اس وقت اگرچہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں' حب الوطنی کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے' فوج کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور ہوں گے ورنہ دونوں اپنی اپنی سیاسی موت خود مر جائیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مارشل لاء لگنے کا امکان اس لئے نہیں ہے کہ آئین پاکستان کے تحت صدر پاکستان اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کر کے صورت حال بدل سکتے ہیں۔ آئین کے تحت اگر ملک میں سیاسی' معاشی اور نظم و ضبط کا بحران پیدا ہو جائے تو صدر اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے قومی و صوبائی مجالس کا کالعدم قرار دے سکتا ہے اور حکومتوں کو خارج کر کے مرکز اور صوبوں میں نگران حکومتیں قائم کی جا سکتی ہیں جو ایک متعین وقت کے اندر اس ملک میں دوبارہ انتخابات کرانے کا انتظام کر سکتی ہیں۔ یقینی امر ہے کہ صدر ایسے خصوصی اختیارات فوج کے تعاون ہی سے استعمال کریں گے۔ چونکہ اگر اس منظم تیسری قوت کا تعاون انہیں حاصل نہ ہو گا تو صدر کے کسی بھی حکم کے "دانت" نہیں ہوں گے۔ میرے قیاس کے مطابق یہی ایک صورت ہے جو اس جمہوری بحران کو ختم کرنے کے لئے بالآخر اختیار کرنی پڑے۔ مگر یہ صورت کب اختیار کرنی پڑے گی' اس کے متعلق کچھ کہہ سکنا ممکن نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ان خصوصی اختیارات کو استعمال میں لانے کے لئے شرائط تو اب بھی موجود ہیں' ملک میں سیاسی تعطل ہے' معاشی حالت ابتر ہے اور نظم و ضبط کا بحران جو پہلے سندھ اور کراچی تک محدود تھا' اب پنجاب میں بھی پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

بہتر یہی ہو گا کہ اگر بھارت سے جنگ کا خطرہ بڑھا تو صدر مملکت اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے ہم سب کو اس شدید ذہنی اور اضطرابی کیفیت سے جلد از جلد نجات دلائیں

گے۔ ہو سکتا ہے کہ نئے انتخابات کے ذریعے نئے پبلک مینڈیٹ کا احترام کرنے کی رسم اس ملک میں پڑ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک کو بحرانی کیفیت سے نکالنے کی کنجی صدر مملکت کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ قفل جلد کھل جائے اور ہم اس بے چینی اور اضطراب سے آزاد ہو جائیں!

○

علامہ اقبالؒ اور جمہوریت☆

حضرت علامہ نے جس طرح عقل کے منفی اور مثبت استعمال کا ذکر کیا ہے' اسی طرح وہ جمہوریت کے غلط اور صحیح پہلوؤں پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

بقول علامہ اگر عقل کو بطور ذریعہ ٔ تحصیل معلومات صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ اس کا 'یزدانی استعمال' ہے۔ اور اگر غلط طریق سے استعمال کیا جائے تو وہ اس کا 'شیطانی استعمال' ہو گا۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

عقل اندر حکم دل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

جمہوریت بھی حضرت علامہ کے نزدیک کسی قوم کے اجتماعی مسائل حل کرنے کا ذریعہ ہے جسے برے اور بھلے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

علامہ کے خیال میں جمہوریت کی تین شکلیں ایسی ہیں جن کے انعقاد سے قوم تباہ ہو سکتی ہے' اس لئے ان سے ہر ممکن طور پر گریز کرنا چاہئے:۔

(الف) پہلی صورت تو یہ ہے کہ متعدد جماعتی نظام میں ایک سیاسی جماعت اتنی زیادہ اکثریت حاصل کرلے کہ اقلیتی سیاسی جماعتوں پر حاوی ہو کر ان کا استحصال کرنے لگے۔ ایسی صورت میں قوم اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہوئے بھی اکثریتی استحصال یا اکثریتی ظلم کا شکار ہو جائے گی۔

جمہوریت کے انعقاد کی یہی شکل تھی جس کی بنا پر مسلمانوں نے برصغیر ہند میں مخلوط

☆ "نوائے وقت" ۲۱ر اپریل ۱۹۸۹ء (یوم اقبال کے موقع پر تقریر)

انتخاب کی بجائے جداگانہ انتخاب کے اصول پر اصرار کیا۔ علامہ جمہوریت کی اسی شکل کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

(ب) دوسری شکل یہ ہے کہ جب حلقہ ہائے نیابت نااہل امیدوار کو مستحق امیدوار کے مقابلے میں مختصر گنتی کی بنیاد پر کامیاب کرا دیں اور امیدواروں کو اہلیت کے معیار پر تولنے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔

ایسی جمہوریت کے انعقاد پر ہر طرف دروغ گوئی اور منافقت کا دور دورہ ہوتا ہے اور سبز باغ دکھانے والا کوئی بھی سیاسی مافیا ملک کی باگ ڈور سنبھال سکتا ہے۔

ان حالات میں برسراقتدار افراد کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ اپنا اقتدار ہر صورت میں برقرار رکھا جائے' اور ان کا بیشتر وقت اپنے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں صرف ہوتا ہے اور قوم کے اجتماعی مسائل کے حل کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

علامہ نے اس طرز کی جمہوریت پر اپنے کلام میں جا بجا شدید تبصرہ کیا ہے۔ مثلاً

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے

یا

گریز از طرز جمہوری' غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

(ج) تیسری شکل جمہوریت کے انعقاد کی وہ ہے جس کا ذکر حضرت علامہ نے اپنے ایک خط بنام ایڈورڈ ٹامسن مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۹ء میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"غیر منظم' فاقہ کش اور پسماندہ ملکوں میں اگر نیک نیتی سے عوام کے مسائل کو حل نہ کیا جائے تو جمہوریت کا انعقاد معاشی تباہ حالی' سیاسی عدم استحکام اور قومی انتشار کا سبب بن سکتا ہے"۔

اگرچہ جمہوریت کی ان تین منفی اشکال سے علامہ نے مسلمانان برصغیر کو خبردار کیا' لیکن ان کا عقیدہ ہمیشہ یہی رہا کہ جمہوری نظام کا نعم البدل کوئی نہیں۔

آپ کے نزدیک بہ اعتبار ایک سیاسی نصب العین' جمہوریت اسلام کا ایک نہایت اہم پہلو ہے' اور مسلم ممالک میں انتخابات کی بنیاد پر مجالس قانون ساز کا قیام اسلام کی اصل

پاکیزگی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسی اعتبار سے ظاہر ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک جمہوریت کی جو قابل قبول صورت ہے، وہ صرف اسلامی جمہوریت ہی کی شکل ہے۔

لیکن جمہوری اسلام کے متعلق حضرت علامہ کے نظریات اصلاحی تھے، روایتی نہ تھے، اس لئے ان کے تصور اسلامی جمہوریت کا تعلق اصولیین یا ملا کے اسلامی جمہوریت کے تصور سے قطعاً نہیں بلکہ وہ تو ملائے حرم کے بارے میں مایوسی سے فرماتے ہیں ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام!

اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت کی اساس توحید پر ہے، اور توحید اپنے پرستاروں کو تین اصولوں کا پابند ہونے کی تلقین کرتی ہے۔ وہ اصول یہ ہیں

(الف) انسانی اتحاد

فرماتے ہیں ؎

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم!

(ب) مساوات ------ اور

(ج) آزادی

فرماتے ہیں:

ازروئے اسلام جمہوریت کا مطلب ہے کہ مسلمان ان عظیم اور مثالی اصولوں کو دنیا میں ایک قوت کی صورت میں ظاہر کر کے دکھائیں۔

ایک اور مقام پر اسلامی جمہوریت کو "روحانی جمہوریت" قرار دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک اسلام کا نصب العین دراصل ایک روحانی جمہوریت کے انعقاد کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے، کیا ہم نے اس مثبت اسلامی جمہوریت کا انعقاد پاکستان میں کیا ہے جس کے علامہ آرزومند تھے؟ کیا اتحاد، مساوات اور آزادی کی قدروں کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے؟ اگر انہیں تو پھر ہم نے یہاں جمہوریت کی کس شکل کا انعقاد کیا ہے؟ اور جس شکل کا انعقاد کیا ہے، کیا اس کے ذریعے ہمارے اجتماعی مسائل کے حل کی طرف توجہ

دی جا رہی ہے؟

اس مرحلے پر بہتر ہے کہ پاکستان کے اجتماعی مسائل کی نشاندہی سرسری طور پر کر دی جائے :۔

(الف) غربت (کھانے پینے، سر چھپانے کی جگہ، تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے کی قلت)

(ب) جہالت یا ناخواندگی

(ج) بے روزگاری

(د) مہنگائی

(ہ) طبی سہولتوں کا فقدان

(و) آبادی کا بلاقید پھیلاؤ

(ز) مسلسل عدم تحفظ کا احساس

(ح) تجارت میں کڑی شرائط کا سامنا، یعنی صنعتی سامان کے مقابلے میں خام مال کی قیمتوں کا گرتے چلے جانا۔

(ط) بیرونی قرضوں پر قومی زندگی کا انحصار۔ یہاں تک کہ آنے والی دو تین نسلوں کا مقروض ہو جانا۔ گویا دنیا بھر کے غریب، امیر ملکوں کے باشندوں کی آسودہ زندگی کے لئے سرمایہ فراہم کر رہے ہیں۔ ان سنگین مسائل کے نتیجے میں اس وقت پاکستان کی کیفیت کیا ہے؟

(۱) قومی یکجہتی کا فقدان

(۲) سیاسی عدم استحکام کے سبب باربار عسکری آمریتوں کے قیام کا ناگزیر ہو جانا

(۳) باہمی اعتماد کی عدم موجودگی اور علاقائی یا نسلی تعصب کی بنا پر ہر طرف نفرت کا فروغ

(۴) مذہبی رواداری کی غیر موجودگی

(۵) ہمسایہ ملکوں کے ساتھ سرحدی تنازعوں کا ختم نہ ہونا اور قومی سرمائے کے بیشتر حصے کا دفاع پر خرچ ہونا ------- اور

(۶) بالآخر سپر طاقتوں کی رقابت کا شکار ہونا۔

یہ مسائل پلک جھپکنے سے حل نہیں ہو سکتے۔ ان کے حل کے لئے عوام کو صبر اور تحمل سے کام لینا پڑے گا اور طویل منصوبہ بندی کے ذریعے ہی انہیں حل کرنا ہو گا۔ ملک میں جو بھی حکومت برسراقتدار ہو، اس کو ان سنگین مسائل کے حل کی طرف توجہ دینی ہو گی ---- لیکن جب سے اس ملک میں جمہوریت کا انعقاد ہوا ہے، ہماری قانون ساز مجالس میں ان مسائل پر بحث و تمحیص کے متعلق زیادہ سننے میں نہیں آتا۔ جو کچھ سننے میں آتا

ہے' اس کا تعلق صرف اور صرف اقتدار کی جنگ سے ہے یا مرکزی اور صوبائی چپقلش سے۔ نتیجے میں ہر طرف مایوسی پھیل رہی ہے' اور وہ وقت دور نہیں جب یہی مایوسی ایک وبا کی طرح سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور اس کی کوکھ سے قومی احتجاج کا ایک ایسا عفریت پیدا ہو گا جو اس ملک و ملت کو توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا ہے۔

یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کے بیشتر مسائل کا حل تعلیم کے فروغ اور صنعتوں کے قیام سے ہے۔ صنعتوں کے قیام کے لئے سستی اور وافر توانائی کی ضرورت ہے۔ لیکن توانائی کی نعمت سے ہم آج تک اس لئے محروم رہے ہیں کہ ہم باہمی اعتماد کی عدم موجودگی اور علاقائی یا نسلی تعصب کی بنا پر اپنا وقت پانیوں کی تقسیم پر جھگڑنے میں صرف کرتے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی چپقلش کو ختم کرنے کے لئے آئے دن کوئی نہ کوئی تجویز سننے میں آتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان میں مرکزی حکومت کے سامنے صوبائی حکومتوں کو سرتسلیم خم کرنا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ نہیں' مرکزی حکومت کو صوبائی خودمختاری کا احترام کرنا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ مرکز اور صوبوں میں مخلوط حکومتیں قائم کی جانی چاہئیں۔ اور کوئی کہتا ہے کہ اقتدار کی کشمکش کے مسئلے کا حل فقط یہی ہے کہ ملک میں انتخابات پھر سے کرائے جائیں۔ غرضیکہ ہر کوئی آئین کی اپنی تاویل پیش کرتا ہے۔ لیکن مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا' اور اگر دو طرفہ سیاسی بیان بازی کی یہی کیفیت رہی تو ممکن ہے کہ وہ بالآخر ملک کے سیاسی انتشار پر منتج ہو اور ایک بار پھر کسی غیر سیاسی قوت کو مداخلت کرنے کی ضرورت پڑے۔

بہرحال' لگاتار دعوے کئے جاتے ہیں کہ مارشل لاء ہم نے اٹھوایا یا ہماری قربانیوں سے ملک میں جمہوریت آئی۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جمہوری نظام کا مطلب قانون کی حاکمیت ہے' اور گو آج تک اس بات کا اعتراف کرنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی' پاکستان میں اسی اصول کے تحت اعلیٰ عدالتوں کے حالیہ معروف فیصلوں کے ذریعے ہی دراصل جمہوریت کا انعقاد ہوا ہے۔ سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کو غیر قانونی قرار دینا' سیاسی جماعتوں کے ملکی انتخابات میں حصہ لینے کے لئے راہ ہموار کرنا' انتخابات کو دھاندلیوں سے پاک رکھنے کے لئے شناختی کارڈ کی شرط کو برقرار رکھنا اور قومی اسمبلی کو کالعدم قرار دینے سے متعلق صدر کے اختیارات کو عدالتی احتساب کے تابع لانا' یہ سب ایسے اہم فیصلے ہیں جن کے سبب آج پاکستان میں جمہوری نظام کا اجرا ہوا ہے۔

مستقبل میں اگر اس ملک میں جمہوریت کو بقا نصیب ہوتی ہے تو ظاہر ہے وفاق کو قائم رکھنے ہی سے ہو سکتی ہے کیونکہ پاکستان کے چاروں صوبے اپنی آئینی خودمختاری کے باوجود

وفاق کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر مرکزی اختیار کا صوبائی خود مختاری کے ساتھ کوئی تنازعہ ہے تو اسے سیاسی بیان بازی کے ذریعے ملکی انتشار کی انتہا تک پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی ذاتی یا جماعتی انا کا مسئلہ نہیں۔ نہ ہی اقتدار کا مسئلہ ہونا چاہئے کیونکہ اس مسئلے کے آئینی حل کے لئے اعلیٰ عدالتوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جو کسی بھی معاملے میں مرکزی اختیار اور صوبائی خود مختاری کی حدود کا تعین کر سکتی ہیں۔ اور ان کا فیصلہ سب فریقوں کے لئے قابل قبول ہونا چاہئے۔ پس' پاکستان میں جمہوریت کو زندہ رکھنا ہے تو قانون کی حاکمیت کے احترام کی عادت ڈالنی پڑے گی' اور ایسی عادت جلد ڈالنی چاہئے کیونکہ وقت کسی کے انتظار کے لئے نہیں رکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ قوم کو اپنی بقا کے لئے آج سیاستدانوں کی بجائے سیاسی مدبروں کی ضرورت ہے کیونکہ اس مرحلے پر انہی کی بصیرت' تدبر' نیک نیتی اور اخلاص ہی ہمار تمام مشکلات سے ہمیں نجات دلا سکتا ہے۔ سیاستدان اور سیاسی مدبر ------ میں فرق واضح ہے۔ حضرت علامہ نے اس سلسلے میں ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کیا درست فرمایا ہے ؂

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں' رکھتے ہیں خاک سے پیوند!
ہمیشہ مور و مگس پر نگاہ ہے ان کی
جہاں میں ہے صفت عنکبوت ان کی کمند!
خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند!

○

شخصیات واماکن

چودھری محمد حسین ☆

علامہ اقبال کی ایک یادداشت وہ کتاب ہے جس کے پہلے صفحے پر انہوں نے لکھا ہے:

"جاوید اقبال کو لازم ہے کہ بالغ ہونے پر اس تمام تحریر کو جو اس کتاب میں درج ہے' بغور پڑھ لے! محمد اقبال ۱۰ جون ۳۵ء"۔

اسی کتاب میں ۱۷ اکتوبر ۳۵ء کی یاد داشت کے تحت وہ اپنی اس وصیت کا ذکر کرتے ہیں جو سب رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹر کرائی جا چکی ہے' اور فرماتے ہیں:

"اس وصیت کی رو سے چودھری محمد حسین ایم اے' حکیم طاہر دین' شیخ اعجاز احمد و خواجہ عبدالغنی کو جاوید اور منیرہ کی جائیداد اور ذات کا ولی مقرر کیا گیا ہے"۔

آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

"باقی جاوید کو میری عام وصیت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے ..... جو لوگ میرے احباب ہیں' ان کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔"

حضرت علامہ کے احباب کی تعداد' خاص طور پر ان کی وفات کے بعد تو' بہت بڑھ گئی

☆ ۲۱ اپریل ۱۹۵۷ء "چٹان" اقبال نمبر میں شائع ہوا۔

ہے لوہ اب ان میں کچھ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں جو علامہ پر دین اسلام کے اسرار و رموز واضح کیا کرتے تھے۔ انہیں بتایا کرتے تھے کہ شعر کس طرح لکھا اور کہا جاتا ہے' اور بعض نے تو یہ دعویٰ بھی کر دیا ہے کہ علامہ اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنا نائب مقرر کر گئے تھے۔ گو جب علامہ بقید حیات تھے تو ان کے ان احباب کی خوبیاں اتنی عیاں نہ تھیں جتنی اب ہیں' لیکن ہو سکتا ہے میں غلطی پر ہوں کیونکہ میں نے علامہ کے بیشتر ملنے جلنے والوں کو بہت چھوٹی عمر میں دیکھا ہے۔ ایسی عمر میں جب مجھے ہر شے بہت بڑی اور ہر شخص بہت قد آور دکھائی دیتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ زمانے نے کروٹ بدل لی ہے' اور اب اگر میں کبھی علامہ کے ان احباب سے ملتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ تو مجھے بہت قد آور نظر آیا کرتے تھے' اب اس قدر ٹھگنے سے کیوں معلوم ہونے لگے ہیں کہ انہیں دیکھنے کے لئے مجھے اپنی کمر جھکانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے (عجیب بات ہے میں نے آج تک علامہ کے احباب کی موجودگی میں یہ کبھی نہیں سوچا کہ میں خود قد میں بڑھ گیا ہوں)۔ بہرحال' علامہ کے جس دوست کا تذکرہ مجھے یہاں مقصود ہے' وہ میری زندگی کے ہر رنگ میں' ہر حال میں اور ہر دور میں مجھ سے قد میں اونچا ہی رہا' اور جب بھی میں نے اس کی طرف دیکھا' مجھے اپنی نگاہیں اٹھانی پڑیں' جھکانی نہ پڑیں۔

چودھری محمد حسین ایک ایسے بزرگ تھے جو رفتہ رفتہ اب ہم لوگوں میں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ گندمی رنگ' چھ فٹ ایک انچ قد۔ قوی ہیکل جسم' چھدری سی خاکستری داڑھی' دھندلی سی مگر ایک ہی جائزے میں انسان کو بھانپ لینے والی نگاہیں' روی ٹوپی اوڑھے' سفید شلوار اور سفید قمیص پر ہاف کوٹ پہنے' ادھیڑ عمر کے ایک وضع دار' کم گو' بظاہر سرد مہر لیکن حقیقت میں پر خلوص' دیکھنے میں سادہ لیکن سمجھنے میں مشکل شخص جو بائیسکل کی گدی پر ہمیشہ پچھلے پہیے کے ساتھ لگی ہوئی کلی پر پاؤں رکھ کر سوار ہوا کرتے۔ علامہ کی وفات کے بعد وہ اکثر متین اور سنجیدہ ہی دیکھے گئے۔ انہیں اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

یہ مرد درویش ۸ مارچ ۱۸۹۲ء بروز بدھ بوقت سحری (اس روز رمضان کی انیسویں تاریخ تھی) موضع پہاڑنگ اونچہ' تحصیل پسرور' ضلع سیالکوٹ کے ایک جاٹ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چودھری فضل احمد علاقے کے ذیلداروں کے خاندان سے تھے اور ان کو بڑی منتوں کے بعد خداوند تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا تھا۔ چودھری صاحب نے ۱۹۱۲ء میں ڈی بی

ہائی اسکول پسرور (ضلع سیالکوٹ) سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور اسی سال اسلامیہ کالج لاہور میں آ داخل ہوئے۔

ان کی طبیعت کی افتاد عربی، فارسی اور اردو کی طرف زیادہ راغب تھی۔ زہد و تقویٰ، دینداری اور راست بازی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے پیر، استاد محمد حسین پسروریؒ نے ابتداء ہی سے نقشبندیہ طریق پر تربیت دی، اور غالباً یہ انہی کی تربیت کا فیض تھا کہ چودھری صاحب صوفی منش ہونے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ، احادیث اور اصول فقہ سے خاصی رغبت رکھتے تھے، اور یہ رغبت آخر عمر تک قائم رہی (میں چودھری صاحب اور علامہ کی معیت میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر سرہند حاضر ہو چکا ہوں)۔ اس دور میں ان کی طبیعت پر ایک بزرگ 'جانے شاہ' کا رنگ بھی غالب تھا۔ چھاتی تک طویل داڑھی تھی جسے جذبات پر قابو رکھنے کی غرض سے اکثر کھجلایا کرتے۔ اس کیفیت سے متاثر ہو کر ان کے پیر، استاد نے انہیں 'جانے شاہ' کا نام دے رکھا تھا۔ زندگی کے ابتدائی حصے میں فقر کا رنگ کچھ ایسا غالب آیا کہ ہر وقت مستغرق سے رہتے یہاں تک کہ ان کے والد بزرگوار کو ان کی صحت کے متعلق فکر لاحق ہو گیا۔

جن دنوں چودھری صاحب اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے، مسلمان تحریک علی گڑھ کی وجہ سے بیدار ہو چکے تھے اور دنیائے اسلام کی سیاسی حالت پر نہایت فکر مند و پریشان تھے۔ بزرگان دین کا دور دورہ تھا۔ ہر طالب علم کا دل پیام اسلام سے معمور تھا۔

یہ ماحول چودھری صاحب کو راس آیا۔ کالج کی زندگی کے دوران میں کوئی بھی نماز اس اللہ کے بندے سے قضا نہ ہوئی۔ روزے تو آخری دم تک رکھتے رہے۔ کم و بیش، تہجد سے بھی کوتاہی نہ ہوئی۔ عشاء کی نماز کے بعد سو سو نفل "وقتاً فوقتاً" گزارتے تھے۔

آپ ریواز ہوسٹل میں رہتے تھے، اور ہوسٹل کا ہر مقیم آپ کی خوش خلقی کی وجہ سے آپ سے محبت کرتا تھا۔ شعر تو آپ نے اسکول کی زندگی ہی میں کہنے شروع کر دیئے تھے۔ جوں جوں ذہن پختہ ہوا، پرانے استادوں کا ادراک آپ کی فطرت کا حصہ بنا۔ نیز زندہ دلی بھی پیدا ہوئی جو بعد میں ضرب المثل بنی۔ اس زمانے میں اپنے آپ کو محمد حسین پہاڑنگی لکھا کرتے تھے۔ گو تخلص کوئی بھی اختیار نہ کیا، آپ کی غزلیں اور نظمیں اکثر روزنامہ "الاثر" اور "زمیندار" میں شائع ہوتیں۔ اکبر الہ آبادی سے بھی خط و کتابت جاری ہوئی اور ان کے ظریفانہ رنگ کو اپنے اشعار میں اپنایا۔

ایک روز مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ جماعت ہونے کو تھی۔ مگر ریواز ہوسٹل کے اس

کمرے میں جہاں نماز ادا کی جاتی تھی، کوئی چراغ روشن نہ تھا (بجلی ان دنوں رواز ہوسٹل میں نہیں تھی) آپ نے فرمایا ع

روشنی مسجد میں ہونی چاہئے!

نماز کے بعد احباب میں سے کسی نے شکوہ کیا "مصرع ادھورا ہے، وضاحت کیجئے" تو برجستہ بولے۔

وقت مغرب قبل تکبیر صلوٰۃ
روشنی مسجد میں ہونی چاہئے!

اسی دور کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تاکجا در صحبت یاراں نشینی ز اشتیاق
اے رہین لطف صحبت، آخر صحبت، فراق!

زندہ دلی اور تغزل کی مثالیں بھی آپ کے اشعار میں بے شمار ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چل چلے چلتے ہیں مسجد کو، مگر یہ تو بتا!
تیرے کوچے میں کوئی اے شیخ میخانہ بھی ہے؟

۱۹۱۹ء میں آپ نے اسلامیہ کالج لاہور سے ایم، اے (عربی) کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ طور پر منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہنری مارٹن کے کہنے پر آپ نے نواب ذوالفقار علی خان مرحوم کے بچوں کی اتالیقی قبول کر لی تھی، اور چونکہ نواب صاحب مرحوم کا علامہ سے گہرا دوستانہ تھا، اس سبب سے چودھری صاحب کو علامہ سے ملنے کا اکثر موقع ملنے لگا۔ علامہ نے آپ کی مخلص دین داری کو بھانپ لیا اور پھر ایسا اپنایا کہ مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ انہی دنوں جب "اسرار خودی" پہلی بار شائع ہوئی تو آپ نے علامہ کو کچھ شعر لکھ کر بھیجے۔ ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

کوئی جا کے پوچھے تو شیخ سے یہ اسے ہی کہتا خودی نہ ہو
جو کہ بے خودی کی زباں پہ ہے میں جمال روئے جلال ہوں
گو اثر نہیں وہ زبان میں وہ تپش نہیں ہے اذان میں
پہ یہ لکنتیں ہیں بتا رہیں کہ میں یادگار بلال ہوں!

علامہ سے مراسم کے بعد غالباً ۱۹۲۴ء میں آپ کی ایک غزل علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی جس میں مسلمانوں کے حال پر بے حد آزردہ خاطر معلوم ہوتے ہیں۔

دل چاہتا ہے نت نئے فتنے سے کھیل کود
کیوں بس میں اپنے گردش چرخ کہن نہیں
کب تک پھرے گا وادیِ وحشت میں ساتھ ساتھ
تیر قضا ہے، خار سر پیرہن نہیں
ہستی سے دل کی گرم ہیں ہستی کی محفلیں
اس صدر انجمن کی کہیں انجمن نہیں
کیا دن تھے گلستان پہ ہمارے بتائے کون
غنچے نہیں، صبا نہیں، مرغ چمن نہیں
لائے جو رنگ پر تھے کبھی رنگ روزگار
اس آئنے میں رخ وہی پرتو فگن نہیں
مجنوں ہے غرق شرم کہ صحرا نورد تھا
سنتا بھی کیا، تھی کوہنی، کوہکن نہیں

اور آخر میں علامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ظاہر خدا کرے گا خدائے سخن کی شان
ان کافروں کو ہند کے، ذوق سخن نہیں!

لیکن چودھری صاحب نے علامہ کے کہنے پر شاعری کو ترک کر دیا اور نثر کی طرف توجہ کی۔ آپ کے مضمون کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں آپ نے علامہ کے اصرار پر پنجاب سول سیکریٹریٹ میں ملازمت کرلی۔ ایک سو ساٹھ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ تب داڑھی کچھ ترشوالی۔ دفتر میں آپ کی میز سے پرے کھونٹی پر ایک نکٹائی لٹکتی رہتی تھی۔ جب افسروں کو ملنے جاتے تو شلوار قمیص، ہاف کوٹ اور رومی ٹوپی کے ساتھ اس نکٹائی کا اضافہ ہو جاتا۔ واپسی پر نکٹائی اتار کر پھر کھونٹی پر لٹکا دی جاتی۔ آپ کی سرتاپا مشرقی شخصیت میں صرف یہ نکٹائی ہی مغرب کی موجودگی کے احساس کی دلیل تھی۔

آپ پریس برانچ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے۔ ۱۹۳۶ء میں یعنی علامہ کی زندگی ہی میں آپ کو خان صاحب کا خطاب ملا۔ ۱۹۴۳ء میں خان صاحب سے خان بہادر بنا دیے گئے۔ لیکن سادگی نے آپ کی بائیسکل کی طرح آخر عمر تک آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک شادی کی۔ چھ لڑکیوں اور تین لڑکوں کے باپ بنے (لڑکوں کے

نام نفیس، جلیس اور ادریس، علامہ ہی نے تجویز کیے تھے)۔ خرچ کی تنگی کے باوجود بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوائی۔ موٹر کار خرید کی، لیکن آپ سے کہیں زیادہ اسے اولاد نے استعمال کیا۔ شروع شروع میں تو نواب ذوالفقار علی خان مرحوم کے ساتھ رہتے تھے، مگر بعد میں قلعہ گوجر سنگھ لاہور میں اپنا مکان (فضل منزل) تعمیر کرایا اور وہاں اٹھ آئے۔

سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ انجمن حمایت اسلام کو بھی آپ کی خدمات کا فخر حاصل ہے۔ آپ کو علامہ ہی نے انجمن سے متعارف کرایا، اور جب انجمن نے تعلیم نسواں کے لئے زنانہ کالج کھولا تو آپ اس کے آنریری سیکریٹری مقرر کیے گئے۔

علامہ کے ساتھ آپ کے مراسم کی گہرائی کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ یہ آپ ہی کا مشورہ تھا کہ علامہ نے اپنا کلام مجموعوں کی صورت میں شائع کرانا شروع کیا۔ جب "بانگ درا" پہلی مرتبہ چھپی تو علامہ نے ایک جلد چودھری صاحب کو "تحفتہ" دی۔ اس جلد کے سرورق پر علامہ کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ایک شعر ہے جو آپ کے علامہ سے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔

بروں کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا

چودھری صاحب بلا ناغہ، عموماً رات کو علامہ کے پاس آیا کرتے جب سب ملنے جلنے والے جا چکے ہوتے اور علامہ تنہا ہوتے۔ علامہ، چودھری صاحب کو اپنا تازہ کلام سناتے۔ ایک پرانے لیمپ کی ماند سی روشنی میں دونوں بزرگ فارسی یا عربی لغت کی موٹی موٹی جلدوں کے صفحے الٹتے، اشعار میں مضمون کی یک جہتی، الفاظ کی صحت یا جذبات کی ہم آہنگی پر بحث و تمحیص ہوتی۔ بعض اوقات اسلام، فلسفے یا سیاست پر گفتگو ہوتی یا ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ چودھری صاحب بہت کھل کر ہنستے تھے اور آپ کے قہقہوں کی آواز اکثر علامہ کے کمرے میں گونجا کرتی۔ آپ اچھی غذا کے نہ صرف شوقین تھے بلکہ خوب خوب کھاتے تھے۔ جن دنوں علامہ علیل تھے اور اطباء کے مشورے پر انہوں نے مرغن غذائیں کھانی بند کر رکھی تھیں تو علامہ اکثر بریانی، قورمہ، مرغ مسلم اور کباب پکواتے اور اپنے رو برو چودھری صاحب کو کھلواتے اور آپ کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ چودھری صاحب کو علامہ کی طرح آموں سے بھی بڑی رغبت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں علامہ کے لئے ہندوستان بھر سے آموں کے ٹوکرے آیا کرتے اور ان سے چودھری صاحب کی تواضع کی جاتی۔ بعض اوقات ایسی قسم کی محفلیں دریائے راوی کے کنارے میاں نظام الدین مرحوم کے آموں کے

بانلت میں بھی لگتیں (میں بھی چند ایک ایسی محفلوں میں شریک ہو چکا ہوں)۔ سردیوں کے موسم میں شاہ افغانستان کی بھیجی ہوئی سردوں، انگوروں اور خشک میووں کی پیٹیاں آیا کرتیں اور ان میووں کو کھاتے وقت گفتگو برصغیر ہندوپاکستان کی حدوں سے نکل کر مشرق وسطیٰ تک پہنچ جاتی۔ قندھار، غزنی، کابل، طہران اور تبریز سے ان پھلوں کا ذکر علامہ اور چودھری صاحب کو سلاطین، اساتذہ اور صوفیائے کرام تک لے جاتا۔ غرضیکہ عجب سماں بندھتا۔ بات کہیں سے چلتی اور کہیں پہنچ جاتی۔ پھر علی بخش سے مذاق ہونے لگتا اور چودھری صاحب کبھی اس کی خضاب زدہ مونچھوں پر پھبتی کستے، کبھی اسے بیاہ کرنے کو کہتے اور کبھی اسے سرکار سے مربعے دلوانے کی ہامی بھرتے۔ غالباً اس زمانے میں چودھری صاحب نے ایک نیلے رنگ کا اوورکوٹ بھی سلوایا تھا جو عرصے تک مذاق کا موجب بنا رہا۔

۲۶-۱۹۲۵ء میں چودھری صاحب نے علامہ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی ایک یادداشت بھی لکھنی شروع کی۔ اس یادداشت میں دینی، علمی اور ادبی باتوں کے علاوہ بعض باتیں خاصی دلچسپ ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ پر ایک خاتون فریفتہ ہو گئیں۔ ان سے خط و کتابت کرنے لگیں اور انہیں لکھا کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ علامہ نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے اپنی طرف سے کسی شخص کو علامہ سے رشتہ طے کرنے کی غرض سے بھیجا۔ جب وہ شخص آیا تو چودھری صاحب بھی وہیں موجود تھے (یہ اس زمانے کی بات ہے جب چودھری صاحب کے سارے احباب انہیں غیر شادی شدہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ نواب صاحب مرحوم اور علامہ کو بھی معلوم نہ تھا کہ چودھری صاحب شادی شدہ ہیں، اور صاحب اولاد ہیں)۔ علامہ نے اس شخص کو بیٹھنے کے لیے کہا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس وقت چودھری صاحب دور کھڑے، کتابوں کی الماری میں کوئی کتاب تلاش کر رہے تھے۔ وہ شخص کہنے لگا "میں ڈاکٹر اقبال سے ملنا چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے مجھے بتائیے کہ آپ دونوں میں سے وہ کون ہیں؟" علامہ نے کہہ دیا کہ میں ڈاکٹر اقبال ہوں۔ اس کے بعد اس شخص نے بتایا کہ وہ ان کے رشتے کی غرض سے آیا ہے۔ علامہ نے معذرت کی اور کہا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور انہیں مزید شادی کی فی الحال ضرورت نہیں۔ جب وہ شخص جا چکا تو علامہ نے سارا قصہ چودھری صاحب کو کہہ سنایا۔ چودھری صاحب بولے "واہ! آپ کو چاہیے تھا کہ میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ ڈاکٹر اقبال میں ہوں۔ اگر آپ کو خود شادی نہ کرنی تھی تو کم از کم میرا بندوبست تو ہو جاتا۔"

کلام اقبال کا ایک ایک شعر چودھری صاحب کے ہاتھوں سے گزرا ہے، اور یہ کہنا غلط

نہ ہو گا کہ آپ کو علامہ کے ہر شعر کی شان نزول کے متعلق آگاہی ہی نہ تھی بلکہ ہر اشارے کو بھی سمجھتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ فرمایا کہ علامہ کے مندرجہ ذیل شعر:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

میں "درویشی" سے مراد مہاتما گاندھی کی درویشی ہے اور "سلطانی" سے مراد متحدہ پنجاب کی برسر اقتدار سیاسی پارٹی ہے (یعنی یونینسٹ پارٹی جس کے قائد ان دنوں سر سکندر حیات خاں تھے)۔

آپ علامہ کے ساتھ جنوبی ہندوستان کے دورے پر بھی گئے۔ جب علامہ نے مدراس میں اسلام پر اپنے مشہور و معروف لیکچر دیے (جن کا مجموعہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے) تو چودھری صاحب ان کی معیت میں تھے۔ جب علامہ، سلطان ٹیپوؒ کے مزار کی زیارت کی غرض سے میسور گئے تو چودھری صاحب ان کے ساتھ تھے۔ ۱۹۳۵ء میں علامہ کو متعدد عارضے لاحق ہوئے اور زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو انہوں نے چودھری صاحب کو میرا اور منیرہ کا ولی مقرر کیا۔ آپ کو ایک چٹھی لفافے میں بند کر کے دی اور فرمایا یہ لفافہ میری موت کے بعد کھولا جائے۔

مجھے علامہ کی آخری رات خوب یاد ہے۔ ان کی چارپائی گول کمرے میں بچھی تھی اور احباب جمع تھے۔ میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ ان دنوں ان کی نظر بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ پوچھا "کون ہے؟" میں نے جواب دیا "میں جاوید ہوں ابا جان!" ہنس کر بولے "جاوید بن کر دکھاؤ! بن کر......" پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے چودھری صاحب سے مخاطب ہوئے "اسے جاوید نامہ کے آخیر میں وہ دعا "خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھوا دیجئے گا۔" چودھری صاحب نے انبساط سے سر ہلا دیا، گویا کہہ رہے ہیں "آپ بے فکر رہیے! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق عمل میں لایا جائے گا۔"

اور خدا گواہ ہے، سب کچھ علامہ کی مرضی کے مطابق عمل میں لایا گیا۔ علامہ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو پانچ بجے کے قریب داعی اجل کو لبیک کہا۔ مجھے آج تک چودھری صاحب کا متین چہرہ یاد ہے۔ اس روز آپ کی نگاہوں میں آنسو نہیں تھے۔ گویا علامہ کا انتقال ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے کیونکہ آپ خود بھی ایک روز اسی طرح انتقال کریں گے اور علامہ سے ایک بار پھر ملاقات ہو گی۔ علامہ کی تجہیز و تکفین، اور ان کی لحد کے لئے مناسب جگہ کے انتظام کے سلسلے میں جو تردد کرنا پڑا، چودھری صاحب اس

میں پیش پیش تھے۔

"علامہ کی وفات کے بعد چودھری صاحب میں چند تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، آپ کے مانوس قہقہے پھر نہ سنے گئے۔ آپ بمطابق معمول ہر شام 'جاوید منزل' میرا اور منیرہ کا حال پوچھنے آتے۔ علی بخش سے آرام کرسی منگوا کر عموماً باہر دالان یا برآمدے میں بیٹھتے، رومی ٹوپی اتار کر فرش پر رکھ دیتے اور دوران گفتگو سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے۔ آپ کی بائیسکل قریب ہی کھڑی ہوتی۔ علامہ کی وفات کے بعد آپ نے ہمارے اصرار کے باوجود نہ تو اس گھر میں کبھی کچھ کھایا اور نہ پیا۔ گرمیوں کی کسی جھلستی ہوئی دوپہر میں اگر تشریف لاتے اور میں یا منیرہ آپ کو شربت کا گلاس پلوانے پر مصر ہوتے تو صاف انکار کر دیا کرتے، اور سادہ پانی ہی پیتے۔ اسی طرح منیرہ کی شادی کے بعد اگر آپ اس سے ملنے کی غرض سے کبھی اس کی سسرال جاتے تو وہاں بھی کچھ نہ کھاتے اور نہ ہی پیتے۔ اس معاملے میں آپ کی وضع داری کئی بار ہماری ناراضی کا موجب بھی بنتی، لیکن آپ ہنس کر ہمیں منا لیا کرتے۔

آپ اب ہر اس شخص پر شبہ کرنے لگے تھے جو علامہ پر کچھ تحریر کرنے کا خواہش مند ہوتا۔ آپ کو یقین تھا کہ علامہ پر صدق دلی سے کچھ لکھنے والے بہت کم ہیں، لیکن ان کے نام پر روپیہ بنانے والے بے شمار ہیں۔ اسی بنا پر جب بھی کوئی اس سلسلے میں آپ سے کسی قسم کی قانونی اجازت طلب کرنے آتا تو اسے ٹال دیتے یا اگر اجازت دیتے تو ہمیشہ ہمارے مالی مفاد کو پیش نظر رکھ کر اجازت دیتے۔ آپ کو علامہ کے سب احباب کے متعلق علامہ کی ذاتی رائے معلوم تھی، اور آپ مجھے اپنی زندگی ہی میں قریب قریب علامہ کے ہر ملنے جلنے والے کے متعلق کچھ نہ کچھ بتا گئے۔ چودھری صاحب کی علامہ کے بارے میں اس پابندی کی وجہ سے اکثر لوگ آپ سے نالاں تھے، یہاں تک کہ آپ کو بعض لوگوں نے گمنام محفلوں میں گالیاں بھی دیں یا ٹیلی فون پر آپ سے کہا "تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم اقبال کے خزانے پر سانپ کی طرح بیٹھے ہو" --- لیکن ان سب باتوں کے باوجود چودھری صاحب نے اپنا رویہ نہ بدلا۔

میں نے آپ سے کئی بار کہا کہ اگر آپ اوروں کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ علامہ پر کچھ تحریر کریں تو آپ خود علامہ پر ایک کتاب لکھ ڈالیے، لیکن آپ ہر مرتبہ یہی کہہ کر مجھے خاموش کر دیتے کہ میرے نزدیک علامہ کے نام پر روپیہ بنانا حرام ہے۔ اگر میں یوں کروں تو علامہ سے ملاقات کے وقت مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے گی، البتہ جب تم علامہ پر کوئی کتاب

لکھنے کے قابل ہو جاؤ گے تو انشاء اللہ جو کچھ بھی ان کی ذات کے متعلق جانتا ہوں یا جو کچھ میں نے ان کے کلام سے سمجھا ہے، تمہیں بتا دوں گا۔

ایک مرتبہ میں نے چودھری صاحب سے کہا کہ میرا ارادہ آپ کی ذات پر ایک مضمون لکھنے کا ہے تو بہت شرمائے۔ بولے "کیا تم دنیا سے یہ کہلوانا چاہتے ہو کہ میں اپنی شہرت کی خاطر اقبال کی اولاد سے مدح سرائی کرا رہا ہوں؟" اس کے بعد مجھے منع کر دیا۔ آج اگر آپ ہوتے تو مجھے اپنے آپ پر مضمون لکھنے کی اجازت کبھی نہ دیتے۔

چودھری صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ علامہ کے کلام کے متن کو صاف رکھا جائے، اور وہ اپنی زندگی میں اس کام کو انجام دینے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ علامہ کی وفات کے بعد ان کے کلام کا ہر مجموعہ آپ کے زیر نگرانی شائع ہوا۔

آپ علامہ کی وفات کے بعد مزار کمیٹی اور سنٹرل اقبال کمیٹی کے پریذیڈنٹ بھی منتخب ہوئے۔ علامہ کے مزار کے متعلق آپ کی تمنا یہی تھی کہ وہ قوم کے چندے سے تعمیر ہو، لیکن قوم کے اکثر امراء اسی صورت میں چندہ دینے کو تیار تھے کہ ان کے ناموں کا کتبہ علامہ کے مزار پر نصب کیا جائے۔۔۔ اس قسم کے لوگوں سے چندہ قبول نہ کیا گیا۔

علامہ کے مزار کے نقشے کے متعلق بھی کئی بار چودھری صاحب سے باتیں ہوئیں۔ فن تعمیر، ادب اور فنون لطیفہ کے متعلق آپ کا نظریہ کلاسیکی تھا۔ آپ مغل آرٹ کو تنزل شدہ تصور کرتے تھے کیونکہ اس کی نازک نازک لکیروں سے نسوانیت ٹپکتی ہے۔ اسی طرح وہ عمارات جن کے طرز تعمیر سے شوکت و جلال کی بجائے نفاست یا نازک پن کا اظہار ہوتا، آپ کو ناپسند تھیں۔ آپ کی نگاہ میں انسانی تخلیق جب تک جمال کے ساتھ ساتھ شوکت و جلال کے جذبات نہ اکسائے، تنزل شدہ تھی۔ اسی نظریے کے پیش نظر علامہ کے مزار کی تعمیر کے لئے نقشہ منتخب کرنے کے سلسلے میں آپ کو خاصی محنت کرنی پڑی، اور جو نقشہ بالآخر منظور ہوا، اس میں خیال رکھا گیا کہ سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ علامہ کا مزار پر شکوہ دکھائی دے۔

جن دنوں علامہ کا مزار زیر تعمیر تھا، میں کئی بار چودھری صاحب کے ساتھ مزار پر گیا۔ آپ مجھے پتھروں کے نام بتاتے، قسمیں گنواتے اور ساتھ یہ بھی بتاتے کہ مشاہیر اسلام کے مزاروں کی تعمیر کس نوعیت کی ہے۔ ان دنوں آپ علامہ کے مزار کے اندر چھت پر کندہ کروانے کے لئے اشعار منتخب کر رہے تھے۔ علاوہ اس کے آپ طرز خط سے متعلق معلومات بھی رکھتے تھے۔ تمدن اسلامی نے اس سلسلے میں جو جو مختلف طرزیں اختراع کیں، آپ کو

معلوم تھیں۔ کوئی طرز خط سے خاص رغبت تھی۔ جب قلعہ لاہور کے عظیم الشان دروازے سے اس طرف شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے کبھی آپ سے اس قسم کی گفتگو چھڑ جاتی تو میں اکثر محسوس کیا کرتا کہ ہم قرون وسطیٰ کے کسی عہد میں سانس لے رہے ہیں' تمدن اسلامی زندہ ہے اور اس کے زوال کے آثار ابھی پیدا نہیں ہوئے۔

چودھری صاحب کی نظر میں دنیائے اسلام علامہ سے عظیم تر شخصیت پیدا کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ علامہ کی وفات کے بعد کا لٹریچر پڑھنا تو درکنار' آپ اسے دیکھنے تک کے روادار نہ تھے۔ ایک بار آپ کے صاحبزادے' نفیس نے آپ سے پوچھا کہ قرآن مجید کی سورۃ الشعراء اور حدیث میں تو شعرا کی مذمت اور تذلیل کی گئی ہے' آپ علامہ کو کس زمرے میں شامل کرتے ہیں۔ جواب دیا "سورۃ الشعراء کو بغور پڑھو۔ شاعروں کی تذلیل واقعی کی گئی ہے' مگر سوائے ان شاعروں کے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

الا الذین امنوا وعملوا الصلحٰت و ذکروا اللہ کثیرا وانتصروا من بعد ماظلموا

میں علامہ کو بحیثیت شاعر اس زمرے میں شامل کرتا ہوں۔"

۱۹۴۳ء میں چودھری صاحب نے مجھے دیوان غالب پڑھانا شروع کیا۔ آپ غالب کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔ آپ کے خیال میں غالب ایک ایسے زمانے میں زندہ تھا جب سیاسی طور پر ہندوستان میں اسلام کا زوال آ رہا تھا' اور آپ اس لئے غالب کو قابل معافی نہ سمجھتے تھے کہ اس نے اسلام کی سربلندی کے لئے انگشت تک نہ ہلائی۔ گردش حالات نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا' لیکن غالب پیغام عمل کی تلقین کرنے کی بجائے "بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں" ہی کہتا مر گیا۔ اس کے سارے کلام میں صرف ایک شعر ہندی اسلام کے دور تنزل کی عکاسی کرتا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے متعلق ہے۔

اک شمع رہ گئی ہے' سو وہ بھی خموش ہے

بہرحال' آپ دیوان غالب پڑھاتے وقت غالب کے انداز تغزل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ بعض اوقات تو ایک ایک شعر پر گھنٹوں لگا دیتے اور آپ کو یہ خیال ہی نہ رہتا کہ میں موجود ہوں۔ غالب کے اشعار کی تشریح کرتے کرتے کسی اور ہی طرف نکل جاتے۔ جب دیوان ختم ہوا تو آپ نے مجھے کلام اقبال پڑھانا شروع کیا۔ جس شوق سے آپ نے مجھے کلام اقبال پڑھایا' اس کے متعلق تحریر کرنا ممکن نہیں۔ آپ نے مجھے علامہ کے فرمان کے مطابق "جاوید نامہ" کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" بھی پڑھایا۔ وہ میرے لئے ایک بہت بڑا

دن تھا، لیکن چودھری صاحب کے پر سکون چہرے پر جذبات کا ہیجان قطعی نہ تھا۔ گویا آپ سے میرا "خطاب بہ جاوید" پڑھنا ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ ان دنوں میں ایم اے انگریزی میں پڑھتا تھا، لیکن چودھری صاحب کی گفتگو اور کلام اقبال کے اثر نے مجھ میں فلسفہ پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ ۱۹۴۷ء میں میں نے ایم اے کر چکنے کے بعد ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ تب ہماری محفلیں بے حد دلچسپ ہو گئیں۔ چودھری صاحب ان دنوں خود بھی مولانا غلام رسول خان سے اصول فقہ پر سبق لینے لاہوری دروازے کے اندر کسی مسجد میں جایا کرتے تھے۔ آپ نے عربی منطق پر عبور حاصل کیا، اور ہماری خوب خوب بحثیں ہوتیں۔

چودھری صاحب میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ اگر میں زندگی کے کسی مرحلے میں کسی قسم کی کوئی بھی کامیابی حاصل کرتا تو مجھے کبھی شاباش نہ دیتے بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ کرتے۔ مثلاً جب میں ایم اے فلسفہ میں یونیورسٹی بھر میں اول رہا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا تو آپ اس شام ملنے آئے لیکن جاننے کے باوجود اس بات کا ذکر نہ کیا۔ میں بھی خاموش رہا۔ آپ کی نظر میں ہر وہ کامیابی جو میں نے اپنی محنت سے حاصل کی گویا ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ کامیابی کے لئے تگ و دو درست ہے، مگر اس کا حصول مقام مسرت نہیں بلکہ اس وقت انسان کو اگلی منزل کے لئے فکر کرنی چاہئے اور تگ و دو کے نئے سلسلے کے لئے ایک بار پھر کمربستہ ہونا چاہئے۔

چودھری صاحب کو کامل یقین تھا کہ آپ علامہ سے ملیں گے۔ آپ بات بات پر اس ملاقات کا ذکر یوں کرتے جیسے علامہ فوت نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں، صرف کہیں اور چلے گئے ہیں جہاں ہم سب ایک نہ ایک روز جائیں گے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے "تم بے شک پھڑ پھڑاؤ، اڑو، تیرو، جس طرف چاہے نکل جاؤ، لیکن تمہیں گرنا اسی مقام پر ہے جو تمہارے لئے متعین ہے۔"

اس زمانے میں میں نے لکھنا لکھانا شروع کر رکھا تھا۔ میرے افسانے، ڈرامے اور مضمون اکثر ترقی پسند رسالوں میں شائع ہوتے۔ بعض اوقات میں اپنے ڈرامے چودھری صاحب کو پڑھ کر بھی سنایا کرتا، لیکن ہمیشہ اصرار کرتے کہ کسی نصب العین کا تعین کرو۔ اگر نصب العین کوئی نہیں تو لکھنا بیکار ہے۔ ان دنوں ترقی پسندی خاصے زوروں پر تھی اور ترقی پسند انشاپردازوں کے سیاسی نقطۂ نگاہ سے حکومت کو اختلاف تھا۔ بیشتر ترقی پسند ادیب کمیونزم کے حامی تھے اور رفتہ رفتہ نئی پود کو اپنے سیاسی دائرے میں کھینچ رہے تھے۔ اکثر نوجوان اس

تحریک کے ادبی پہلو سے متاثر ہوئے اور کمیونزم کی لپیٹ میں آگئے۔ لیکن چونکہ کمیونزم میری سمجھ سے بالاتر تھا' اس لئے میں ترقی پسندی کے صرف ادبی پہلو ہی سے متاثر ہوا۔ چودھری صاحب ان دنوں ہوم ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور پریس کے معاملات میں حکومت پنجاب کے مشیر خاص بھی تھے۔ رسالوں کی اشاعت کے اجازت نامے دینا یا انہیں ضبط کرنا آپ ہی کے اختیار میں تھا۔ آپ نے فحش نگاری یا عریانیت کی بنا پر متعدد ترقی پسند رسالے ضبط کروائے۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو سوال پیدا ہوا کہ نئے حالات کے پیش نظر ادیبوں کے فرائض کیا ہونے چاہئیں۔ اس سلسلے میں میں نے ایک مرتبہ چند مشہور و معروف ترقی پسند ادیبوں کو اپنے یہاں بلوایا اور چودھری صاحب سے انہیں ملوایا تاکہ چودھری صاحب قومی ضروریات کے پیش نظر ہمیں یہ بتائیں کہ اس وقت کس قسم کے ادب کی ضرورت ہے۔ چودھری صاحب خاصی دیر تک ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ آپ کی باتوں کا اثر ترقی پسند ادیبوں پر تو کیا ہونا تھا' البتہ مجھ پر ضرور ہوا۔ میں نے ترقی پسندوں کے گروہ سے اپنے آپ کو منقطع کر لیا اور اس سلسلے میں کچھ مضمون بھی "نصب العین کا مسئلہ" کے زیر عنوان شائع کرائے۔

سعادت حسن منٹو' چودھری صاحب سے بے حد نالاں تھا کیونکہ آپ ہر وہ رسالہ ضبط کرواتے تھے جس میں منٹو کا کوئی افسانہ شائع ہوتا تھا۔ یوں' آپ اس کی شہرت یا بدنامی کا باعث بنتے تھے۔ منٹو نے اپنے فحش افسانوں کے ایک مجموعے کا انتساب چودھری صاحب کے نام کیا ہے اور نیچے علامہ کا یہ شعر لکھا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر!

کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جس شخص کے متعلق علامہ نے تو مندرجہ ذیل خیال کا اظہار فرمایا۔

بروں کشید ز پیچاک ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقام رضا کشود مرا

ترقی پسندوں نے اسے "مرد ناداں" کا خطاب دے کر اپنی دانائی اور دانشوری کا ثبوت دیا۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں منیرہ کی شادی ہوئی اور چودھری صاحب اپنے ایک اہم فرض سے سبکدوش ہوئے۔ اس روز میں نے آپ کو بہت عرصے کے بعد ہشاش بشاش دیکھا۔ چھ ماہ بعد یعنی ستمبر ۱۹۴۹ء میں میں انگلستان روانہ ہوا۔ آپ مجھے خیرباد کہنے کے لئے لاہور اسٹیشن پر موجود تھے۔ یہ آخری بار تھی جب میں نے آپ کو دیکھا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو فرمایا "علم

شکار کرنا، علم"! یہ آپ کے آخری الفاظ تھے جو میرے کانوں میں گونجے۔ گاڑی چل دی اور میں اس خیال سے سر باہر نکالے دیکھتا رہا کہ شاید ایک بار پھر نظریں چار ہوں، مگر آپ نے مڑ کر میری طرف نہ دیکھا۔

انگلستان سے میں نے اپنے تاثرات چند خطوں میں آپ کو تحریر کئے، نیز کیمبرج پہنچ کر ڈاکٹریٹ کے لئے موضوع کے تعین کے سلسلے میں بھی آپ سے مشورہ طلب کیا۔ ان دنوں انگلستان میں میرا دل نہ لگتا تھا اور میں گھر کے لئے بے حد اداس رہتا تھا۔ چودھری صاحب نے میرے کسی بھی خط کا جواب نہ دیا۔ شاید اس خیال سے کہ اپنی ذاتی مشکلات پر اگر خود قابو پاؤں گا تو مجھ میں خود اعتمادی آئے گی۔

مجھے کیمبرج میں اپنا تحقیق کا کام شروع کئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ایک روز اچانک نفیس (چودھری صاحب کے بڑے لڑکے) کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا کہ چودھری صاحب ۱۶ر جولائی ۱۹۵۰ء چار بجے شام میو ہسپتال کے فیملی وارڈ کے کمرہ نمبر ۲۶ میں وفات پا گئے۔ خوف سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا کہ اب میں تنہا ہوں، اب میرے لئے سوائے میری ذات کے اور کوئی فکر کرنے والا نہیں رہا۔

چودھری صاحب کو میرے انگلستان جانے سے پیشتر ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ اب آپ زیادہ دیر زندہ نہ رہیں گے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ علامہ کے بتائے ہوئے فرائض انجام دینے کی غرض سے محض قوت ارادی کے زور پر ہی جی رہے ہیں۔ آپ ہر وقت یہی کہتے رہتے ——— ابھی یہ باقی ہے، ابھی وہ باقی ہے۔ آپ نے علامہ کے کلام اور ان کی اولاد سے متعلق تمام فرائض انجام دیئے، یہاں تک کہ وفات سے پیشتر علامہ کے مزار کی تکمیل بھی کروا گئے اور اس دوران میں یہ کبھی نہ سوچا کہ آپ اپنے ذاتی فرائض نامکمل چھوڑے جا رہے ہیں۔ علامہ کی ذات سے چودھری صاحب کی وابستگی عشق کی ایک ایسی مثال ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ مجھے یقین ہے جب آپ علامہ سے دوبارہ ملے ہوں گے تو آپ نے علامہ کو اپنا ممنون نہ ہونے دیا ہو گا۔ گویا ان کے بتائے ہوئے فرائض کو انجام دینا چودھری صاحب کے لئے ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔

سات سال بعد یعنی ستمبر ۵۶ء میں جب میں انگلستان سے واپس لاہور پہنچا تو عزیز و اقارب، دوست احباب، سب اسٹیشن پر موجود تھے مگر دل میں ایک خلش سی تھی۔ میں نے چودھری صاحب کے صاحبزادوں کو مجھے ان کی تربت پر لے جانے کے لئے کہا۔ ہم میاں امیرالدین صاحب کے ہمراہ اسٹیشن سے اقبال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کی سیاہی

چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور ہم سب گاڑی میں خاموش بیٹھے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا کیونکہ مجھے ایک بار پھر اس خوف نے آ لیا تھا جس کی موجودگی کا احساس کئی بار مجھے کیمبرج اور لندن کی سرد اور تاریک راتوں کی تنہائی میں ہو چکا تھا۔ میں رہ رہ کر سوچتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ اب میرا کیا بنے گا۔ میرے نظریات اور میرے عقائد کی تصحیح اب کیونکر ممکن ہو گی۔ خود اعتمادی تو وقت نے سکھا دی لیکن بغیر کسی کی رہبری کے خودشناس کیونکر بنوں گا۔

اسی عالم میں ہم اقبال پارک پہنچ گئے اور چودھری صاحب کی لحد کی طرف پیدل چلنے لگے۔ چودھری صاحب کے تینوں صاحبزادے میرے آگے آگے تھے۔ اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صاحبزادے ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔ مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اس لئے میں نے نفیس سے پوچھا "کہاں ہیں چودھری صاحب؟" وہ بولا "یہ .... یہ ہیں!" میں نے تاریکی میں فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے' لیکن فاتحہ پوری نہ ہوئی۔ تاریکی نے مجھے رلایا ——— بہت رلایا۔

واپسی پر میاں امیرالدین صاحب کہنے لگے "چلو' یہاں تک آئے ہو تو علامہ کے مزار پر بھی ہوتے چلو۔ مزار کی تکمیل وہ آخری کام تھا جو چودھری صاحب نے انجام دیا۔" لیکن میرے لئے تو چودھری صاحب کی لحد پر حاضر ہونا ہی علامہ کے مزار کی زیارت کے برابر تھا۔ مگر چلتے چلتے معاً مجھے محسوس ہوا جیسے رات کی خاموش تاریکی میں چودھری صاحب میرے ساتھ آ ملے ہیں اور مجھے مزار اقبال کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ گویا انہیں میرے احساس زیاں کی پروا نہیں ہے' گویا ان کا انتقال تو ایک فطری امر تھا جسے اتنی اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ زندہ لوگوں کے انجام دینے کے لئے بہت سے ایسے اہم فرائض ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں ——— اور جو لوگ اہم فرائض انجام دیتے ہیں' وہ بھلا کب مرتے ہیں! کیا اقبال مر چکا ہے؟ کیا محمد حسین مر چکا ہے؟

○

اقبال ☆

ایک باپ کی حیثیت سے

میں نے سن رکھا ہے کہ میری پیدائش سے چند سال قبل ابا جان شیخ احمدؒ سرہندی مجدد الف ثانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیٹا عطا کرے۔ آپ نے حضرت مجددؒ سے یہ عہد بھی کیا کہ اگر خداوند تعالیٰ نے انہیں بیٹا دیا تو اسے ساتھ لے کر مزار پر حاضر ہوں گے۔

آپ کی دعا پوری ہوئی اور کچھ عرصے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ سرہند شریف پہنچے۔ اس سفر کے دھندلے سے تصورات میری نگاہوں کے سامنے ابھرتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پروقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں جیسے میں اس مقام کی خاموش فضا سے کچھ کچھ شناسا ہوں۔ ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔ اس وقت صرف ہم دو ہی تربت کے قریب بیٹھے تھے۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ ایک روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے، لیکن مجھ پر اس راز کا انکشاف نہ ہوا کہ آخر اس مزار پر

☆ ۲۱ر اپریل ۱۹۴۶ء یوم اقبال کے موقع پر ریڈیو اسٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا۔

جانے کا مقصد کیا تھا اور وہ آنسو کس لئے تھے۔ مجھے یاد ہے، میں بچپن میں اکثر یہی سوچا کرتا۔

اپنی زندگی میں ابا جان نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا ہو گا جس سے میں ان کی شفقت یا اس الفت کا اندازہ لگا سکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ والدین بچوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں، انہیں گلے سے لگاتے ہیں، انہیں چومتے ہیں، مگر مجھے آپ کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کبھی گھر میں منہ اٹھائے ادھر ادھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز سے۔ گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو۔ اور اکثر اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کئے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی جس میں عنفوان شباب کے وقتی ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جس تک پہنچنے کی اہلیت میرا ذہن نارسا نہ رکھتا تھا۔ بہرحال، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں ان سے محبت تھوڑی کرتا تھا اور خوف زیادہ کھاتا تھا۔

ہر گھر کی باتیں چھوٹی موٹی ہوا کرتی ہیں، مگر ان سے گھر کے افراد کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات والدین میں اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں تنازع بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح ابا جان اور اماں جان میں میری وجہ سے کئی بار تکرار ہو جاتی۔ مثلاً اماں جان کو میرے متعلق ہر گھڑی یہی فکر دامن گیر رہتا کہ جب کبھی میں اکیلا کھانا کھاؤں، پیٹ بھر کر نہیں کھاتا، اس لئے وہ ہمیشہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا کرتیں یہاں تک کہ میں آٹھ نو برس کا ہو گیا۔ لیکن پھر بھی مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی عادت نہ پڑی۔ ابا جان اس بات پر بار بار ناراض ہوئے کہ تم اسے بگاڑ رہی ہو، اگر یہ جوان ہو کر بھی خود کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہو گا۔ ہم لوگ رات کو اکثر خشکہ کھایا کرتے تھے۔ لہٰذا اب یوں ہوتا کہ بطور احتیاط چمچہ میری پلیٹ کے قریب رکھ دیا جاتا، مگر کھانا اماں جان ہی کھلاتیں۔ اباجان کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ "دبے پاؤں زنانے میں آیا کرتے" اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ بہرحال، جب بھی اماں جان مجھے کھلا رہی ہوتیں، ان کا دھیان باہر ہی رہتا اور جونہی وہ ابا جان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے علیحدہ کر کے چمچہ میرے آگے رکھ دیتیں اور میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ ابا جان کئی مرتبہ اس کا سراغ لگا چکے تھے، لیکن وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے بعد چلے جایا کرتے۔

میں بچپن میں بے حد شریر تھا' پڑھائی سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی' اس لئے اماں جان سے مار کھانا میرا معمول بن چکا تھا۔ اماں جان بچوں کی پرورش کے سلسلے میں ایک ایسے اصول کی پابند تھیں جو نہایت سخت تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں کہ اولاد کو کھانے کو دو سونے کا نوالہ' لیکن دیکھو قہر کی نظر سے۔ اسی اصول کے پیش نظر' گو میں ان کے ہاں بارہ برس کے شدید انتظار کے بعد پیدا ہوا' مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھ پر کبھی ایسی شفقت یا محبت کا اظہار کیا ہو جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ میں نے اتنا سن رکھا ہے کہ وہ جب کبھی بھی مجھے پیار کرتیں' میری نیند کے عالم میں کرتیں تاکہ مجھے علم نہ ہو سکے۔ شاید اسی لئے بچپن میں میرے ذہن میں یہ خیال بھی گزرا کرتا کہ میری ماں دراصل میری حقیقی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے۔

بہرحال' اباجان سے میں نے بہت کم مار کھائی ہے۔ میرے لئے ان کی جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے پر مجھے کئی بار کوسا گیا۔ ابا جان جب کبھی بہت برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے "احمق آدمی! بیوقوف!!" مجھے یہاں ابا جان سے مار کھانے کا ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔ بچپن میں مجھے روز ایک آنہ خرچ کرنے کو ملا کرتا اور اسے خرچ کر چکنے کے بعد خواہ میں اماں جان کی کتنی ہی منتیں کرتا' مجھے مزید کچھ نہ ملتا بلکہ ہر لحہ ان کے ناراض ہونے کا احتمال رہتا۔ ایک دفعہ اتفاق یوں ہوا کہ کوئی مٹھائی بیچنے والا ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا۔ مٹھائی دیکھ کر میں للچا گیا۔ لیکن جیب خالی تھی۔ اسے بٹھا تو لیا اور اماں جان کے پاس دوڑا آیا کہ شاید کچھ مل جائے۔ مگر انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ طبیعت ضدی تھی۔ خیال آیا کہ اس خوانچہ فروش سے پوچھوں کہ پیتل لے کر مٹھائی دے سکتا ہے یا نہیں۔ بدقسمتی سے اس نے ہاں کہہ دی۔ بس پھر کیا تھا۔ سائے کی طرح ابا جان کے کمرے میں گھسا اور بڑے ٹیبل فین کے پیچھے لگے پیتل کے پرزے کو اتار خوانچہ فروش کو دے آیا اور مٹھائی لے لی۔ لیکن شامت اعمال کہ ہمارا شوفر ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے آکر ابا جان سے شکایت کر دی۔ میں خوشی خوشی اچھلتے کودتے جو گھر کی حدود میں داخل ہوا تو مجھے اطلاع ملی کہ ابا جان بلا رہے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور تین چار تھپڑ میری گردن پر جما دیئے۔ ابا جان مجھے جب کبھی مارتے' گدی پر مارتے۔ وہ زور سے تو نہ مارتے مگر گدی جسم کا ایسا حصہ ہے جہاں چوٹ زیادہ لگتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر مجھے ان سے کبھی مار کھانے کا اتفاق ہوا تو اس کی وجہ نوکروں کو برا بھلا کہنا یا

جھوٹ بولنا تھی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اگر ابا جان نے میری کسی شرارت پر مجھے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو اماں جان بیچ میں آ کھڑی ہوئیں اور انہیں روک دیا یا اگر اماں جان نے مجھے ضرورت سے زیادہ پیٹا تو ابا جان خفا ہوئے کہ بچے کو اس بے دردی سے نہیں مارنا چاہئے۔ ایک دفعہ میں آنکھوں پر پٹی باندھے اماں جان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ ٹھوکر لگی اور منہ کے بل گر پڑا جس کی وجہ سے ہونٹ کٹ گیا اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے اسی لحظہ ابا جان زنانے میں داخل ہوئے اور اچانک میرے منہ سے یوں خون بہتا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

ہم گھر میں شور نہ مچا سکتے تھے۔ اگر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ باہر دالان میں کبھی کرکٹ کھیل رہا ہوتا تو ہمیں حکم ملتا کہ یہاں مت کھیلو' اور ہم منہ لٹکائے وہاں سے چل دیتے۔ لیکن بعض اوقات وہ ہمارے کھیل میں خود بھی شریک ہو جایا کرتے۔ ہمارے ہاتھ ان کی طرف گیند پھینکتے پھینکتے تھک جاتے مگر وہ بلا تھامے 'ٹھپ ٹھپ' کرتے رہتے۔ ایک دفعہ وہ اندر بیٹھے تھے۔ میں نے ہٹ جو لگائی تو گیند دروازے کے شیشے کو توڑتی ان کے کمرے میں جا گری۔ اس دن سے ہمیں کرکٹ کھیلنے کی ممانعت کر دی گئی۔ کئی بار کھلی بہار میں جب میں کوٹھے پر پتنگ اڑا رہا ہوتا تو وہ دبے پاؤں اوپر آ جاتے اور میرے ہاتھ سے پتنگ لے کر خود اڑانے لگتے۔ مگر مجھے یاد ہے کہ انہوں نے جب بھی کسی اور پتنگ سے پیچ لڑایا تو ہمیشہ ہماری پتنگ ہی کٹی۔

ہمارے گھر میں کھانا اماں جان پکایا کرتی تھیں۔ ان کی مدد کے لئے ایک اور خاتون بھی تھیں جنہیں میں بڑی اماں کہا کرتا۔ ان کے علاوہ ہماری کوٹھی کے پیچھے ایک نومسلموں کا محلہ تھا جس کی لڑکیاں اماں جان سے قرآن مجید کا سبق لینے آتیں' سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کا کام کاج بھی کرتیں۔

مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ ہمارے یہاں ایک مرتبہ ایک مہمان آ کر ٹھہرے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار انہیں ابا جان کو اقبال کہہ کر پکارتے سنا۔ یہ متناسب جسم' میانہ قد' باریش بزرگ نہایت خوش پوش' خوش باش اور خوش خور تھے۔ بمبئی سے آئے تھے اور مجھے چاکلیٹ کا ڈبہ تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ آپ کے قہقہے سارے گھر میں گونجتے رہتے اور آپ کے لئے اماں جان روز طرح طرح کے کھانے پکاتیں۔ آپ کا نام مولانا محمد علی تھا۔ یہ وہی محمد علی تھے جن کے متعلق اس زمانے میں مجھے ایک شعر حفظ ہو گیا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی

جان، بیٹا! خلافت پہ دے دو

دو ایک مرتبہ میں ابا جان اور اماں جان کے ساتھ سیالکوٹ بھی گیا۔ تب دادا جان بقید حیات تھے، گو بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اپنے کمرے میں ہمیشہ چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ میں ان کے پاس جاتا تو آنکھوں کو اپنے ہاتھ کا سایہ دے کر مجھے دیکھتے اور پوچھتے کہ کون ہے۔ جب میں انہیں جتاتا کہ میں جاوید ہوں تو ہنس پڑتے، طاق میں سے ایک ٹین کا ڈبہ اٹھاتے اور اس میں سے برفی نکال کر مجھے کھانے کو دیتے۔ سیالکوٹ کے مکان میں یا محلہ چوڑیگراں کی گلیوں میں جہاں میں بھاگتا پھرتا تھا، وہیں ابا جان کا بچپن بھی گزرا تھا۔

میرے بچپن میں رمضان کا مہینہ سردیوں میں آیا کرتا اور عید بھی سردیوں میں آتی تھی۔ رمضان کے دنوں میں اماں جان باقاعدہ روزے رکھتیں اور قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے۔ مجھے سحری کھانے کا بے حد شوق تھا اور ایک آدھ بار ابا جان کے ساتھ سحری کھانا بھی یاد پڑتا ہے۔ وہ روزہ کبھی کبھار رکھتے تھے اور جب رکھتے، تو ہر نصف گھنٹے کے بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔

جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ میں عموماً ابا جان کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی، لیکن اس شب گرم پانی سے اماں جان مجھے نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ نئے کپڑے یا جوتوں کا نیا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے، عیدی ملتی، کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے، مجھے ہر عید پر اماں جان پہنایا کرتیں۔ سر پر تلے کی گول ٹوپی پہنتا اور مجھے کلائی پر باندھنے کے لئے ایک سونے کی گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے میرے لئے تحفے کے طور پر بھیجی تھی۔ سج دھج کر میں ابا جان کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے کے لئے جاتا۔ ان کی انگلی پکڑے شاہی مسجد میں داخل ہوتا اور ان کے ساتھ عید کی نماز ادا کرتا۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم گھر آتے۔ ابا جان کی عادت تھی کہ وہ عید کے روز سویوں پر دہی ڈال کر کھایا کرتے تھے۔ سارا دن انہیں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا اور دن کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے گزر جاتا۔ رات آتی تو اماں جان سونے کی گھڑی اور اچکن اتروا لیتیں اور پھر اگلی عید تک مجھے ان کا انتظار کرنا پڑتا۔

کبھی بیمار ہوتا تو اماں جان اور ابا جان بہت پریشان ہو جاتے۔ میرے سرہانے روپوں کے نوٹ رکھے جاتے اور کھیلنے کے لئے اماں جان مجھے نو اشرفیاں دیتیں جو میری پیدائش کے

وقت اباجان کے مختلف احباب سے بطور تحفہ ملی تھیں۔ اماں جان کا خیال تھا کہ اگر بچہ بیمار ہو اور اسے کھیلنے کے لئے روپے یا اشرفیاں دی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔ ابا جان مجھ سے باربار پوچھتے کہیں درد تو نہیں ہو رہا' اور اگر میں انکار سے سر ہلاتا تو کہتے: "منہ سے بولو بیٹا! سر مت ہلاؤ۔" میرا بچپن زیادہ تر تنہائی میں گزرا۔ ۱۹۳۰ء میں منیرہ پیدا ہوئی لیکن وہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی اس لئے ہم اکٹھے کھیل بھی نہ سکتے تھے۔

مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے جب میں پہلی بار اسکول گیا۔ میری عمر کوئی پانچ ساڑھے پانچ سال کی ہو گی۔ اماں جان بہت فکرمند تھیں کہ میں سارا دن گھر سے دور کیسے رہ سکوں گا۔ ابا جان انہیں دلاسا دیتے رہے' لیکن ساتھ خود بھی علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کو لینے کوئی نہیں گیا۔ چھٹی ہونے پر جب میں گھر آیا تو اماں جان برآمدے میں کھڑی میری راہ تک رہی تھیں۔ اباجان بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے۔ بعد میں اسکول جانا ایک معمول بن گیا۔

مجھے موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ لیکن ہمارے گھر میں نہ تو ریڈیو تھا اور نہ گراموفون بجانے کی اجازت تھی کیونکہ ابا جان ایسی چیزوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ البتہ گانا سننے کا انہیں شوق ضرور تھا' اور اچھا گانے والوں کو جب کبھی گھر بلوا کر ان سے اپنا یا اوروں کا کلام سنتے تو مجھے بھی پاس بٹھا لیا کرتے۔ فقیر نجم الدین مرحوم' اباجان کو اکثر ستار بجا کر سنایا کرتے تھے۔ خود اباجان کو جوانی میں ستار بجانے کا شوق رہ چکا تھا۔ لیکن جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ گئے تو اپنی ستار کسی دوست کو دے گئے۔ ۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لئے اباجان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انہیں ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لئے گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے لیکن میرا انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شان نزول کا باعث ضرور بنا۔

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ' نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اماں جان کی بڑی آرزو تھی کہ اباجان تمام دن گھر پر پڑے رہنے کی بجائے کہیں ملازمت کر لیں۔ یہ سن کر اباجان عموماً مسکرا دیا کرتے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بچپن میں میں نے بھی اس معمے کو سلجھانے کی بارہا کوشش کی کہ میرے اباجان کام کیا کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مجھ سے یہ سوال پوچھ بیٹھتا تو میں خاموش ہو جاتا کیونکہ میں خود نہ جانتا تھا۔ اسی طرح اماں جان اس بات پر مصر رہتیں کہ کرائے کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بنوایئے۔ ان ایام میں ہم میکلوڈ روڈ پر رہا کرتے تھے۔

چند سالوں بعد اماں جان کے 'گھر کے اخراجات سے بچائے ہوئے' روپوں سے زمین خریدی گئی اور 'جاوید منزل' کی تعمیر شروع ہوئی۔ زمین اور مکان اماں جان کے نام تھے اور انہی کی ملکیت تھے۔ بہرحال، جب تعمیر مکمل ہو گئی تو ہم میوروڈ پر اٹھ آئے۔ لیکن اماں جان نئے گھر میں بیمار گاڑی پر ہی لائی گئیں کیونکہ ان دنوں وہ سخت علیل تھیں۔ انہیں چارپائی پر لٹائے اندر لایا گیا۔ دوسرے دن ابا جان جب انہیں دیکھنے کے لئے زنانے میں آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات اٹھا رکھے تھے۔ آپ نے اماں جان سے کہا کہ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کر دو۔ لیکن اماں جان نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں انشاء اللہ جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ لیکن اباجان نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اس پر انہوں نے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں 'جاوید منزل' میرے نام منتقل ہو گئی۔ ابا جان نے کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے آپ میرے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ آپ سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا کرایہ ہر ماہ کی ۱۴ تاریخ کو ادا کرتے تھے۔

نئے گھر میں قدم رکھنے کے تیسرے یا چوتھے روز اماں جان پر اچانک غشی کا عالم طاری ہو گیا۔ کوئی پانچ بجے شام کے قریب جب مجھے ان کے پاس لے جایا گیا تو وہ بستر پر بیہوش پڑی تھیں۔ میں نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہوئے کہا کہ اماں جان میری طرف دیکھئے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ لحظہ بھر کے لئے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی شام انہوں نے غشی کے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہا اور رات کو دفن کر دی

گئیں- ان کی وفات کے وقت میری عمر دس برس تھی اور منیرہ کی چار برس۔

اماں جان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بچے ابا جان کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت اماں جان فوت ہوئیں تو ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، روتے روتے اباجان کے کمرے کی طرف گئے۔ وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے کیونکہ ان دنوں خود بھی بیمار رہتے تھے۔ گلا بیٹھ چکا تھا اور صاف بول نہ سکتے تھے۔ میں اور منیرہ ان کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹھک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہا، اور جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی میں مجھ سے گویا ہوئے: ”تمہیں یوں نہ رونا چاہیے! یاد رکھو، تم مرد ہو، اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔“ اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

اماں جان کی بے وقت موت نے اباجان کو پژمردہ سا کر دیا۔ لیکن اب وہ ہم دونوں بچوں کا بے حد خیال رکھنے لگے۔ ہمیں حکم تھا کہ ان سے مل کر اسکول جایا کریں۔ جانے سے پہلے، اور آنے کے بعد وہ ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا کرتے۔ مگر مجھے اس بوسے میں شفقت کی بجائے ہمیشہ معمول کی جھلک دکھائی دیتی گویا وہ ہمیں اس لئے چومتے ہیں کہ کہیں ہم دونوں یہ تصور نہ کر لیں کہ ہمیں اباجان کی محبت میسر نہیں ہے۔ بہرحال، منیرہ کو ان کا قرب حاصل تھا اور وہ رات کو عموماً انہی کے بستر میں سو جایا کرتی۔ اس کی ہر خواہش بغیر کسی حیل و حجت کے پوری کر دی جاتی، اور اگر میں کبھی اسے جھڑکتا یا مار بیٹھتا تو میری شامت آ جاتی۔ انہیں ہم دونوں بہن بھائیوں کے جھگڑے پر بہت رنج ہوتا تھا۔ وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ اور احباب کے یہ کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں، وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے، ان کی تسلی نہ ہوتی۔ مجھ سے بارہا جل کر کہا کرتے ”تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے سنگ دل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

اماں جان کی وفات کے کچھ عرصے بعد وہ مجھے اس خیال سے اپنے ہمراہ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ اس سفر کی دھندلی سی یاد اب تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ بہت لمبا سفر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن اور کئی راتیں ریل گاڑی ہی میں گزریں۔ رات کو علی بخش مجھے اوپر کی برتھ پر سلا دیتا اور اباجان نیچے کی

برتھ پر ہوتے۔ ناشتہ' دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہیں منگوا لیا جاتا۔ جب ہم بھوپال پہنچے تو اسٹیشن پر محمد شعیب استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم موٹر کار میں شیش محل پہنچے جہاں اباجان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی نہایت وسیع و عریض عمارت تھی۔ اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان میں سے گزرتے ڈر آیا کرتا۔

ہم بھوپال میں کوئی دو ایک ماہ ٹھہرے۔ وہاں ڈاکٹر باسط اباجان کے معالج تھے اور ان کے گلے کا علاج برقی شعاعوں سے کرتے تھے۔ مجھے روز پڑھانے کے لئے ایک استاد بھی شیش محل آیا کرتے۔ شیش محل کے قریب' ایک جھیل کے کنارے' میں ڈاکٹر باسط کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ ڈاکٹر باسط کا گھر شیش محل کے مقابل تھا اور اس کے سامنے غالباً ایک وسیع میدان تھا۔

تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز میں اباجان کے ساتھ سید راس مسعود کے ہاں 'ریاض منزل' جایا کرتا۔ وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنہیں میں نے اباجان کو اقبال کہہ کر پکارتے سنا۔ سید راس مسعود قد میں اباجان سے بہت اونچے' قوی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ میں اور اباجان ہفتے میں دو ایک بار رات کا کھانا سید راس مسعود اور بیگم امت المسعود کے ساتھ 'ریاض منزل' میں کھایا کرتے۔ بسا اوقات ہم اور جگہوں پر بھی کھانے پر مدعو ہوتے۔ ایک مرتبہ ہم کسی دعوت سے واپس آ رہے تھے اور گاڑی میں اباجان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی فربہ سی ہنس مکھ خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آئیں۔ بعد میں اباجان نے مجھے بتایا کہ وہ سروجنی نائیڈو تھیں۔ اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے ہاں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کر رکھی تھی کہ جاوید کو ساتھ لائیے۔ سید راس مسعود بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ جب ان دونوں بزرگوں نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جھک کر فرشی سلام کئے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔

بہرحال' بھوپال میں میرا بیشتر وقت اباجان کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چمچہ اس طرح پکڑنا چاہیے اور کانٹا یوں۔ میں فطرتاً کچھ شرمیلا واقع ہوا تھا' اس لئے جب بھی انہیں لوگ وہاں ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیے۔

بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لئے دہلی ٹھہرے۔ وہاں اباجان بذات خود مجھے

تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لئے لے گئے۔ پہلے لال قلعہ دیکھا۔ پھر نظام الدین اولیا گئے۔ اور پھر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اوپر چڑھ جاؤں' اور میں نے ابا جان کو بھی ساتھ آنے کے لئے کہا مگر وہ بولے "تم جاؤ' میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا' اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا' کہیں دہشت سے گر نہ پڑو۔" بالآخر ہم واپس لاہور آ گئے۔

گرمیوں میں ابا جان باہر سوتے اور میری چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جایا کرتی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا' بستر پر کروٹیں بدلتے' کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ اکثر اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اس سے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جاتے۔ بعض اوقات تو وہ علی بخش کو اس غرض کے لئے بھی بلواتے کہ میری پائنتی پر پڑی ہوئی چادر کو میرے اوپر ڈال دو۔

ابا جان کی عادت' سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر' بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ لیکن جب وہ گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے' اور نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار میں ان کے خراٹوں سے ڈر جایا کرتا۔

ابا جان کو میں نے بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی تنہائی میں بیٹھے اپنا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہوتی۔ صبح کو نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت پر ہی نیت باندھ لیتے' دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی' دیواریں گرد و غبار سے اٹی ہوتیں۔ بستر ان کی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے' اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً "ست" تھے اس لئے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے' چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بہت

خوش رہتے۔ کئی بار دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کی وجہ سے بھول جایا کرتے اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلوا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے "کیوں بھئی، میں نے کھانا کھا لیا ہے؟" شام کو گھر کے دالان ہی میں دو ایک چکر لگا لیا کرتے۔ اس کے سوا ان کی زندگی میں بظاہر کامل جمود تھا۔

اماں جان کی وفات کے بعد اباجان صرف ایک بار زنانے میں آئے، اور وہ بھی تب جب مجھے بخار آیا تھا۔ آپ کو پہلی بار تب معلوم ہوا کہ زنانہ حصے میں کمروں کی تعداد کتنی ہے۔ اسی طرح اماں جان کی وفات کے بعد اباجان نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے از سر نو خضاب شروع کرنے کو کہا تو مسکرا کر بولے "میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں"۔ میں نے پھر کہا "لیکن، اباجان! ہم تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔" چنانچہ شاید اس خیال سے کہ بچے میرے سفید بالوں کو دیکھ کر مجھے ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا ------ مگر چند ہی مہینوں بعد پھر چھوڑ دیا اور میری ہمت نہ پڑی کہ ان سے دوبارہ خضاب شروع کرنے کو کہوں۔

اماں جان کی وفات کے کوئی دو ایک سال بعد منیرہ کی دیکھ بھال کے لئے اباجان نے ایک جرمن خاتون کو علی گڑھ سے بلوایا، اور وہ ہمارے یہاں رہنے لگیں۔ ہم انہیں 'آپا جان' کہا کرتے۔ ان دنوں ہماری گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔ ہم سب، اباجان سمیت دوپہر اور رات کا کھانا کھانے والے کمرے میں کھایا کرتے۔ منیرہ اور 'آپاجان' ہر شام اباجان کے پاس بیٹھا کرتیں۔ اباجان جرمن زبان بخوبی جانتے تھے، اس لئے 'آپا جان' سے جرمن ہی میں گفتگو کیا کرتے، اور منیرہ سے بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی، اس لئے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرتی اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

مجھے مصوری سے بھی دلچسپی تھی لیکن اباجان کو میرے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک تصویر بنائی جو اتفاق سے خاصی اچھی بن گئی۔ ان دنوں تایا جان سیالکوٹ سے لاہور آئے ہوئے تھے اور ہمارے ہاں مقیم تھے۔ تایا جان خود انجینئر تھے لیکن جب انہوں نے میری بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بے حد خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر اباجان کو دکھانے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ اباجان کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر میں نے بنائی ہے، لیکن جب یقین آ گیا تو میری حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے میرے لئے خاص طور پر آرٹ کی کتب

منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوروں کے شاہکاروں کو دیکھ کر مصوری کے لئے میرا شوق بڑھے گا لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ جب میری نظر سے مصوری کے شاہکار گزرے تو میں نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر میں ساری عمر بھی کوشش کروں تو ایسی خوبصورت تصاویر نہیں بنا سکتا۔

اباجان کی تمنا تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کشتی لڑا کروں۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرے لئے گھر میں ایک اکھاڑہ بھی کھدوایا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڑ پیلنا یا لنگوٹی باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لئے نہایت مفید ہے۔ پھر بڑی عید کے روز مجھے ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت میں وہاں موجود رہوں۔ لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اباجان میں قوت برداشت کی انتہا تھی، مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں کبوتر بازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیئے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہا کرے۔ انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے۔

اباجان کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے۔ میں نے بھی ان سے قرآن مجید پڑھا ہے۔ ان کی آواز بڑی پیاری تھی۔ اباجان جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے، مجھے بلا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۃ مزمل پڑھی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے "تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے!" اسی طرح مجھ سے ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کو کہا، اور خاص طور پر وہ بند ...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا۔

"وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا!"

تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے اماں جان کی موت پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یارسولؐ اللہ کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

اباجان کو انگریزی لباس سے سخت نفرت تھی۔ مجھے ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کیا کرتے۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو ناپسند کرتے اور کہتے: "اپنے

بال اس طرح مت گوندھا کرو، یہ یہودیوں کا انداز ہے۔" اور اگر میں کبھی غلطی سے اپنی قیصوں یا شلواروں کا کپڑا بوھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے اور کہتے "تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو؟ تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے۔ اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔" میرے لئے بارہ آنے گز سے زائد قیص کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کا بوٹ خریدنا جرم تھا جس کی سزا خاصی کڑی تھی۔ لیکن اگر انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں آج پلنگ پر سونے کی بجائے زمین پر سویا ہوں تو بڑے خوش ہوا کرتے۔

اپنی زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے مجھے سنیما دیکھنے کی اجازت دی۔ وہ ایک انگریزی فلم تھی جس میں نپولین کا عشق دکھایا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ابا جان کو یہ نہ بتایا گیا بلکہ کہا گیا کہ اس فلم میں نپولین کے حالات زندگی ہیں۔ ابا جان دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مجھے اکثر خالد بن ولیدؓ اور فاروق اعظمؓ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے، اور واسکوڈی گاما کو عربوں ہی نے ہندوستان کا راستہ دکھایا۔

مجھے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلہ لگ گئی، اور اس کتاب سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہتا۔ امتحان سر پر آگئے لیکن میں نے الف لیلہ کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کرنے کی بجائے الف لیلہ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں ناکام رہ گیا۔ جب ابا جان کو علم ہوا کہ میں الف لیلہ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں ناکام رہا ہوں تو برہم نہ ہوئے، کہنے لگے "اگر تم امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلہ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔"

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں ابا جان نے کشمیر جانے کا ارادہ بھی کیا کیونکہ ان کے احباب کا اصرار تھا کہ وہ تبدیلی آب و ہوا کی خاطر لاہور سے تھوڑے عرصے کے لئے کہیں باہر چلے جائیں۔ انہوں نے منیرہ اور مجھ سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم بڑے خوش تھے کہ ابا جان کے ہمراہ کشمیر جا رہے ہیں۔ لیکن کشمیر میں ابا جان کا داخلہ ممنوع تھا لہٰذا انہوں نے حکومت سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عرصے تک خط و کتابت جاری رہی۔ مگر جب اجازت ملی تو گرمیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ یوں وہ اپنی زندگی میں آخری بار وادی کشمیر

میں کچھ دن گزارنے سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح بیت اللہ کے حج پر جانے کا قصد بھی کیا، لیکن وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

ابا جان کو معلوم تھا کہ مجھے بڑی بڑی شخصیتوں کے آٹو گراف لینے کا شوق ہے۔ گو وہ میری اس عادت کو نہ تو برا سمجھتے اور نہ سراہتے، لیکن ایک شام انہوں نے مجھے خاص طور پر بلوا کر کہا کہ ہمارے یہاں ایک مہمان آ رہے ہیں، جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو تھوڑی دیر بعد میں کمرہ میں داخل ہوں اور ان سے آٹو گراف دینے کی استدعا کروں۔ چنانچہ جب مہمان تشریف لے آئے تو میں ان کے حکم کے مطابق کمرے میں داخل ہوا۔ ابا جان کے پاس ایک دبلے پتلے مگر نہایت خوش پوش شخص بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہوں میں عقاب جیسی پھرتی تھی۔ اور ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ ابا جان نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں نے آٹو گراف کی کتاب آگے بڑھا دی۔ مہمان نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا "کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟" میں نے کہا "جی نہیں!" اس پر انہوں نے سوال کیا "پھر تم بڑے ہو کیا کرو گے؟" میں خاموش رہا۔ وہ ہنستے ہوئے، ابا جان سے مخاطب ہوئے "کوئی جواب نہیں دیتا!" "یہ جواب نہیں دے گا۔" ابا جان بولے۔ "کیونکہ یہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ اسے بتائیں گے کہ اسے کیا کرنا ہے۔" میری آٹو گراف کی کتاب پر دستخط کر دیے گئے۔ یہ میری خالق پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح سے پہلی ملاقات تھی۔ تب قائداعظم کو پنجاب میں زیادہ لوگ نہ جانتے تھے اور مسلم عوام پاکستان کے تصور سے ابھی روشناس نہ ہوئے تھے۔ بہرحال، میں نے اس مختصر سے عرصے میں یہ اندازہ لگا لیا کہ ابا جان ان کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔

آخری ایام میں ابا جان کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی اس لئے مجھے حکم تھا کہ انہیں ہر روز صبح اخبار پڑھ کر سنایا کروں۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا کر جاتا تو بہت خفا ہوتے۔ اسی طرح رات کو میں انہی کی کوئی غزل گا کر بھی سنایا کرتا۔ ان دنوں مجھے ان کی صرف ایک غزل یاد تھی ع

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر!

ابا جان کے سامنے وہ غزل پڑھنا میرے لئے ایک عذاب ہوا کرتا۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھ جاتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے "شعر پڑھ رہے ہو یا نثر؟"

ان کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ پیشتر ایک شام پنڈت نہرو کو ان سے ملنے کے لئے آنا تھا۔ ابا جان نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ پنڈت نہرو کے استقبال کے لئے ڈیوڑھی میں کھڑا

رہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا پنڈت نہرو کون ہیں؟ کہنے لگے "جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے قائد ہیں' اسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں۔" میں باہر کھڑا پنڈت جی کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ تشریف لائے تو میں نے انہیں "السلام علیکم" کہا اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا' میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر نہایت شفقت سے میری کمر میں بازو ڈال کر میرے ساتھ ابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ابا جان ان سے بڑے تپاک سے ملے اور صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ لیکن پنڈت جی نے نیچے فرش پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ بالآخر وہ فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے' اور ابا جان بستر پر لیٹے ان سے باتیں کرنے لگے۔

ابا جان سے لوگ گھر پر ہی ملنے آتے۔ ہر شام احباب کی محفل جما کرتی۔ ان کی چارپائی کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر آکر بیٹھ جایا کرتے۔ آپ چارپائی پر لیٹے' ان سے باتیں کرتے رہتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے جاتے۔ رات کا کھانا نہ کھاتے تھے' صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے۔ رات گئے تک علی بخش ان کے پاؤں دبا تا اور اگر میں کبھی دبانے بیٹھتا تو منع کر دیتے اور کہتے "تم ابھی چھوٹے ہو' تھک جاؤ گے۔"

مجھے خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی ان کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو تو میں وہاں ضرور موجود رہوں۔ لیکن مجھے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی کیونکہ وہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سو' میں عموماً موقع پا کر وہاں سے کھسک جایا کرتا جس پر انہیں بہت رنج ہوتا اور وہ اپنے احباب سے کہتے "یہ لڑکا نجانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے۔" دراصل اب وہ تنہائی بھی محسوس کرنے لگے تھے اور اکثر اوقات افسردگی سے کہا کرتے "سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں' میرے پاس آکر کوئی نہیں بیٹھتا!"

آخری رات ان کی چارپائی گول کمرے میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ میں کوئی نو بجے کے قریب اس کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا "کون ہے؟" میں نے جواب دیا "میں جاوید ہوں۔" ہنس پڑے اور بولے "جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں!" پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین سے مخاطب ہوئے "چودھری صاحب! اسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا "خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھوا دیجئے گا۔"

اس رات ہمارے ہاں بہت سے ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات مشکل سے کٹے گی۔ کوٹھی کے صحن میں کئی

جگہوں پر، دو دو تین تین کی ٹولیوں میں، لوگ کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ابا جان سے ڈاکٹروں کی یہ رائے مخفی رکھی گئی۔ مگر وہ بڑے تیز فہم تھے۔ انہیں اپنے احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ بساط عنقریب الٹنے والی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس رات معمول سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔

مجھے بھی حالات سے آگاہ نہ کیا گیا اس لئے میں معمول کے مطابق اپنے کمرے میں جا کر سو رہا۔ مگر صبح طلوع آفتاب سے پیشتر مجھے علی بخش نے آکر جنھجھوڑا اور چیختے ہوئے کہا: "جاؤ، دیکھو! تمہارے ابا جان کو کیا ہو گیا ہے۔"

نیند اچانک میری آنکھوں سے کافور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ گھر کے مختلف حصوں سے کراہنے اور سسکیاں بھرنے کی بھنچی ہوئی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ میں اپنے بستر سے اس خیال سے نکلا کہ جا کر دیکھوں تو سہی کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب میں اپنے کمرے سے گزرتا ہوا ملحقہ کمرے میں پہنچا تو منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی، اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ مجھے ابا جان کے کمرے کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ میرے ساتھ چل رہی تھی۔ ہم دونوں ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر رک سے گئے۔ میں نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ ان کے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ ابا جان کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلے کی طرف تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے، اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔

منیرہ کی ٹانگیں دہشت سے کانپ رہی تھیں۔ اس نے میرے بازو کو بہت زور سے پکڑ رکھا تھا اور مجھے اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مگر میں کوشش کے باوجود بھی نہ رو سکتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ اگر میں رو دیا تو وہ ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے، اپنی انگلی کے اشارے سے ہم سے قریب آنے کو کہیں گے۔ اور جب ہم ان کے قریب پہنچ جائیں گے تو وہ اپنے ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیں گے، پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے کہیں گے:

"تمہیں یوں نہ رونا چاہئے۔ یاد رکھو تم مرد ہو، اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے!"

مرکزیہ مجلس اقبال اور صدر محمد ضیاء الحق☆

مرکزیہ مجلس اقبال کے نائب صدر کی حیثیت سے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ میں جناب صدر محمد ضیاء الحق کو لاہور میں یوم اقبال کی صدارت قبول کرنے پر ان کا شکریہ ادا کروں۔

حضرت قائداعظم نے ایک مرتبہ لاہور میں، یوم اقبال کی تقریب پر، اپنے خطاب میں فرمایا تھا کہ اگر ایک طرف کلام اقبال ہو اور دوسری طرف کسی ریاست کی سربراہی، اور مجھ سے ان میں سے ایک کو منتخب کرنے کے لئے کہا جائے تو میں کلام اقبال کا انتخاب کروں گا۔ کلام اقبال دراصل فکر اقبال کا آئینہ ہے، اور قائداعظم کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ نظریہ چونکہ فکر کی پیداوار ہے، اس لئے اسے بہرصورت ترجیح دی جانی چاہیے۔ اگر نظریہ ہے تو ریاست ہے، اور اس کی سربراہی بھی۔ لیکن اگر آپ نظریے کو فراموش کر دیں تو نہ ریاست کا وجود رہے گا نہ سربراہی کا!

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی نظریاتی اساس کے تحفظ کے سلسلے میں لازم تھا کہ دیگر اہم امور نبٹانے کے ساتھ ساتھ، ابتدا ہی سے حضرت علامہ اقبال اور حضرت قائداعظم کی ہر شے، تحریر، نشان، مقام بلکہ ہر یادگار چیز کو محفوظ کر لیا جاتا کیونکہ ان دونوں قابل تعظیم ہستیوں کی وابستگی نظریہء پاکستان کے ساتھ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔

جہاں تک حضرت علامہ کا تعلق ہے، ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت مرکزیہ مجلس اقبال کے اراکین کے سامنے سب سے اہم مسئلہ ان کے مزار کی تعمیر تھا۔ مرکزیہ مجلس اقبال،

☆ یوم اقبال۔ ۹، نومبر ۱۹۸۶ء کو پڑھا گیا۔

حضرت علامہ کی وفات کے فوراً بعد' ان کے چند احباب نے قائم کی تھی اور وہ ہر سال یوم اقبال کی تقریب منعقد کرنے کا اہتمام کرتی تھی' اور اب تک کرتی ہے۔ مزار اقبال کی تکمیل مرکزیہ مجلس اقبال کے اراکین اور حضرت علامہ کے عقید تمندوں کے چندے سے ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ میرے علم کے مطابق حکومت پاکستان نے اس معاملے میں کسی خصوصی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ شاید حکومت اپنے ابتدائی ایام میں اس قابل ہی نہ تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء میں حضرت علامہ کے دست راست اور مرکزیہ مجلس اقبال کے پہلے صدر جناب چودھری محمد حسین مرحوم کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے اس وقت کی مرکزی حکومت کو مرکزیہ مجلس اقبال کی طرف سے ایک خط تحریر کیا جس میں استدعا کی کہ حضرت علامہ کی آخری رہائش گاہ میں جہاں ان کی اور حضرت قائداعظم کی ملاقاتیں ہوتی رہیں' سب آثار و نوادرات محفوظ کر لئے جائیں------- مگر اس خط کا کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

مزار اقبال کی تکمیل کے بعد مرکزیہ مجلس اقبال کے اراکین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ حکومت پاکستان حضرت علامہ سے متعلق سب آثار و نوادرات ایک مقام پر محفوظ کر لے' ان کے افکار و نظریات کی پاکستان کے اندر اور دیگر مسلم ممالک میں تشہیر کا بندوبست کیا جائے' ان کی یاد کو تازہ رکھنے کی خاطر لاہور میں کسی مناسب قطعہ ء اراضی پر ایوان اقبال تعمیر کرنے کا اہتمام کیا جائے' اور ہر سال یوم اقبال کے موقع پر قومی تعطیل ہوا کرے۔ مگر یہ خواہشات پوری نہ ہوئیں۔ پاکستان کی تغیرپذیر حکومتیں یوم اقبال کے موقع پر قومی تعطیل کا اعلان کرنے سے اس لئے گریز کرتی رہیں کہ کہیں بنگال' نذرالاسلام کی خاطر قومی تعطیل کا مطالبہ نہ کرنے لگے۔ کچھ مدت تک انتظامیہ کے افسروں کی سفارش پر یوم اقبال کے موقع پر صرف پنجاب میں تعطیل کی تجویز حکومت پاکستان کے زیر غور رہی۔ گویا پاکستان کے ارباب بست و کشاد کو یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ حضرت علامہ اپنی تمام عمر مسلمانوں میں اسلامی عصبیت کی بیداری کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور انہوں نے ہر قسم کے فرقہ وارانہ یا علاقائی تعصب کے قلع قمع کی خاطر اپنا جہاد جاری رکھا۔ حضرت علامہ عصبیت اور تعصب کے معنوں میں امتیاز واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "عصبیت اور چیز ہے' اور تعصب اور چیز ہے۔ عصبیت کی جڑ حیاتی ہے' اور تعصب کی نفسیاتی۔ تعصب ایک بیماری ہے جس کا علاج اطبائے روحانی کے علاج سے ہو سکتا ہے۔ عصبیت زندگی کا ایک خاصہ ہے جس کی پرورش اور تربیت ضروری ہے۔ اسلام میں انفرادی

اور اجتماعی عصبیت' دونوں کی حدود مقرر ہیں۔ انہی کا نام شریعت ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے' بلکہ ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ان حدود کے اندر رہنا باعث فلاح ہے' اور ان سے تجاوز کرنا بربادی۔"

حضرت علامہ کے نزدیک فرد کی طرح معاشرہ بھی زندگی کے مختلف مراحل یعنی بچپن' بلوغت' ادھیڑ عمر اور بڑھاپے سے گزرتا ہے۔ بڑھاپے کے عالم میں ہر معاشرہ اپنی ناتوانی کے سبب' مستقبل سے بے نیاز ہو کر' اپنے ماضی ہی میں پناہ ڈھونڈتا ہے' تغیر کی حقیقت قبول کرنے سے گریز کرتا ہے اور اپنی قدامت پسندی کی وجہ سے مختلف قسم کے تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالآخر انہی عوارض کے زیراثر اس کا انتشار یا اس کی موت واقع ہوتی ہے اور اس معاشرے کا نام و نشان صفحہ ء ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ لیکن ایسے معاشرے میں اگر اس کی اصل عصبیت از سر نو بیدار کر دی جائے تو اس کا احیاء عمل میں آ جاتا ہے۔ حضرت علامہ کا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے برصغیر کے ضعیف' ناتواں اور مغلوب مسلم معاشرے میں از سرنو اسلامی عصبیت بیدار کی اور غلاموں کو اسلامی اتحاد کا سبق دے کر آزادی کا رستہ دکھایا۔ یعنی وہ برصغیر میں اس اسلامی انقلاب کے داعی تھے جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوا۔ پس قیام پاکستان' جدید عالم اسلام میں احیائے اسلام کی بنا پر' پہلا اسلامی انقلاب تھا ------ اور حضرت علامہ کی نگاہ میں یہ پہلا قدم تھا۔ اس منزل مقصود کی تحصیل کے لئے' جو ان کے خوابوں میں اسلامستان کی صورت میں آباد ہے' ان کے ہاں اسلام کا تصور قوت' شوکت' عظمت اور غلبے کے بغیر نامکمل ہے ------ لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان میں پاکستان کی نظریاتی اساس کے خالق اور صحیح معنوں میں شاہین اسلام کو "پنجاب کے پنجرے" میں بند کر دینے کی تجویز کتنی بڑی احسان فراموشی تھی۔ شاید حضرت علامہ کو اپنے گناہ کی سزا کا علم تھا' اسی لئے وہ فرما گئے۔

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے مثال زمانہ کم پیوند
جو کوکنار کے خوگر تھے' ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے
وہ پرشکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند

تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقام شوق و سرور و نظر سے محرومی!

پھر حکومتی حلقوں کی طرف سے کہا گیا کہ لاہور شہر میں تعطیل ہو جایا کرے۔ مگر پرستاران اقبال نے ان سب تجاویز کو رد کر دیا کیونکہ ایسی تجاویز سے تو بہتر یہی تھا کہ یوم اقبال کے موقع پر کوئی بھی تعطیل نہ کی جائے۔

۱۹۵۱ء میں حکومت پاکستان نے ایک قانون وضع کیا جس کے تحت کراچی میں اقبال اکادمی پاکستان' وجود میں آئی۔ گو اقبال اکادمی کا بنیادی مقصد حضرت علامہ کے نظریات و افکار کی تشہیر کے لئے کتب شائع کرنا یا ادبی مجالس منعقد کرنا تھا' لیکن قانون میں چند خامیوں کے سبب اس میں ترمیم کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ گیارہ برس بعد اقبال اکادمی پاکستان آرڈی ننس ۱۹۶۲ء کے نفاذ کے ذریعے خامیاں دور کرنے کی کوشش کی گئی۔

مرحوم صدر محمد ایوب خان کے دور میں پہلی مرتبہ حضرت علامہ کی سیالکوٹ اور لاہور کی رہائش گاہوں اور ان سے متعلق آثار و نوادرات کو محفوظ کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی۔ سیالکوٹ میں ان کا آبائی گھر حکومت پاکستان نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ لاہور کی بعض رہائش گاہوں نیز کیمبرج' لندن' ہائیڈل برگ اور میونخ میں بھی ان کی رہائش گاہوں پر ان کے نام سے یادگاری پتھر نصب کئے گئے۔ انہی ایام میں یہ خبر بھی پھیلی کہ میونخ یونیورسٹی میں محفوظ حضرت علامہ کے' ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے' تحقیقی مقالے کا اصل نسخہ ہندوستان پہنچ گیا ہے اور اس کی دوسری کاپی جرمنی کے کسی شہر کے جس کتب خانے میں پڑی تھی' وہ عالمی جنگ کے دوران میں بمباری سے تباہ ہو گیا۔ اس وقت کے گورنر پنجاب نے مرکزیہ مجلس اقبال سے لاہور میں ایک قطعہ ء اراضی پر ایوان اقبال تعمیر کروا دینے کا وعدہ بھی کیا۔ نیز صدر محمد ایوب خان نے حضرت علامہ کی آخری رہائش گاہ 'جاوید منزل' میں میوزیم کی صورت میں ان کے آثار و نوادرات کو محفوظ کرنے کے بارے میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لیکن ان میں سے کسی تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔

۱۹۷۲ء میں عجیب و غریب صورت پیدا ہوئی۔ حکومت ہند نے ۱۸۷۳ء کو حضرت علامہ کا سال ولادت تصور کرتے ہوئے ۱۹۷۳ء میں ان کا صد سالہ جشن ولادت منانے کا اعلان کر دیا' اور اس مقصد کے لئے دہلی میں ہندوستان کی اس وقت کی وزیراعظم کے زیر صدارت ایک نیشنل کمیٹی قائم کی گئی۔ گویا سیکولر ہندوستان کو حضرت علامہ کا صد سالہ جشن ولادت منانے کا خیال اسلامی جمہوریہ پاکستان سے پہلے آیا۔ خیر' حکومت پاکستان نے بھی ہندوستان کی

طرح ان کا صد سالہ جشن ولادت منانے کا اعلان کیا، اور یہاں بھی اس وقت کے وزیراعظم کے زیر صدارت تاریخ ولادت کے متعلق کئی برسوں سے جو تنازعہ چلا آ رہا تھا، وہ وزارت تعلیم کے قائم کردہ ایک کمیشن نے یہ اعلان کر کے ختم کر دیا کہ ان کی صحیح تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا کہ ۱۹۷۷ء میں صد سالہ جشن ولادت اقبال منایا جائے گا۔

جناب صدر!

یہ پہلا صد سالہ جشن ولادت اقبال نہایت شان و شوکت کے ساتھ آپ ہی کے عہد میں منایا گیا اور اس کا افتتاح بھی آپ ہی کے ہاتھوں سے ہوا۔ آپ نے حضرت علامہ کی ذات اور فکر کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے نہ صرف ہر سال یوم ولادت اقبال کے موقع پر قومی تعطیل کا اعلان کرنے کی جرائت کی بلکہ ان کی آخری رہائش گاہ 'جاوید منزل' کو حکومت کی تحویل میں لے کر وہاں علامہ اقبال میوزیم قائم کرنے کی ہدایات جاری کیں۔ اس میوزیم میں حضرت علامہ کے آثار و نوادرات کی نمائش جاپانی ماہرین نے ایسی خوبصورتی سے کی ہے کہ سارے جنوبی ایشیا میں یہ میوزیم اپنی مثال آپ ہے۔ اس میوزیم کا افتتاح بھی آپ نے کیا۔ آپ ہی کی ذاتی دلچسپی اور کوشش سے حکومت پنجاب نے لاہور میں ایک نہایت ہی مناسب قطعہ ء اراضی مختص کر دیا جس پر اب ایوان اقبال کی عالی شان عمارت تعمیر کی جا رہی ہے۔ آپ ہی کی ہدایت کے تحت حضرت علامہ کی تعلیمات کی تشہیر قومی ٹیلی وژن، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ سے باقاعدگی سے ہونے لگی ہے۔ ملک بھر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کلام و فکر اقبال کے موضوع پر ادبی مجالس اور سیمینار منعقد ہوتے ہیں اور طلبہ و طالبات میں اچھے مقالے لکھنے پر انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ ہائیڈل برگ اور کیمبرج یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اقبال قائم کئے گئے ہیں۔ ولادت اقبال کے روز ہر سال پاکستان سے باہر، جن ممالک میں بھی پاکستانی سفارت خانے موجود ہیں، یوم اقبال کی تقاریب منعقد کی جاتی ہیں۔ نیز حضرت علامہ پر بہترین کتب تحریر کرنے والے ملکی و غیر ملکی مصنفین کو صدارتی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ "اقبال اکادمی" اور صوبائی ادارے "بزم اقبال" کی تشکیل نو کی گئی ہے، اور یہ دونوں ادارے حضرت علامہ کی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر کئی زبانوں میں نہایت مستند کتب کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ ان سب اقدامات کے باعث ملک بھر میں اقبال فہمی کے لئے ایک نیا تجسس پیدا ہو گیا ہے۔ حضرت علامہ کی تعلیمات کی تشہیر کے سلسلے میں مرکزیہ مجلس اقبال کی بیشتر خواہشات چونکہ آپ کی خصوصی توجہ کے

سبب پوری ہوئی ہیں، اس لئے حضرت علامہ کا ہر پرستار آپ کی ان خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا اور آپ کا تہہ دل سے ممنون ہے۔ اسی تشکر کے اظہار کی خاطر آج آپ کو یوم اقبال کی تقریب کی صدارت قبول کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔

جناب صدر!

مرکزیہ مجلس اقبال کے اراکین اب آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ایوان اقبال کی عمارت کی تکمیل جس قدر جلد ممکن ہو سکے، کی جائے اور اس کام کو جلد پایہ ء تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک اعلیٰ اختیارات کی حامل نگران کمیٹی قائم کی جائے۔ مسلم ممالک، اور خصوصی طور پر عرب ممالک میں حضرت علامہ کی تعلیمات کی تشہیر کی اشد ضرورت ہے کیونکہ ایسے بعض ممالک میں ان کے افکار و نظریات کے متعلق غلط فہمیاں موجود ہیں۔ آپ ان غلط فہمیوں سے خود آگاہ ہیں کیونکہ کچھ مدت ہوئی آپ نے اس سلسلے میں مجھے کسی اخبار کے تراشے کے ساتھ ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں ایسی غلط فہمیوں کی موجودگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ انہیں رفع کرنے کے لئے حضرت علامہ کی تصانیف کے مستند تراجم کے ذریعے ان کی تعلیمات کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ ہی کی تحریک پر پاکستان سے تین افراد پر مشتمل ایک وفد جس میں میں بھی شامل تھا، قاہرہ میں یوم اقبال کی سرکاری تقاریب میں شرکت کے لئے مصر گیا۔ وفد کے اراکین جناب جسٹس سید محمد کرم شاہ صاحب اور پروفیسر مرزا محمد منور نے قاہرہ، عین شمس اور الازہر یونیورسٹیوں میں فکر اقبال پر عربی میں خطبات دیئے اور سفیر پاکستان کی وساطت سے مصر کے کئی معروف اقبال شناسوں سے رابطہ قائم کیا۔ یہ دورہ نہایت کامیاب رہا۔ اسی طرح حکومت ایران کی دعوت پر مجھ سمیت پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد حضرت علامہ پر ایک بین الاقوامی کانگرس میں شرکت کے لئے تہران پہنچا، اور وہاں تہران اور مشہد کی یونیورسٹیوں میں پاکستانی وفد کے اراکین کے، فکر اقبال پر فارسی میں خطبات بے حد پسند کئے گئے۔ اب حال ہی میں دمشق (شام) اور دبئی میں یوم اقبال کی سرکاری تقاریب میں شرکت کے لئے دعوت نامے موصول ہوئے ہیں جہاں پروفیسر مرزا محمد منور ڈائریکٹر اقبال اکادمی تو انشاء اللہ تشریف لے جائیں گے، لیکن عدیم الفرصتی کے سبب میرے لئے جا سکنا محال ہے۔

مسلم ممالک میں، بالعموم عرب ممالک میں، بالخصوص فکر اقبال میں گہری دلچسپی کے پیش نظر ضروری ہے کہ حضرت علامہ کی تعلیمات کی تشہیر کی خاطر آپ کے زیرہدایت ایک جامع منصوبہ تیار کیا جائے۔ اسی طرح حضرت علامہ کی کتب اور ان کی تعلیمات سے متعلق مستند

تصانیف کے تراجم مسلم زبانوں میں کرنے کا کام تیز کر دیا جائے۔ نیز، مسلم ممالک کی اہم یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اقبال قائم کئے جائیں تاکہ پاکستانی مسلمانوں کی یہ نسل رفتہ رفتہ حضرت علامہ کے اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو سکے جو انہوں نے حضرت سید جمال الدین افغانی کی فکری راہنمائی میں اتحادِ عالمِ اسلام یا اسلامستان کو وجود میں لانے کے متعلق دیکھا تھا۔

• میں ایک بار پھر پرستارانِ اقبال اور حاضرینِ محفل کی طرف سے آپ کی تشریف آوری پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور آخر میں حضرت علامہ کے اشعار میں ایک پیغام آپ کو سنا کر رخصت چاہوں گا۔

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں، جو تری نگاہ میں ہے
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے!

○

کشمیر۔ اقبال کی نظر میں☆

آج سے تقریباً چار سو پچاس برس قبل علامہ اقبال کے جس کشمیری جد اعلیٰ نے اسلام قبول کیا' ان کا لقب حضرت بابا لول حجؒ تھا۔ لول' لال یا لالہ کشمیر میں پیار یا عزت کا لفظ سمجھا جاتا ہے۔ آپ کا وطن پرگنہ آدون کے موضع چکو میں تھا۔ قبول اسلام سے پیشتر ذات کے برہمن تھے اور گوت سپرو تھی۔ پیشہ زراعت کاری اور زمینداری تھا۔ مگر جب فقر اختیار کیا تو سب باتوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ آپ نے کئی حج پاپیادہ کئے اور بارہ سال کشمیر سے باہر' سیاحت میں رہے۔ واپس آنے پر اشارہ غیبی پا کر سلسلہ ریشیان کے بانی حضرت شیخ نورالدین ولی رشی کے چوتھے خلیفہ حضرت بابا نصرالدین کے مرید ہوئے۔ آپ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے مشائخ میں سے تھے۔ آپ کی قبر چرار شریف میں احاطہ مزار حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے اندر اپنے مرشد حضرت بابا نصرالدینؒ کے جوار میں ہے۔ اقبال کے بزرگوں نے اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جب کشمیر افغانوں کے قبضے سے نکل کر سکھوں کے تسلط میں آ رہا تھا' عدم تحفظ کے عالم میں' ہجرت کی۔ چونکہ اس زمانے میں ان کے بزرگوں کا وطن تحصیل کولگام کے علاقے میں تھا' اس لئے وہ بانہال کو طے کرتے ہوئے جموں کے راستے سیالکوٹ پہنچے اور یہیں آ کر مقیم ہو گئے۔

اقبال ابتداء ہی سے کشمیر اور کشمیریوں سے محبت رکھتے تھے۔ ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ۱۸۹۶ء میں لاہور سے ہوا اور انجمن کشمیری مسلمانان لاہور ان کو لاہور کی کشمیری برادری کے بزرگوں سے متعارف کرانے کا سبب بنی۔ اقبال اس انجمن کی کارروائیوں میں سرگرمی سے

☆ ۵ فروری ۱۹۷۷ء یوم اقبال کے موقع پر مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں پڑھا گیا۔

حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں محمد دین فوق کے زیرِ ادارت کشمیری گزٹ لاہور جاری ہوا جو کشمیری قوم کا ترجمان اخبار تھا۔ کشمیری گزٹ کے شماروں میں اقبال کے چند قطعات ملتے ہیں جو انہوں نے غالباً انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کے کسی اجلاس میں پڑھے تھے۔ ان میں سے ایک قطعے میں ارشاد کرتے ہیں۔

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اس دست جفاکیش کو یارب! جس نے
روح آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

اقبال انجمن کشمیری مسلمانان سے کئی سال تک منسلک رہے اور کشمیری برادری کے تنظیمی اور اصلاحی کاموں میں دلچسپی لیتے رہے۔ بعد میں اسی انجمن کی بنیادوں پر لاہور میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس وجود میں آئی۔ اقبال اس کانفرنس کے پہلے جنرل سیکرٹری تھے۔ اس کانفرنس کے اجلاس پنجاب کے کئی شہروں میں منعقد ہوئے جن میں کشمیریوں کے مطالبات کی زبردست حمایت کی گئی۔ کانفرنس نے کشمیر میں تعلیم کے فروغ اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

اقبال اپنی زندگی میں پہلی بار جون ۱۹۲۱ء میں چند مقدموں کی پیروی کے سلسلے میں کشمیر گئے اور تقریباً دو ہفتے سرینگر میں ٹھہرے۔ اس مختصر سے دورے میں انہوں نے کشمیری مسلمانوں کو جن مصائب و آلام میں مبتلا دیکھا، اس کا ذکر بعد کی کئی نظموں میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں "پیام مشرق" کی تین نظمیں "کشمیر" "غنی کشمیری" اور "ساقی نامہ" خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ پہلی نظم تو سرزمین کشمیر کے حسین مناظر کی تعریف میں ہے۔ دوسری نظم میں کشمیر کے ایک معروف شاعر طاہر غنی کے استغنا کا ذکر کرتے ہیں کہ جب وہ گھر کے اندر ہوتا تو دروازہ مقفل رکھتا اور جب گھر سے باہر جاتا تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتا۔ جب لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ اس گھر کی سب سے قیمتی شے میں ہوں۔ سو، جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو اس کی حفاظت کے لئے دروازہ بند رکھتا ہوں، اور جب باہر چلا جاتا ہوں تو گھر میں باقی رہ ہی کیا جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے!

تیسری نظم "ساقی نامہ" اقبال نے نشاط باغ میں بیٹھ کر تحریر کی تھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کشمیری کہ با بندگی خوگرفتہ بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے خودی ناشناسے' زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او نصیب تنش جامہ ء تار تارے
نہ در ، دیدۂ او فروغ نگاہے نہ در سینہ ء اور دل بے قرارے
ازاں مے فشاں قطرۂ برکشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

(یعنی غلامی نے کشمیریوں کی فطرت کو ایسا بدلا ہے کہ انہوں نے بت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ان میں کوئی بلند خیالی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ اپنی خودی سے بیگانہ ہونے کے سبب وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہیں۔ ان کی محنت کی بدولت صاحب ثروت لوگ تو ریشمی قبائیں پہنتے ہیں مگر ان کے اپنے نصیب میں تن پر پھٹے ہوئے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں۔ نہ ان کی نگاہوں میں روشنی کی چمک ہے نہ ان کے سینوں میں دل بے قرار کی دھڑکن ہے۔ اے خداوند تعالیٰ! اس شراب یعنی جذبہ ء حریت سے کشمیری مسلمانوں کو بھی سرشار کر دے تاکہ وہ آزادی کی نعمت سے مالا مال ہو سکیں)۔

کشمیریوں کو اپنے گزشتہ تمدن کی عظمت کا احساس دلانے کے لئے اقبال کی خواہش تھی کہ ادبی کے تعلیم یافتہ مسلمان اپنی ثقافت کے تحفظ کے لئے کوئی ادارہ قائم کریں۔ وہ کشمیر کے فارسی ادب کی بڑی قدر کرتے تھے اور کشمیر کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کی ہر طرح سے اعانت اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔ اس عقیدے کا اظہار ان کے ایک خط محررہ ۱۲ر مارچ ۱۹۳۲ء میں موجود ہے جو کشمیر کے ایک مشہور شاعر غلام احمد مہجور کے نام لکھا گیا۔

کشمیر کے صوفیائے کرام میں سے اقبال حضرت سید علی ہمدانیؒ کی شخصیت اور کارناموں سے بے حد متاثر تھے۔ شاہ ہمدانؒ کے کمالات کا اعتراف "جاوید نامہ" میں کرتے ہیں۔ "جاوید نامہ" میں اقبال، طاہر غنی اور شاہ ہمدان کی ارواح سے ملتے ہیں اور کشمیر کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس تاریخی سانحے کا ذکر بھی آتا ہے جب انگریز حکمرانوں نے کشمیر کو پچھتر (۷۵) لاکھ روپے کے عوض گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اقبال، شاہ ہمدانؒ سے پوچھتے ہیں "کشمیر کے لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ انہیں مشکلات نے گھیر رکھا ہے۔ اگرچہ مسلمانان کشمیر عقل و فہم، علم و فن اور صنعت و حرفت میں کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں مگر وہ عرصے سے کافروں کے غلام ہیں اور اس مسلسل غلامی کے سبب وہ ہمت ہار بیٹھے ہیں، حالانکہ یہ قوم کسی وقت حکومت کا نظم و نسق چلانے والی اور دشمن کی فوجوں کا منہ پھیرنے والی تھی۔ کیا وجہ ہے کہ اس ملک میں کوئی سلطان شہاب الدین پھر پیدا نہیں ہوتا؟"

شاہ ہمدانؒ جواب میں اقبال کو مسلمان کی زندگی کا راز بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ انسان دو عناصر یعنی جان اور تن سے مل کر بنا ہے۔ جان کی حفاظت کے لئے جسم کو قربان کرنا زندہ رہنے کی اولین شرط ہے۔ ہر انسان اپنے جسم کا قیدی ہے۔ لیکن، جو شخص خود آگاہ ہو جاتا ہے، وہ جسم کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ پھر یہ جان جس کو بچانے کی خاطر وہ پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے، اس کی نگاہ میں ہوا سے بھی زیادہ سستی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے سر پر کفن باندھ کر نہایت اطمینان سے میدان کارزار میں کود پڑتا ہے اور ابدی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ پس، اگر تو اپنی جان قربان کر دے تو تیری جان ہمیشہ کے لئے تیری ہو جائے گی۔ لیکن اگر تو موت کے خوف سے گھر میں دبک کر بیٹھ رہے گا تو جان لے کہ تیری جان تیرے پاس تھوڑے عرصے کی مہمان ہے کیونکہ آخر تجھے ایک دن مرنا ہے۔

اقبال کے اردو یا فارسی کلام میں جہاں کہیں بھی کشمیر یا کشمیریوں کا ذکر آیا ہے، نہایت اخلاص اور دل سوزی کے ساتھ آیا ہے۔ انہوں نے کشمیریوں کو ہمیشہ خودی اور خودشناسی کا سبق دیا اور وہ تمام عمر ان کے حقوق و مطالبات منوانے کی خاطر جدوجہد کرتے رہے۔ بعض اوقات تو وہ کشمیریوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے جذبات کی ایسی رو میں بہہ جاتے تھے کہ ظالموں سے باز پرس کرنے والی ہستی یعنی خداوند تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگتے کہ وہ جلد اپنی گرفت مضبوط کیوں نہیں کرتا:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہ سوزناک
مرد حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردی ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقان پیر

آہ' یہ قوم نجیب و چرب دست و تردماغ
ہے کہاں روز مکافات؟ اے خدائے دیر گیر!

۱۹۳۱ء کی تحریک حریت کشمیر کے دوران اقبال کشمیری مسلمانوں کے سب سے بڑے ہمدرد تھے۔ جب کشمیر مسلم کانفرنس پر حکومت کشمیر نے پابندیاں عائد کر دیں تو پنجاب کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی بیچارگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ مجلس احرار نے ان مظالم کے خلاف مظاہرے کئے اور سینکڑوں کی تعداد میں جتھے بھیج بھیج کر کشمیر کی جیلیں بھر دیں۔ اس زمانے میں اقبال نے کشمیر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے' آئینی ذرائع سے' مسلمانان کشمیر کو انسانی حقوق دلانے کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ بعد میں کشمیر کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ انہی ایام میں اقبال آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے صدر بھی تھے۔ لہٰذا انہوں نے مسئلہ ء کشمیر کو کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سے بیانات اس زمانے کے اخباروں میں نظر آتے ہیں' اور اب ان میں سے بیشتر کتابی صورت میں منتقل کئے جا چکے ہیں۔ ۳۰ر جون ۱۹۳۳ء کو مسئلہ ء کشمیر کے متعلق انہوں نے مسلمانان ہند سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"تحریک خلافت کے بعد تحریک کشمیر ہی ایک ایسی تحریک ہے جس سے خالص اسلامی جذبات کو عملی تشکیل کا موقع ملا اور اس نے قوم کے مردہ تن میں حیات تازہ کی لہر ایک دفعہ پھر دوڑا دی ..... کشمیر کا مسئلہ تمام مسلمانان ہندوستان کی سیاسی حیات و موت کا مسئلہ ہے۔ اہل کشمیر سے ناروا سلوک' ان کی جائز اور دیرینہ شکایات سے بے اعتنائی اور ان کے سیاسی حقوق کو تسلیم نہ کرنا' مسلمانان ہند کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ حق بات بھی یہی ہے۔ اہل خطہ' ملت اسلامیہ کا جزو لاینفک ہیں کہ ان کی تقدیر کو اپنی تقدیر نہ سمجھنا تمام ملت کو تباہی و بربادی کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک مضبوط و مستحکم قوم بننا ہے تو دو نکتوں کو ہر وقت ذہن میں رکھنا ہو گا۔ اول یہ کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کو مستثنیٰ کرتے ہوئے' حدود ہند کے اندر' جغرافیائی اعتبار سے کشمیر ہی وہ خطہ ہے جو مذہب اور کلچر کی حیثیت سے خالصتاً اسلامی ہے ..... دوسری بات جسے مسلمانان ہند کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے' یہ ہے کہ ان کی

تمام قوم میں سب سے بڑھ کر اگر صنائی و ہنرمندی اور تجارت کو بخوبی پھیلانے کے جوہر نمایاں طور پر کسی طبقے میں موجود ہیں تو وہ اس اہل خطہ کا گروہ ہے ..... بہرحال' اہل خطہ 'قومیت اسلامیہ ء ہند' کے جسم کا بہترین حصہ ہیں۔ اور اگر وہ حصہ درد و مصیبت میں مبتلا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ باقی افراد ملت فراغت کی نیند سوئیں۔"

اقبال سمجھتے تھے کہ کشامرۂ کشمیر اگر خودشناس و خود آگاہ ہو جائیں تو اپنی ذہانت کے سبب دنیا کی رہبری کرنے والی شخصیات پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک نظم میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہندوستان کو آزادی کی دعوت سب سے پہلے کشمیریوں نے دی۔ فرماتے ہیں۔

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد | صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگاں زندہ دل | لالہ ء احمر ز روئے شاں خجل!
اصل شاں از خاک دامن گیر ماست | مطلع ایں اختراں کشمیر ماست

غالباً ان کا اشارہ پنڈت موتی لعل نہرو اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی طرف تھا جو اصلاً کشمیری تھے۔ لیکن اقبال خود بھی تو کشمیری تھے۔ اگر ہندوستان کو آزادی کی نعمت کشمیری برہمنوں کے ہاتھوں نصیب ہوئی تو برصغیر کی قومیت اسلامیہ کے لئے آزاد مسلم ریاست یعنی پاکستان کا تصور بھی تو ایک کشمیری مسلمان ہی کے ذہن کی پیداوار تھا۔

اقبال کو تحریک کشمیر کے ایام سے کشمیر کی حدود میں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سال یعنی ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ کشمیر کی سیر کے لئے لے جانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں اجازت کی تحصیل کی خاطر حکومت کشمیر کو ماہ جون میں تحریر کیا گیا' لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بالآخر غالباً ماہ اکتوبر میں اجازت نامہ موصول ہوا' لیکن تب موسم سرما شروع ہو چکا تھا' اور ایسے موسم میں وہ سفر کے قابل نہ تھے۔ پس' زندگی میں آخر بار وہ اپنے وطن کی زیارت سے محروم رہے۔

اقبال نے مسلمانان کشمیر کو برصغیر کی قومیت اسلامیہ کے جسم کا بہترین حصہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کی تقدیر مسلمانان کشمیر کی تقدیر سے منسلک ہے۔ لہذا اقبال کی نگاہ میں کشمیر اس آزاد مسلم ریاست' یعنی پاکستان کا جزو لاینفک ہے جس کا تصور انہوں نے پیش کیا تھا۔ پس' یہ ایک کشمیری ہی کی لگائی ہوئی آگ ہے جو پاکستان کے عوام اور ان کی قیادت آج تک کشمیر کو بھارتی تسلط سے آزاد کرانے کی خاطر پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان اگر کوئی نزاعی معاملہ ہے تو وہ مسئلہ ء کشمیر ہی ہے

میں ولادت علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں حکومت آزاد کشمیر کی قائم کردہ مجلس عمل کے صدر اور اراکین کا ممنون ہوں کہ آزاد کشمیر کی سرزمین میں ان تقریبات کے آغاز کی خاطر انہوں نے مجھے بلایا۔ یہ میرے لئے بڑے فخر کا مقام ہے۔ بلاشبہ اقبال کو اس موقع پر خراج عقیدت پیش کرنے میں کشمیر اور بالخصوص آزاد کشمیر کا حق سب سے فائق ہے۔ کشمیر کی خاک نے بڑی بڑی عظیم شخصیتیں پیدا کیں۔ مگر بیسویں صدی میں اس کے اس فرزند جلیل کے ہاتھوں جنوبی ایشیا میں اسلام کا احیاء ہوا' اس نے مسلمانان برصغیر کے لئے ایک علیحدہ آزاد مسلم ریاست' پاکستان کا تصور پیش کیا' اس نے دنیائے اسلام کے اتحاد کو وجود میں لانے کے لئے مسلمانان عالم کے دلوں میں عملی اقدامات کرنے کا عزم پیدا کیا' اس نے مغلوب اقوام مشرق کو حریت و آزادی کا سبق دیا اور غالب اقوام مغرب کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے اپنا استحصالی رویہ جاری رکھا تو ان کا نام و نشان صفحہ ء ہستی سے مٹ جائے گا۔ اخلاقی بنیادوں پر انسانی اخوت کے اس علمبردار کی تعلیمات قرآن کریم سے اخذ کردہ تھیں اور اس کے افکار کی آفاقیت اور انداز بیان کی ندرت کا سبب عشق رسولؐ تھا۔

مجھے یقین ہے کہ اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے اس سال آزاد کشمیر میں بہت کچھ کیا جائے گا' مگر چند باتیں خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ہمیشہ مسلمانان کشمیر کو حریت و آزادی کی تحصیل کے لئے تگ و دو جاری رکھنے کی تلقین کی۔ وہ ان کی اجتماعی خودی کو بیدار دیکھنے کے متمنی تھے۔ اسی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ کشمیریوں کو ان کے گزشتہ تمدن کی عظمت سے روشناس کرانے کی خاطر کشمیر کا فارسی ادب محفوظ کیا جائے۔ ان کا ایمان تھا کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔ وہ کشمیر کے مستقبل سے مایوس نہ تھے۔ انہوں نے کشمیریوں ہی کے متعلق ارشاد کیا ہے۔

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر
دل آدمی کا ہے فقط اک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اسے
دل آپ اپنے شام و سحر کا ہے نقشبند
جس خاک کے ضمیر میں ہے آتش چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاک ارجمند

○